اگست 2025

شعاع

سالگرہ نمبر

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

واٹس ایپ
0317 2266944

بانی — محمود ریاض
مدیر منتظم — آسیہ ریاض
مدیر — رضیہ جمیل
مدیرہ مسئول — امتہ الصبور
خط و کتابت — شاہین رشید
قانونی مشیر — [illegible]



زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک

APNS
CPNE

اگست 2025
جلد 38 شمارہ 12
قیمت 150 روپے





خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ شعاع
37 - اردو بازار، کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

شعاع اگست کا شمارہ سالگرہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ستمبر 85ء میں شعاع کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے حضور سربسجود ہیں کہ آج 40 سال کی طویل مسافت کامیابی کے ساتھ طے کر کے شعاع 41 ویں سال میں قدم رکھ رہا ہے۔

ایک بہترین اور اعلا اخلاقی صفات سے مزین معاشرے کی تشکیل میں عورت کا کردار بہت اہم ہے۔ اس کی گود میں نسلیں پروان چڑھتی ہیں۔ تربیت پاتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ خود اس کی اخلاقی اور ذہنی تربیت کی جائے۔ اسے علم و آگہی کے زیور سے آراستہ کیا جائے تاکہ وہ خود کو پہچانے اور قدرت کی طرف سے جو اہم ذمہ داری اسے سونپی گئی ہے۔ اسے سمجھے۔

محمود ریاض صاحب نے خواتین ڈائجسٹ کا اجراء کیا تو ان کے پیش نظر یہی مقصد تھا کہ گھر کی چار دیواری میں رہنے والی خواتین کو ایک صاف ستھری تفریح مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ذہنوں کو علم و آگہی کی روشنی سے منور کیا جائے۔ ان میں لکھنے اور پڑھنے کا ذوق بیدار کیا جائے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو سامنے لایا جائے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے بے شمار مصنفین کی تخلیقی صلاحیتیں سامنے آئیں جو آج شہرت کے آسمان پر چمک رہی ہیں۔

شعاع کی کامیابی میں بڑا حصہ ہماری مصنفین کا ہے۔ ان کی تحریروں نے مثبت سوچ کو فروغ دیا۔ قارئین کی روشن راستوں کی طرف رہنمائی کی۔ ہم ان کے تہ دل سے ممنون ہیں۔ بہت سی مصنفین آج ہمارے درمیان نہیں، ہم ان کے لیے دعاگو ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

ہم اپنی پیاری قارئین کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ جو قدم قدم ہمارے ساتھ رہیں۔ ان کی تعریف اور تنقید ہماری رہنمائی کرتی رہی۔

اگست کا مہینہ بہت بڑی خوشی لے کر آتا ہے۔ 14 اگست 47ء جب ہمیں آزادی کا انمول تحفہ ملا۔ ایک علیحدہ وطن اور شناخت ملی۔ آج ساری دنیا جان چکی ہے کہ بھارت کی تنگ سوچ اور پست ذہنیت کسی دوسرے مذہب کے لوگوں کو برداشت ہی نہیں کر سکتی، حالیہ مثال اداکار سیف علی خان کی ہے جو مشہور انڈین کرکٹر منصور علی خان نواب آف پٹوڈی کا بیٹا ہے۔ سیف علی خان کی پندرہ ہزار کروڑ روپے کی آبائی جائیداد کو بھارتی حکومت نے ضبط کر لیا ہے۔ اس کی ہندو ماں شرمیلا ٹیگور اور ہندو بیوی کرینہ کپور بھی اسے نہ بچا سکیں۔ یہ مثال ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے جو پاکستان کی برائیاں کرتے نہیں تھکتے۔ پاکستان ہمارے لیے رب کا انعام ہے۔ یاد رکھیے آزادی اور اپنے وطن سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔

قارئین کو جشن آزادی مبارک

اللہ تعالیٰ ہمارے وطن کو تا قیامت سلامت رکھے۔ آمین۔

حمد باری تعالیٰ

میں نام لیوا ہوں تیرا تو معتبر کر دے
حیات خوب نہیں ہے تو مختصر کر دے

حصارِ ذات کے زندانِ بے اماں کی خبر
غبارِ راہ کی صورت ہی منتشر کر دے

دروغِ مصلحت آمیز کے خرابے میں
انا پسند مزاجوں کو در بدر کر دے

گئے دنوں کو تلاشیں کہ اگلی رت میں کھلیں
تو موسموں کو ہواؤں سے باخبر کر دے

لباسِ فقر میں اتنی تونگری تو رہے
دلِ عزیب کو وسعت میں بحر و بر کر دے

میں ایک عمر سے جاگا کیا ہوں جس کے لیے
دعائے نیم شبی میں ذرا اثر کر دے۔

وقارؔ شخص کہ شاعر، نہ اس کی فکر نہ فن!
تمام عیب ہیں چاہے تو سب ہنر کر دے

وقار خلیل

نعت رسول مقبول ﷺ

ہے کون شاہ دوسرا آپؐ کی طرح
کوئی نہیں رسولِ خدا، آپؐ کی طرح

اس واسطے حضورؐ کو بعثت عطا ہوئی
دنیا میں کوئی اور نہ تھا آپؐ کی طرح

اے اُمّتِ حبیبِ خدا، تیرے واسطے
مانگے گا اور کون دُعا آپؐ کی طرح

کیسے کوئی دِلوں میں اُتارے خدا کی بات
اوروں کی خامشی نہ صدا، آپؐ کی طرح

ثابت ہوئی یہ بات بھی قرآنِ پاک سے
واجب نہیں کسی کی ثنا آپؐ کی طرح

انسانیت کی راہ دکھانے کے باوجود
کوئی ہوا نہ راہ نما، آپؐ کی طرح

بندوں کا جو خدا کے رکھے ہر طرح خیال
خاورؔ ہے کون بعیدِ خدا، آپؐ کی طرح

رحمان خاور (علیگ)

ادارہ



اجتہاد

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

''جب حاکم فیصلہ کرے اور اجتہاد سے کام لے، پھر اجتہاد سے وہ درستی کو پہنچ گیا تو اس کے لیے دگنا اجر ہے اور جب وہ فیصلے کرے اور اجتہاد میں اس سے غلطی ہو جائے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔''

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ جن معاملات میں کوئی نص شرعی نہ ہو، ان کی بابت ان سے ملتی جلتی شکلوں کو سامنے رکھ کر جواز و عدم جواز کا فیصلہ کرنا اجتہاد کہلاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ اجتہاد وہی شخص کرتا ہے جسے قرآن و حدیث کی صحیح سمجھ ہو۔

2۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ مسلمانوں کے حاکم، قاضی اور مجاز افسر کو قرآن و حدیث کا عالم ہونا چاہیے، تاکہ حسب ضرورت وہ اجتہاد کر سکے۔ اس اجتہاد میں وہ اخلاص اور نیک نیتی سے کام لے گا، تو اس کے لیے ہر صورت میں اجر ہے، بلکہ درستی کی صورت میں دہرا اجر ہے۔

بخار

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''بخار، جہنم کی شدید حرارت سے ہے۔ چنانچہ تم اسے پانی سے ٹھنڈا کرو۔'' (بخاری و مسلم)

فوت شدہ کے روزے

''جو شخص فوت ہو جائے اور اس کے ذمے (نذر کے) روزے ہوں تو اس کا قریبی اس کی طرف سے روزے رکھے۔'' (بخاری و مسلم)

اس حدیث کی رو سے فوت شدہ شخص کے ذمے روزے ہوں تو پسندیدہ بات اس کی طرف سے روزہ رکھنے کا جواز ہے۔ اور ولی سے مراد قریبی عزیز ہے، چاہے وہ وارث ہو یا نہ ہو۔

فوائد و مسائل:

شیخ البانی رحمتہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نذر کے روزے ہیں نہ کہ رمضان کے روزے۔ گویا شیخ موصوف نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی حدیث کے عموم کو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دوسری حدیث سے خاص کر دیا، جس میں نذر کے روزوں کی صراحت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بدنی عبادت میں نیابت جائز نہیں، جس طرح زندگی میں کوئی شخص کسی دوسرے کی طرف سے کوئی بدنی عبادت ادا نہیں کر سکتا، اسی طرح موت کے بعد بھی ایسا کرنا جائز نہیں۔ البتہ جس کی بابت نص میں صراحت ہو تو اس میں نیابت جائز ہوگی اور اسے صرف نص کی صراحت کی حد تک محدود رکھا جائے گا، جیسے نذر کے روزوں کی بابت حدیث میں صراحت ہے کہ میت کا ولی اس کی طرف سے روزہ رکھے تو نذر کے روزے میت کی طرف سے رکھنے جائز ہوں گے، کوئی اور بدنی عبادت اس کی طرف سے جائز نہیں ہو گی۔

حضرت عوف بن مالک بن طفیل بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کسی سودے یا عطیے کے بارے میں جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دیتی تھیں کہا۔

"میری خالہ (حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) یا تو اس طرح (بے دریغ) خرچ کرنے سے رک جائیں، نہیں تو میں ان پر پابندی عائد کر دوں گا۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یہ سن کر فرمایا۔

"کیا عبداللہ نے واقعی ایسا کہا ہے؟"

"لوگوں نے کہا، ہاں۔"

انہوں نے فرمایا۔ "مجھ پر اللہ کے نام کی نذر ہے، اب میں کبھی عبداللہ بن زبیر سے بات نہیں کروں گی۔"

جب یہ ترک تعلق لمبا ہو گیا تو حضرت ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عائشہ کی طرف سفارش کروائی تو انہوں نے فرمایا۔

"اللہ کی قسم! میں ابن زبیر کے بارے میں کبھی سفارش نہیں مانوں گی اور نہ اپنی نذر توڑنے کے گناہ کا ارتکاب کروں گی۔"

چنانچہ جب ابن زبیر پر یہ معاملہ مزید لمبا ہوا تو انہوں نے حضرت مسور بن مخرمہ اور عبدالرحمن بن اسود بن عبد سے گفتگو کی اور ان سے کہا کہ۔

"میں تم دونوں کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ تم مجھے (میری خالہ) عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس لے چلو، اس لیے کہ ان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مجھ سے قطع تعلق کی نذر پر قائم رہیں۔"

تو حضرت مسور اور عبدالرحمن دونوں ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لے گئے حتیٰ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کی۔ انہوں نے کہا۔

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ کیا ہم اندر آ جائیں؟"

حضرت عائشہ نے فرمایا۔ "آ جاؤ۔"

انہوں نے پوچھا۔ "ہم سب آ جائیں؟"

انہوں نے فرمایا۔ "ہاں، تم سب آ جاؤ۔"

اور انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ان دونوں کے ساتھ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بھی ہیں، چنانچہ جب یہ اندر گئے تو حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ پردے کے اندر چلے گئے اور حضرت عائشہ سے لپٹ کر انہیں قسمیں دینے لگے اور رونے لگے اور (پردے کے باہر) حضرت مسور اور عبدالرحمن بھی انہیں قسم دے کر کہنے لگے کہ وہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے بات کریں اور ان کا عذر قبول کر لیں۔ وہ کہتے تھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قطع تعلق سے منع فرمایا ہے جو آپ کے علم میں ہے اور کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ تین راتوں سے زیادہ اپنے مسلمان بھائی سے بول چال اور تعلق منقطع رکھے۔

جب انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سامنے وعظ و نصیحت اور ترک تعلق کے گناہ ہونے کی باتیں کثرت سے کیں تو انہوں نے بھی وعظ و نصیحت شروع کر دی اور رونے لگیں اور فرمانے لگیں۔

"میں نے تو نذر مانی تھی اور نذر کا معاملہ بڑا سخت ہے۔"

مگر یہ دونوں برابر اصرار کرتے رہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے حضرت ابن زبیر سے کلام فرما لیا اور اپنی اس نذر کے توڑنے کے کفارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے چالیس گردنیں آزاد کیں اور اس کے بعد جب بھی وہ اپنی نذر کو یاد کرتیں تو خوب روتیں۔ حتیٰ کہ ان کے آنسو ان کی اوڑھنی (دوپٹے) کو تر کر دیتے۔ (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ،

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سگے بھانجے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ نے ان سے گفتگو نہ کرنے کی نذر مانی تھی، تو وہ سمجھتی تھیں کہ ایسا کرنا ان کے لیے جائز ہے، کیونکہ حضرت ابن زبیر نے اپنی خالہ کے جائز تصرفات پر پابندی لگانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ لیکن پھر انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور وہ اپنی خالہ (حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کو منانے کے لیے دو سفارشیوں کو ساتھ لے کر گھر پہنچ گئے۔ اس کے بعد ان کے لیے یہی مناسب تھا جو انہوں نے کیا کہ نذر توڑ دیں اور ابن زبیر سے ٹوٹے ہوئے تعلق کو بحال کرلیں۔

2۔ نذر توڑنے کا کفارہ وہی ہے جو قسم توڑنے کا ہے۔ ایک گردن آزاد کرنا، یا دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا ان کی پوشاک کا انتظام کر دینا۔ اگر اس کی طاقت نہ ہو تو تین دن کے روزے۔ لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک کے بجائے چالیس گردنیں آزاد فرمائیں۔

دنیا سے رغبت

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احد کے شہدا کی طرف تشریف لے گئے اور ان کے لیے آٹھ سال بعد اس طرح دعا فرمائی جیسے زندوں اور مردوں کو رخصت کرنے والا دعا کرتا ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لائے اور فرمایا۔

''میں تمہارا پیش رو (یا میر سامان) ہوں اور میں تم پر گواہ ہوں گا اور تمہارے وعدے کی جگہ حوض (کوثر) ہے اور بلاشبہ میں اسے اپنے اس مقام سے دیکھ رہا ہوں۔ (کشف کے طور پر) خبردار! مجھے تم سے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ تم شرک کرو گے۔ لیکن یہ اندیشہ ضرور ہے کہ تم دنیا میں زیادہ رغبت کرنے لگو گے۔''

حدیث کے راوی بیان کرتے ہیں کہ یہ آخری نظر تھی جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈالی (اس کے بعد جلد ہی آپ دنیا سے رخصت ہوگئے) (بخاری و مسلم)

اور ایک اور روایت میں ہے۔

''میں تم سے دنیا کی بابت خوف محسوس کرتا ہوں کہ تم اس میں زیادہ رغبت کرو گے اور (اس کی وجہ سے) باہم لڑو گے تو ایسے ہی ہلاک ہو جاؤ گے جیسے تم سے پہلے لوگ ہلاک ہوئے۔'' حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری دیدار تھا جو میں نے منبر پر کیا۔

ایک اور روایت میں ہے۔

''بلاشبہ میں تمہارا پیش رو ہوں اور تم پر گواہ ہوں گا اور بلاشبہ اللہ کی قسم! میں اب اپنے حوض کی طرف دیکھ رہا ہوں اور مجھے زمین کے خزانوں کی یا (فرمایا) زمین کی چابیاں عطا کی گئی ہیں اور میں تمہاری بابت اس بات سے نہیں ڈرتا کہ تم میرے بعد شرک کرو گے لیکن مجھے تم سے یہ اندیشہ ہے کہ تم اس دنیا میں خوب رغبت کرو گے۔''

فوائد و مسائل

1۔ مرحومین اور شہدا کے لیے ہمیشہ مغفرت اور رفع درجات کی دعا کرتے رہنا چاہیے۔ بشرطیکہ ان کا خاتمہ ایمان پر ہو۔

2۔ دنیا میں کشف کے ذریعے سے بہت سے حقائق اخروی کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو علم دیا گیا۔

3۔ اس میں حوض کوثر کا بھی اثبات ہے۔

4۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے پیش رو یا میر سامان ہوں گے۔ فرط کے معنی ہیں، قافلے سے آگے جانے والا یعنی آپ قافلہ آخرت کے پیش رو ہیں۔

5۔ اس میں آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے خطاب کرتے ہوئے جو فرمایا ہے کہ مجھے تم سے شرک کا اندیشہ نہیں ہے، تو یہ صحابہ کرام اور قرون اول کے اعتبار سے ہے، ورنہ دوسری احادیث سے ثابت ہے کہ آخری زمانے میں لوگ پھر بتوں کو

پوچھیں گے، اس لیے اس حدیث سے یہ سمجھنا کہ امت محمدیہ کے افراد کبھی شرک کا ارتکاب نہیں کریں گے، صحیح نہیں ہے اس کا تعلق اسلام کے قرون خیر سے ہے یا پھر اس کا مطلب تمام امت کے مشرک ہونے کی نفی ہے۔ یعنی پوری امت شرک کا ارتکاب نہیں کرے گی۔ کچھ گروہ یا فرقے اگر مشرکانہ عقائد و اعمال اختیار کریں گے بھی جیسا کہ اس وقت بہت سے مدعیان اسلام کا عقیدہ و عمل ہے، تو دوسرے گروہ توحید و سنت پر ضرور قائم رہیں گے۔

6۔ زمین کی یا زمین کے خزانوں کی چابیوں سے مراد وہ خوش خبری ہے جو کفار کے ممالک فتح ہونے کی صورت میں مسلمانوں کو غنیمت کا مال ملنا تھا جیسا کہ بعد میں ہوا۔

خطبہ

حضرت ابوزید عمرو بن اخطب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک روز) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فجر کی نماز پڑھائی اور منبر پر تشریف فرما ہو گئے۔ ہمیں خطبہ دیا، یہاں تک کہ ظہر کا وقت ہو گیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نیچے اترے اور نماز پڑھائی، پھر منبر پر رونق افروز ہو گئے اور ہمیں خطبہ دیا، یہاں تک کہ عصر کا وقت ہو گیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نیچے اترے اور نماز پڑھائی اور پھر منبر پر چڑھ گئے۔ (اور خطبہ دیا) یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ماضی اور مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کی خبر دی۔

چنانچہ ہم میں سب سے بڑا عالم وہی ہے جو ہم میں سب سے زیادہ ان باتوں کو جاننے والا ہے۔ (مسلم)

نذر

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص اس بات کی نذر مانے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرے گا تو اسے اللہ کی اطاعت کرنی چاہیے اور جو شخص اللہ کی نافرمانی کی نذر مانے تو وہ اس کی نافرمانی نہ کرے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل:

مطلب یہ ہے کہ نیکی اور بھلائی کے کاموں کی نذر پوری کرنا چاہیے اور نافرمانی کی نذر پوری نہ کی جائے۔

چھپکلی مارنا

حضرت ام شریک رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں چھپکلیوں کے مارنے کا حکم فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ ابراہیم علیہ السلام (کی آگ) پر پھونکیں مارتی تھی۔" (بخاری و مسلم)

صدقہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک آدمی نے کہا۔ میں ضرور (آج رات) صدقہ کروں گا۔

چنانچہ وہ اپنا صدقہ لے کر نکلا اور ایک چور کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

صبح کے وقت لوگ باتیں کرتے تھے کہ آج رات ایک چور پر صدقہ کیا گیا ہے تو صدقہ کرنے والے نے (سن کر) کہا۔

"اللہ! تیری تعریف! (آج رات) میں پھر ضرور صدقہ کروں گا۔"

چنانچہ وہ اپنا صدقہ لے کر نکلا تو وہ اس نے ایک بدکار عورت کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ صبح کے وقت لوگ باتیں کرتے تھے۔

"آج رات ایک بدکار عورت پر صدقہ کیا گیا ہے۔"

تو صدقہ کرنے والے نے (سن کر) کہا۔

”اللہ! تیری شان! بدکار عورت پر (صدقہ ہوگیا ہے) میں (آج رات) پھر ضرور صدقہ کروں گا۔“

چنانچہ وہ اپنا صدقہ لے کر نکلا اور ایک مال دار آدمی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ صبح کے وقت لوگ باتیں کرتے تھے کہ......

آج رات ایک مال دار پر صدقہ کیا گیا ہے، تو اس نے کہا۔

”اللہ! تیری حمد! ایک چور، ایک بدکار عورت اور ایک مال دار پر (صدقہ ہوگیا!) چنانچہ رات کو اسے خواب آیا اور اسے بتلایا گیا (کہ تیرا صدقہ بے کار نہیں گیا ہے، بلکہ......) تیرا صدقہ جو چور پر ہوا تو شاید اس کی وجہ سے وہ چوری کرنے سے باز آجائے اور بدکار عورت شاید وہ بدکاری سے تائب ہوجائے اور مال دار آدمی، شاید وہ عبرت حاصل کرلے اور وہ بھی اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔“ (بخاری)

فوائد و مسائل:

صدقہ دینے والے کی نیت اگر صحیح ہو تو اس طرح کی بے خبری میں غیر مستحق لوگوں پر بھی صدقہ ہو جائے تو عنداللہ مقبول ہوگا علاوہ ازیں اللہ چاہے گا تو اس میں بھی ان لوگوں کے اندر خیر کے پہلو پیدا فرما دے گا جو مستحق نہ ہونے کے باوجود صدقے سے نواز دیے جائیں، یہ واقعہ پہلی امتوں میں سے کسی کا ہے۔

ہر جان دار، حتیٰ کہ چیونٹی وغیرہ کو بھی آگ میں جلانے کی سزا دینا منع ہے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک لشکر میں روانہ کیا تو فرمایا: ”اگر تم فلاں فلاں کو پاؤ تو ان کو آگ میں جلا دو۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے دو آدمیوں کا نام لیا۔ پھر جب ہم نکلنے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ فلاں فلاں شخص کو جلا دینا۔ لیکن آگ کا عذاب تو صرف اللہ ہی دے گا، اس لیے اگر تم ان کو پاؤ تو انہیں قتل کر دینا۔“ (بخاری)

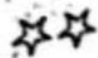
فائدہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دوسرے حکم میں واضح فرما دیا کہ آگ میں جلانے کی سزا کسی کو نہیں دینی چاہیے حتیٰ کہ اپنے شدید ترین دشمن کو بھی نہیں۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ بیان فرماتے ہیں کہ ایک سفر میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ آپ اپنی بشری حاجت کے لیے تشریف لے گئے۔ ہم نے (چڑیا کی طرح کا) ایک سرخ پرندہ دیکھا۔ اس کے ساتھ اس کے دو بچے تھے۔ ہم نے ان بچوں کو پکڑ لیا۔ وہ پرندہ ان کے گرد منڈلانے لگا۔ اتنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اس پرندے کو اس کے بچوں کی وجہ سے کس نے دردمند کیا (تکلیف پہنچائی) ہے؟ اسے اس کے بچے لوٹا دو۔“ اور آپ نے چیونٹیوں کی ایک بستی دیکھی جس کو ہم نے جلا دیا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ”یہ بستی کس نے جلائی ہے؟“ ہم نے جواب دیا: ”ہم نے (جلائی ہے۔)“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”آگ کا عذاب دینا تو آگ کے رب ہی کو سزاوار ہے۔“ (اسے ابوداؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل:

1۔ پرندوں کے بچوں کو پکڑ کر پرندوں کا ایذا پہنچانا۔ چیونٹیوں اور دیگر حشرات الارض کے مسکنوں کو کیڑے مکوڑوں سمیت جلانا منع ہے، البتہ خالی مسکنوں کو جلانا ممنوع نہیں ہے۔

2۔ اگر کسی نے کسی کو آگ میں جلا کر مار دیا تو قصاص میں ایسا کیا جا سکتا ہے کہ قاتل کو بھی جلا دیا جائے، البتہ مقتول کے ورثا چاہیں تو تلوار سے اس کی گردن اڑا کر بھی قصاص لے سکتے ہیں۔



جب تجھ سے ناتا جوڑ لیے

آغا

س ''شادی کب ہوئی؟''

ج ''میری شادی 1985ء میں ہوئی تھی۔''

س ''شادی سے پہلے کیا مشاغل تھے کیا دلچسپیاں تھیں؟''

ج ''شادی سے پہلے کے مشاغل کا کیا کہنا، نوکری کرتی تھی ایک اسکول میں اور بہت تلخ لائف گزاری، نوکری کی گھر کے مسائل، والد صاحب کا انتقال جلد ہوگیا تھا، بہن بھائی چھوٹے تھے بہت ذمہ داریاں تھیں انہیں نبھانا آسان نہ تھا۔ بس اسی میں لگے رہتے تھے کہ کس طرح گھر کے حالات سدھاریں، کرائے کا گھر تھا۔ کپڑے لینے کا شوق تھا اور ضرورت بھی تھی اور ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق تھا جو کتاب ملتی پڑھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ پڑھے لکھے تھے۔ شادی کے بعد بھی مسائل تھے اور پہلے بھی مسائل ہی تھے۔''

س ''شادی آپ کی مرضی سے ہوئی یا ارینج تھی؟''

ج ''مرضی کیسی، اپنے بارے میں سوچنے کا موقع ہی کب ملا تھا۔ بس زندگی کی گاڑی چل رہی تھی، میں اچھی خاصی پڑھی لکھی تھی نوکری کرتی تھی تو ویسے بھی جاننے والے، دوستوں کے رشتے آئے لیکن کہتے ہیں ناں کہ جہاں نصیب ہوتے ہیں وہیں ہوتی ہے۔ میرے بہت بڑے اچھے امیر گھرانوں سے بھی رشتے آئے مگر یہاں لکھا تھا تو ہوگیا۔ والدین کے انتقال کے بعد شادی ہوگئی یہ ہی بڑی بات تھی، ورنہ بڑھتی عمر میں لڑکیاں بس بیٹھی رہ جاتی ہیں یہ بھی ایک خوف تھا دل میں کیونکہ انسان زندگی اکیلے تو نہیں گزار سکتا۔ بس سب گھر والوں نے کہا کہ اپنا گھر ہے اور ملازمت بھی ٹھیک ہے، خوش شکل بھی تھے، تین نندیں اور تینوں شادی شدہ تھیں تو بظاہر سب اچھا لگا اور سوچا کہ یہ اوپر والے کی طرف سے رحمت ہے اب نہیں ٹھکرانی۔''

س ''منگنی کتنے سال رہی؟''

ج ''بس سال کے اندر ہی شادی ہوگئی تھی ان کی امی اپنی بیٹیوں کے ساتھ آئیں اور بات پکی ہوگئی۔ اس سلسلے میں بعد میں وہ اپنے رشتے داروں کو لے کر آئیں، مٹھائی لے کر اچھے خاصے لوگ تھے تعداد میں اور ہم نے بھی پوری عزت سے ساری رسمیں نبھائیں۔''

س ''رسموں کے لین دین پر کوئی جھگڑا؟''

ج ''کیا کہوں۔ ان کے گھر والے ذرا مغرور تھے ان کے ہر عمل اور رسم میں یہ غرور نظر آیا۔ کبھی یوں بھی لگا کہ جیسے ان کو شادی کرنے میں دلچسپی ہی نہیں ہے۔ عید کے بعد شادی تھی تو یہ لوگ عید پر جیسے عیدی لے کر آتے ہیں، نہیں آئے اب ہمارے یہاں یہ ٹینشن کہ کیوں نہیں آئے کیا ارادہ ہے۔ فون کیا تو ان کی امی نے بڑا برا انداز اختیار کیا جیسے انہیں یہ سب پسند نہیں آیا، پھر ایک دن عید سے پہلے الوداع کے روز یا شاید بعد میں عید کا جوڑا مٹھائی لائیں اور جیسے پٹخ کر رکھا بہرحال ہم کیا کرتے ہم بیٹی والے تھے۔ اس طرح یہ سکون آیا کہ کم از کم بات تو ہے ہم نے بھی ان کے گھر عیدی بھیجی۔

مہندی میں بھی یہ حال کہ میری بہنوں نے مہندی پر نیگ مانگا تو ان کی بہن (خدا اس کی مغفرت کرے) بہت چالاکی سے کاٹ گئی بس کوئی ایک بات ہو تو کہیں۔ یہ تو معمولی باتیں تھیں۔ شادی کے بعد بھی ان لوگوں کا حال ایسا تھا کہ نئی آئی دلہن آ گئی تو آ گئی اب ہم کیا کریں بھئی، میرے نندوئی کو بلکہ برا بھی لگا اور ان کے ماموں نے پھر اپنی بیگم کو بھیجا کہ دلہن کو گاڑی سے اتار کر لائیں۔''

س ''شادی کے لیے کوئی قربانی دی؟''

ج ''شادی کے بعد تو لڑکیوں کو قربانی دینی ہی پڑتی ہے، کچھ اپنے برے اور مغرورانہ رویوں کی دیتی ہیں تو کچھ اپنی شرمیلی اور دبی چڑی شخصیت کی...... حیرت ہوتی ہے کہ لوگ کس طرح کیچلی بدلتے ہیں۔

میں نے بھی بہت تکلیفیں برداشت کیں، یہاں تک کہ میری نوکری پر سوال اٹھے کہ چھوڑ دوں اور گھر پر توجہ دوں۔ میری نندیں رہنے آ جاتیں اور میں جیسے ان کے لیے ایک ناگوار وجود تھی، تو ساس صاحبہ مجھے میرے گھر بھجوا دیتیں اور جب میں وہاں رہتی بھی تو بس ایک نوکر کی طرح...... مجھے یاد ہے کہ ایک بار سب کے لیے آئس کریم منگوائی گئی تھی، میں آئس کریم والا آتا رہتا تھا سب نے ہی کھائی۔ میں کچن میں مصروف تھی تو کہہ دیا کہ ابھی آتی ہوں۔ پر جب آئی تو میرے لیے کچھ نہ تھا حالانکہ گھر میں فریج، ڈیپ فریزر سب موجود تھا اور اخلاق تو کیا کہنے۔ بس چپ ہی رہتی۔ اور اپنے سارے کام انجام دیتی۔ اسکول سے گھر آتی تو ساس سو کر اٹھ چکی ہوتیں جلدی جلدی کھانا بناتی جب کہ پہلے خود بھی پکاتی تھیں لیکن میرے آنے کے بعد تو یہ ذمہ داری مجھ پر آ گئی اور مجھے اپنے گھر میں کام کرنے سے مسئلہ نہ تھا لیکن طعنوں سے انسان ٹوٹ جاتا ہے۔"

س" کتنے عرصے بعد کام سنبھالا تھا؟"

ج" بہت جلدی ڈیوٹی سنبھال لی تھی کہ گھر میں ہوتا ہی کون ہے لیکن میری نند جو سکھر سے آئی تھی بس وہ آئی اور میرا امتحان شروع۔ مجھ پر یہ تک شک کیا جاتا کہ میں گھر کی اشیاء جیسے صابن وغیرہ چوری کر کے اپنے گھر بھجواتی ہوں۔"

س" شادی کے بعد خاص تبدیلی؟"

ج" (ہنس کر) ساری اکڑ نکل گئی تھی حالانکہ میں ایک ذمہ دار بارعب ٹیچر تھی لیکن شادی کے بعد بس ایک بہو بن کر رہ گئی۔ میرے شوہر کو بھی اپنے گھر والوں سے مسئلہ تھا پر اپنی امی کی وجہ سے چپ رہتے تھے۔"

س" سسرال اور میکے کے ذائقوں میں فرق؟"

ج" فرق تو تھا لیکن بہت زیادہ نہیں، میں کھانے پکاتی تو میری ساس کو پسند آتے۔ بات دراصل یہ تھی کہ جب ان کی بیٹیاں گھر آتیں تو ان کا رویہ مجھ سے بالکل بدل جاتا اور ان کے جانے کے بعد وہ اچھی بن جاتیں جبکہ میں دل سے ان کا خیال رکھتی اور کام کرتی تھی۔"

س" پہلے بچے کی پیدائش؟"

ج" پہلے بچے کی پیدائش ہوئی تو جیسے میری زندگی میں بہار آ گئی۔ میرا بچہ ایک ٹینشن زدہ ماحول کی پیداوار تھا اس لیے کچھ کمزور تھا۔ اس پر بھی باتیں کہ اس کا رنگ کیسا ہے۔ بہر حال میرے اور شوہر کے لیے یہ ایک بہت بڑی خوشی ہے۔ میں سارا دن کاموں میں الجھی رہتی، اس دوران میری ساس بچے کو سنبھالتیں لیکن اپنی بیٹیوں کے بچوں کے لیے ان کی محبت ہی الگ تھی جیسے شہد ٹپکتا تھا۔ مجھے بہت احساس ہوتا تھا کہ اس گھر کا پہلا بیٹا ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ پیار نہیں کرتی تھیں لیکن فوقیت، اپنی بیٹیوں کے بچوں کو دیتیں ہم اس گھر کے دوسرے تیسرے درجے کے شہری تھے۔

میری بڑی اور اس سے چھوٹی نندیں بہت...... اب کیا کہوں کہ ایک تو جوانی میں ہی اس دنیا سے گزر گئی اور مجھے بہت افسوس ہے کہ اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ مجھے یہ سب کہنا اچھا نہیں لگتا کہ اب وقت تو گزر ہی چکا ہے لیکن لڑکیوں، بچیوں سے گزارش ہے کہ اپنے بھائیوں، بیٹوں کی شادی کریں تو دوسری لڑکیوں اور بہنوں کی عزت کریں انہیں سر آنکھوں پر نہ بٹھائیں لیکن بلاوجہ اذیت نہ دیں ایسا رویہ نہ رکھیں جس سے ان کا دل دکھے۔ میں سوچتی ہوں کہ اگر میں اسے بددعا دیتی تو شاید اپنے آپ کو بھی معاف نہ کر سکتی تھی۔"

س" سسرال سے جو توقعات تھیں وہ پوری ہوئیں؟"

ج" انہوں نے تو پہلے ہی دکھا دیا تھا کہ وہ کیسے ہیں اب میں ان سے کیا توقع کرتی شاید وہ اپنے بھائی کی شادی ہی نہیں کرنا چاہتی تھیں، یہ شادی تو ان کے ماموں نے میرے شوہر کے زور دینے پر کروائی تھی ورنہ انہیں ہر لڑکی میں کیڑے نظر آتے تھے، انہیں ہماری جیسی مجبور کمزور فیملی چاہیے تھی۔ ان کی بعد کی حرکتوں نے بھی یہ ہی ثابت کیا کہ ان کے گھر میں شادی شدہ بیٹیوں کا ہولڈ تھا۔ ساس کی ہمیشہ بیٹیوں سے بنتی تھی اور میرے شوہر ان کے نزدیک پورا انسان تھے۔"

س" جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے یا علیحدہ؟"

ج" مجھے تو جو بھی ملتا قبول تھا پسند بھی الگ ہی ہے

کہ سب مل جل کر، پیار محبت سے رہیں جیسا کہ ہم دیکھتے آئے تھے اپنے خاندان میں، لیکن مجھے ایسا نہیں ملا۔ ساس یا شوہر ناراض ہو جاتے کسی بات پر تو میں جب میکے سے لوٹتی تو گیٹ نہیں کھولتے میں نکل دیتی رہتی پھر میں پڑوس میں جا کر بیٹھتی اور ان سے بہانے بناتی وہ سب بجھ جاتیں، بہرحال اچھے لوگ بھی ہیں ابھی دنیا میں ان کی بہویں، بچے پوتے سب ساتھ رہتے تو ان کو میرے سسرال والوں کے رویے برے لگتے لیکن وہ منہ سے کچھ نہ کہتیں۔ ہمارے یہاں کچھ لڑکیوں نے جوائنٹ فیملی سسٹم کو بدنام کیا ہے لیکن سچ ہے کہ یہ سسٹم بہت سی برائیوں کے باوجود اچھا ہے۔"

س "سسرال میں وہ مقام ملا جس کی آپ حق دار تھیں؟"

ج "سچ تو یہ ہے کہ پہلے بھی میری ساس اور نندوں کے علاوہ، پوری سسرال میں میری تعریف ہوتی تھی اور ساس بھی کبھی ترنگ میں آ کر سب کی باتیں بتا دیتی تھیں۔ سب کا یہی کہنا تھا کہ میں نے گزارا کیا ہے۔ ویسے منہ پر سب لوگ ان لوگوں کو مکھن لگاتے تھے اور ان سے اپنے مفادات حاصل کرتے تھے پر سب جانتے تھے کہ اصل حقیقت کیا ہے، میری بڑی نند نے پہلی شادی کی اور اپنی ہٹ دھرمی میں طلاق لے کر بیٹھ گئی پھر خوش قسمتی سے اس کی دوسری شادی بھی اچھی جگہ ہوئی۔ اس طرح تین بچوں کی ماں بن گئی پر اس کے دماغ میں خدا جانے کیا تھا پھر طلاق لی اور سچ تو یہ ہے کہ اس نے بہت مسائل پیدا کیے، میرے شوہر سب سمجھتے تھے کہ اس کی عادات کیسی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ والدین کو بھی اپنی بچیوں کی تربیت میں ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ انہیں اتنا بڑھا چڑھا دیا جائے کہ ان کی نظر میں کوئی جچے ہی نہ اور میری نندوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ مجھے افسوس ہے کہ اتنی پیاری اور پیسے ہونے کے باوجود انہوں نے خود اپنے نصیب پھوڑ لیے اور مجھے بھی بلاوجہ ہی تنگ کیا۔ آج سب سوچتی ہوں تو حیرت بھی ہوتی ہے کہ انسان کا غرور اس سے کیا کچھ کروا دیتا ہے۔"

☆☆

خواب، خوشبو اور رنگ

ادارہ

اللہ تعالیٰ کا کرم ہے اور احسان ہے کہ چالیس سال کی طویل مسافت طے کر کے شعاع اکتالیسویں سال میں قدم رکھ رہا ہے۔ ایک طویل مسافت...... ایک کٹھن سفر۔

آپ کی محبتوں کے ساتھ، آپ کی پر خلوص رفاقتوں میں وقت اس طرح گزرا کہ پتا بھی نہ چلا۔ بلاشبہ ہمیں اچھی مصنفین کا تعاون ملا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت ذہین، بہت پر خلوص قارئین کا تعاون بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اگر ان کی حوصلہ افزائی اور قدر روانی نہ ہوتی تو شعاع مقبولیت اور کامیابی کے اس مقام پر نہ ہوتا۔

حسب روایت سالگرہ نمبر میں قارئین سے سروے بھی شامل ہے۔

سوالات یہ ہیں۔

1۔ وقت کی کچھ حسین ساعتیں دل کے آنگن میں ٹھہر جاتی ہیں۔ ان کی یاد ہمیشہ دل کو خوش کر دیتی ہے۔ کوئی ایسی یاد آپ کے دل میں بھی ہوگی۔ اس کے بارے میں لکھیں۔

2۔ زندگی کا کوئی ناگوار واقعہ کوئی طنز، کوئی جملہ جس کی چبھن آج بھی محسوس ہوتی ہے۔

3۔ کس کہانی کے اختتام کو پڑھ کر آپ کو رونا آیا اور آپ نے سوچا کہ اس کا انجام آپ مصنفہ ہوتیں تو یہ نہ لکھتیں۔

4۔ شعاع میں آپ نے بے شمار کہانیاں پڑھی ہوں گی۔ کہانیوں کے کچھ کردار بہت دلچسپ ہوتے ہیں خواہ وہ مثبت ہوں یا منفی، کوئی ایسا کردار آپ کو بہت دلچسپ لگا اور اسے پڑھ کر لطف آیا۔

آیئے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے ان سوالات کے کیا جواب دیے ہیں۔

فرخندہ سلیم ...... ملتان

(1) یادیں نہ وقت کی محتاج ہوتی ہیں، نہ موسم کی، یہ تو دل کی زمین پر اگنے والے وہ پھول ہیں جن کی خوشبو برسوں بعد بھی اسی شدت سے محسوس ہوتی ہے جیسے کل کا واقعہ ہو۔ ان دنوں کی سیر کراتی ہیں جواب صرف دل کے منظر نامے پر زندہ ہیں۔

ایک بادلی سی یاد جو 1994 کی گرمی کے دن کی ہے جو میرے لیے گرمی کے لون کے سوٹوں کی طرح خاص ہے، وہ دن میری شادی سے ٹھیک سال پہلے کا تھا جب ہم سب...... مطلب میں، میرے اماں ابا، میرے چالاک سے دو بھائی، تند تایپ دو بہنیں اور بقول اماں کے میری چڑال سہیلی سیما کے ساتھ کراچی کے سمندر پر سیر کے بہانے دراصل آموں پر حملہ کرنے نکلے تھے۔

ہائے کیا تیاری تھی اس دن کی، دو ٹوکرے سندھڑی آم، برف کا ساتھ انتظام، نمک، مسالا، کپڑے، چادریں اور ایک اماں جان کا لمبا میڈیکل لیکچر کہ "گرمی میں آم کھانے سے معدہ پاگل ہو جاتا ہے۔"



خیر سمندر پر جا کر خوب لہروں سے لطف اندوز ہوئے وہیں آم پارٹی شروع ہوئی، جو آخر میں جنگ جیسی صورت حال اختیار کر گئی تھی۔ ہم سب نے کھانا کھایا اور اس کے بعد آم کی پیٹیاں کھل گئیں اور سب نے خوب اچھے سے آموں سے اپنا منہ اور پیلا کیا اور کی تو میں نے بھی نہیں چھوڑی۔ اماں کہتی رہیں۔

"اے فرخندہ، اتنے زیادہ آم نہ کھا۔

تجھے کیا زندگی میں آخری بار آم نصیب ہو رہے ہیں؟" مگر میں کہاں مانتی اور ڈٹ کر کھائے۔

میرے بھائی اور کزن بھی ندیدے پن کی انتہا کرتے ہوئے بے دردی سے آموں پر ہاتھ صاف کر رہے تھے۔

مغرب سے پہلے سمندر سے جانے کی تیاری کرنے لگے کہ میرے دونوں بھائی اور میری بہن کو الٹیاں آنا شروع ہو گئیں۔ بس شاید آموں کی زیادتی ہو گئی تھی، جس نے اثر دکھایا۔

خیر پھر ہم واپس آئے اور ان سب کی گھر جا کر بھی خوب طبیعت خراب رہی مگر یہ دن آج بھی یاد آتا ہے تو خوشی ہوتی ہے کہ سمندر کے ساتھ اپنوں کے سنگ بہت یادگار سا دن گزرا تھا۔

(2) میں اکثر اس سوچ میں گم ہو جاتی ہوں کہ انسان کی زندگی کیا ہے؟ کیا یہ صرف چند سالوں کی سانس ہے؟ کیا یہ رشتوں کی غلامی، سماج کی قید، اور نسلوں کی روایتوں کا بوجھ اٹھانے کا نام ہے؟ یا پھر زندگی درحقیقت وہ ہے جو انسان "ہو سکتا تھا" لیکن بننے نہ دیا گیا؟

میں کبھی ماضی کی تلخ یادوں میں جا کر سوچتی ہوں کہ کیا میرے ساتھ جو ہوا، وہ میری تقدیر تھی؟ یا وہ صرف انکار تھا...... اس خواب کا، جو ایک عورت نے پہلی بار اپنی مرضی سے دیکھنے کی ہمت کی تھی؟ وہ خواب جو صرف تعلیم یا نوکری کا نہیں تھا، بلکہ اپنی شناخت، اپنی خودی، اپنے وجود کی تصدیق کا خواب تھا۔

لیکن میری خواہش کو فتنہ سمجھا گیا، میری خاموشی کو رضامندی، اور میری قربانی کو فرض۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے جانا کہ عورت کے لیے سب سے بڑی سزا اس کا شعور ہوتا ہے۔ وہ جیسے ہی خود کو سمجھنے لگے، دنیا اسے سزا دینے لگتی ہے۔

اس ایک جملے نے، جو مجھ پر برسایا گیا......

"تم جیسی لڑکیاں عزت سنبھالتی ہیں، خواب نہیں دیکھتیں۔"

میرے اندر وہی زہر گھول دیا، جو قرنوں سے عورت کی نس نس میں اتارا جاتا رہا ہے مجھے لگا، شاید میں غلط ہوں، لیکن وقت نے مجھے ایک فلسفہ سکھایا۔

"دنیا تمہیں تب قبول کرتی ہے جب تم اپنے اندر سے خالی ہو جاؤ اور خود کو ختم کر کے لوگ جیسا

چاہتے ہیں۔ اس سانچے میں ڈھل جاؤ۔ میں نے ہر دن کو ایک خالی برتن کی طرح جیا، جسے سماج کی مرضی سے بھرا گیا۔ اور جب وہ برتن بھر گیا تو میری اصل، میری "میں" ...... نیچے کہیں دبی رہ گئی۔ آج میں رب سے بھی صرف خاموشی میں بات کرتی ہوں۔ میں اس سے نہیں پوچھتی کہ یہ سب میرے ساتھ کیوں ہوا۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ وہ گواہ رہے......

گواہ رہے ان لمحوں کا، جب میں نے خود کو چھوڑا، صرف اس لیے کہ میں عورت تھی۔

گواہ رہے ان سجدوں کا، جو میں نے تھکن سے نہیں، خود کو منانے کے لیے کیے۔ گواہ رہے ان پلوں کا، جب میں نے اپنی انا، اپنی پہچان، اپنی عزت...... سب کچھ دفن کر کے مسکرانے کا جھوٹ سیکھا۔ کیونکہ یہی میری حقیقت ہے......اور یہی عورت کی صدیوں پرانی داستان۔ وہ شخص جو دوسروں کو ہنسانے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ در حقیقت اپنے اندر گہرا اندھیرا سمیٹے ہوتا ہے۔ ایسی مسکراہٹوں کی قیمت اکثر وہی جانتا ہے انہیں پہن کر جیتا ہے۔

(3) ادب بھی محض کہانیاں بیان نہیں کرتا، وہ انسان کے اندر چھپے ہوئے دکھوں کو بے نقاب کرتا ہے، بشریٰ سعید کی "سفال گر" پڑھتے وقت میں نے صرف ایڈم کے کردار کو روتا ہوا نہیں دیکھا، بلکہ ہر صفحہ میری آنکھوں سے آنسو بن کر بہا۔ ایڈم کی ایک لغزش نے اس کی پوری زندگی کو ایک ایسی آگ میں جھونک دیا جس کا شعلہ صرف جسم نہیں جلاتا بلکہ روح کو بھی سلگاتا ہے، وہ ہر لمحہ، ہر سانس، ہر خیال میں توبہ کرتا رہا، اپنی خطا کا کفارہ آنسوؤں سے، تنہائی سے، اور تڑپ سے ادا کرتا رہا۔ لیکن آخر کار اسے معافی نہ ملی، نہ رہائی،، بلکہ موت، اور یہ موت پرنیاں کے لیے بھی ایک ایسی سزا بن گئی جس نے میری روح کو جھنجھوڑ دیا۔

ایمل رضا کی "شام رنگ سیاہ" کے اختتام نے میری آنکھوں سے خاموش آنسو بہا دیے، کہانی میں حسن بیاں، جذبے، اور سادگی کی روشنی تو تھی، لیکن جب ہیروئن کی پوری زندگی تنہائی، قربانی، اور صبر میں گزر گئی، اور آخر میں بھی اسے کچھ نہ ملا، تو میرے دل نے جیسے ہچکی لی۔ میں صرف کردار کی نہیں، اپنی بھی محرومی محسوس کرنے لگی، جیسے میں خود بھی زندگی کے در پر صبر کے کشکول کے ساتھ کھڑی ہوں، اور ہر در بند ہے۔

رفعت سراج کی "دل دیا دہلیز" نے وہی دکھ دیا، بلکہ کچھ زیادہ، کیونکہ وہاں کردار پنجوں کے بل پوری عمر زمین پر گھسٹتے رہے، لیکن آخر میں بھی انہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا حق نہ ملا...... میں نے بار بار آنکھیں پونچھیں، خود کو سنبھالا لیکن پھر رو دی۔ یہ میرے خواب ریزہ ریزہ "میں زینب چاہے جیسی بھی تھی، اس کی سوچ میں سچائی تھی، لیکن اس کے انجام نے میرا دل دو ٹکڑے کر دیا۔

من و سلویٰ" نے تو جیسے میری اندرونی دیواریں ہلا دیں۔" کہ کہانی جیسے امید دلاتی رہی، لیکن آخر میں سب کچھ ایک ایسی گہری مایوسی میں ڈھل گیا جہاں آنکھوں کے نم ہونے کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔

اور پھر "شہر دل کے دروازے"، جس میں مہران پوری کہانی کا مرکز رہا، قاری کا خیال، دعا، توقع، سب مہران کے ساتھ جڑے رہے، لیکن اینڈ سے کچھ لمحے پہلے اچانک داؤد کو ہیرو بنا کر سامنے لایا گیا، اور انکشاف ہوا کہ مہران تو پہلے ہی دوسری شادی کر چکا ہے......

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں نے کتاب بند کر کے دیر تک رونا چاہا، جیسے مجھ سے کوئی خواب چھین لیا گیا ہو۔

ساجدہ حبیب کی حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تحریریں پڑھ کر بہت رونا آتا تھا اور نگہت سیما کی تاریخی تحریریں پڑھتی تھی جب کہانیوں میں اپنے پیارے جان سے جاتے تھے تو رونا آتا۔ مگر یہی زندگی ہے، ہم کہانیوں کا اختتام تو بدل سکتے ہیں مگر زندگی نہیں بدل سکتے یہ سب کہانیاں کسی اور کی نہیں



لگتیں، یہ میرے اپنے اندر کی کہانیاں ہیں جن کا اختتام میرے اندر بھی ایک خلا چھوڑ گیا۔

(4) جب میں شعاع ڈائجسٹ کے صفحات کھولتی ہوں، تو یوں لگتا ہے جیسے ہر ورق پر ایک دنیا بسی ہوئی ہو...... میں نے شعاع میں بے شمار کہانیاں پڑھی ہیں جن میں مختلف رنگوں، ذائقوں، اور جذبات سے بھرے ہوئے کردار ہوتے ہیں کوئی سادگی سے دل موہ لے، کوئی ایسا جو شرارتوں سے لبوں پر مسکراہٹ لے آئے، کوئی ایسا جو اپنے کرب سے اندر تک ہلا دے، اور کوئی ایسا جو سراپا خیر و خوبی بن کر دل کو روشنی دے جائے۔ لیکن اگر مجھ سے یہ کہا جائے کہ ان میں سے کسی ایک کردار کو منتخب کرو، تو یہ میرے لیے ممکن نہیں بلکہ اس لیے کہ ہر کردار کے پیچھے ایک مصنفہ کی روح، ایک جذبہ، اور ایک گہری سوچ کار فرما ہوتی ہے۔ اور یہی وہ نکتہ ہے جو میں ہر قاری کے دل تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ کوئی ایک رائٹر عظیم نہیں ہر رائٹر عظیم ہے۔

سچ یہ ہے کہ ہر لکھاری ہی بہترین ہے، اور ہر قلم اپنی جگہ مکمل۔ ہر مصنفہ کی تحریر میں ایک چھپی ہوئی دنیا ہوتی ہے...... جسے وہ لفظوں کے دھاگوں سے بنتی ہے۔ اور ہم قاری ان دنیاؤں میں یوں کھو جاتے ہیں جیسے وہ ہماری اپنی یادیں ہوں، ہماری اپنی زندگی ہو۔

عائشہ عامر...... کراچی

(1) میری زندگی کی سب سے حسین یاد وہ ہے جب میں اپنی پوری فیملی کے ساتھ عمرے پر گئی تھی وہ دن، وہ راتیں وہ ایک ایک لمحہ میرے لیے کتنا حسین تھا میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی وہ دن میری زندگی کے بہترین دن تھے اس سفر کا کوئی بھی لمحہ آج بھی یاد آتا ہے تو لبوں پر بے اختیار ایک مسکراہٹ آ جاتی ہے اللہ تعالیٰ کتنے مہربان ہیں کہ انہوں نے ہمیں چنا۔

2۔ یہ زندگی ہم چاہنے کے باوجود اپنی مرضی سے نہیں گزار سکتے جیسے زندگی میں کئی خوشنما لمحے ہوتے ہیں، ویسے ہی ہمیں زندگی میں قدم قدم پر ناگوار حالات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے کئی طنز اور جملے تو ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ہمارا دل چھلنی ہو جاتا ہے لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ ”مارنے والے کا ہاتھ پکڑ سکتے ہیں مگر بولنے والے کی زبان نہیں پکڑ سکتے“ طنز اگر کسی غیر کی طرف سے ہو تو ہم پر ایسا اثر نہیں ہوتا لیکن اگر وہی طنز کوئی اپنا کوئی ہمارا جان سے پیارا کرے گا تو دل کو سنبھلنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔

یہ اپنے ہی ہوتے ہیں جو دل پر وار کرتے ہیں محسن
ورنہ غیروں کو کیا خبر کہ دل کس بات پہ دکھتا ہے

میں صرف اتنا ہی کہوں گی۔

(3) رونا تو مجھے کافی کہانیاں پڑھ کر آیا ہے

لیکن اگر میں مصنفہ ہوتی تو میں عشق آتش کہانی کا انجام یہ نہ لکھتی میں وجدان کو اس کی ملیحہ دے دیتی میں ملیحہ کو کبھی مرنے نہ دیتی اصل زندگی میں ہم سب حالات کے ستائے ہوئے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ جب ہم کتاب کھولیں تو ہم ایک ایسی دنیا میں داخل ہو جائیں جہاں ہر پریشانی، ہر تکلیف، ہر مشکل کے بعد سکون آ جائے جیسے کبھی کوئی تکلیف تھی ہی نہیں جہاں کوئی کسی سے جدا نہ ہو جہاں کوئی کسی سے بچھڑے نہ جہاں صرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوں میں جانتی ہوں یہ سب باتیں حقیقت سے بہت دور ہیں پر ہم میں سے اکثر عوام کہانیاں پڑھتی ہی حقیقت سے دوری کے لیے ہے۔

(4) مجھے عمر یسرا کی جمیلہ داؤد (مسز شیرازی) کا کردار بہت پسند تھا وہ عام کرداروں کی طرح دلچسپ تو نہیں تھا مگر وہ ایک بہترین کردار تھا جس طرح جمیلہ داؤد جنت کو سختی سے سخت حالات میں بھی مثبت پہلو دکھاتی تھیں اور جس طرح انہوں نے فارس کو ہر حالات میں سپورٹ کیا وہ سب کچھ بہت خوب صورت تھا۔

تسنیم کوثر...... کراچی

(1) کیا بتائیں خوب صورت حسین یادیں، خوب صورت دلکش لمحات اور خوش گوار ساعتیں تو دل پر نقش ہیں۔ جب بھی دل اداس ہوتا ہے تو فوراً زندگی میں گزرے خوب صورت وقت، حسین لمحات کو یاد کر کے دل کو خوش کرتے رہتے ہیں۔

اللہ کا شکر ہے زندگی میں خوشیوں محبتوں کے بے شمار موقع آئے بلکہ الحمدللہ آج تک اللہ نے خوش ہی رکھا ہے۔

بچوں کی تعلیم کے میدان میں شاندار کامیابیاں پھر ان کی شادی اور اب بچوں کے بچے ننھے منے پیارے سے پوتا پوتی اور سب سے بڑھ کر گھر کا خوش گوار ماحول، یہ سب مل کر خوشی اور اطمینان قلب کا باعث ہیں تو بس ماضی اور حال کے ہنستے مسکراتے لمحات سے اپنے دل کو خوش کرتے رہتے ہیں۔

(2) دوسرے سوال کا جواب کچھ یوں ہے کہ زندگی میں کبھی غم کبھی خوشی تو چلتا ہی رہتا ہے بارہا ایسے مواقع آئے کہ لوگوں کی باتیں ان کا طنز ناگوار لگا بلکہ اگر ہم تفصیل میں جائیں تو تجھ سے ناتا جوڑا کا مضمون بن جائے گا۔ تقریباً سب ہی کے ساتھ یہ معاملہ چلتا ہی رہتا ہے، ہم بھی اس کرائسز سے گزرے ہیں اور گزرتے ہی رہتے ہیں لیکن یقین جانیے میں نے کبھی اپنے دل پہ کوئی بات نہیں لی کیونکہ ہماری اماں مرحومہ کا کہنا تھا

کہ بیٹا یاد رکھو کم ظرف کی گالی، خس کے تالی۔

تو بس ہم اس بات پر قائم ہیں باقی اللہ ایسے لوگوں کو بلکہ ہم سب کو ہدایت دے۔

(3) آج کل جو ناول ماہ الملوک چل رہا ہے اس کا ایک کردار زیب النساء کی تکلیف دہ موت سے بہت دل رکھا اگر میں ناول کی مصنفہ ہوتی تو لازمی زیب النساء کو زندہ رکھتی اور اینڈ شاہ زیب اور زیب النساء کو ملوا کر کرتی اس سے ہمارے خیال میں ناول میں چار چاند لگ جاتے۔

(4) بے شک شعاع میں ہم نے بے شمار خوب صورت دلچسپ ہر طرح کی کہانیاں پڑھی ہیں کتنی اسٹوریز تو ایسی بھی ہیں کہ بار بار پڑھنے سے بھی بہت مزا آتا ہے۔ تو جناب مریم عزیز کے دستور وفا خوب صورت ناول کا ایک کردار طالب تھا ہمیں اس کا انداز اچھا لگتا تھا در اصل یہ ناول ہی شان دار دلچسپ تھا اور طالب تو ناول کا ایک اہم کردار تھا ہمیں تو یہ ناول ہی بے حد پسند تھا۔

جویریہ سعید...... ڈیرہ غازی خان

(1) ویسے تو میں کسی بھی بات پہ خوش ہو سکتی ہوں مثلاً میرے ہسبنڈ ناشتا لینے جائیں اور واپسی پہ شعاع ان کے ہاتھ میں ہو۔

ہمارے باغیچے میں لگے اکلوتے لیموں کے پودے پہ پھول آنا شروع ہوں یا اکلوتی میٹھے کے



درخت پہ لگا میٹھے کا پھل۔

احمد کا رزلٹ اچھا آجائے یا درزن سوٹ اچھا سلائی کردے۔ پہلی دفعہ میں کوئی ریسپی مزے دار بن جائے یا اچانک کوئی سہیلی ملنے کا پروگرام بنالے۔

لیکن ایسی یادیں جو دل کو ہمیشہ خوشی دیتی ہے اور دل کے آنگن میں ٹھہر گئی ہے وہ ہے 21 جولائی سن 2018 جب ملتان ایئرپورٹ سے رات ڈھائی اور تین بجے حجاج کرام کی فلائٹس سرزمین حجاز مقدس کی طرف اڑان بھر رہی تھیں۔

ان میں سے ایک طیارے میں ہم بھی عازم سفر تھے۔ اور طیارے کے زمین سے اوپر اڑتے ہی ہم محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً ہواؤں میں اڑ رہے تھے اور وہ خوشی بھول جانے کے قابل نہیں ہے، حرمین میں گزارے گئے سب لمحے اور پاکستان واپسی تک جب میرے چھوٹے بچے امی کہہ کر میری ٹانگوں سے لپٹ گئے تھے سب بہت حسین اور بہت خوب صورت لمحے تھے۔

(2) ڈھیر سارے طنزیہ جملے، چند ناخوش گوار واقعے، کچھ کڑوی کسیلی باتیں اور کچھ ناگوار لمحے واقعی زندگی میں در آتے ہیں لیکن حج کے موقع پر ان سب کو ڈیلیٹ کردیا۔ تمام مومنین کو اللہ کی رضا کی خاطر بخش دیا۔ گھریلو سطح پر امن وسکون میسر ہے۔

آفس لیول پر اب میچور ہوگئی ہوں۔ طنز پروف، ہنس کر ٹال دینے والی۔ تھوڑا بہت چلتا ہے۔ ہر کسی کی فطرت مختلف ہے۔ کمپرومائز کرنا پڑتا ہے۔ احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ ویسے میں ایک بات آپ کے رسالے کے توسط سے کہنا چاہوں گی۔

"بعد از ریٹائرمنٹ فرشتہ بننے سے بہتر ہے کہ دوران ملازمت فرعونیت چھوڑ دی جائے۔"

(3) فرزانہ کھرل کی کہانیوں میں جب اکثر وہ ہیرو، ہیروئن میں جدائی ڈلوادیتی ہیں تب میرا دل چاہتا ہے کہ کاش ایسا نہ ہوتا حقیقی زندگی میں تو واقعی مسائل نکل آتے ہیں، چلو کہانیوں کی حد تک ہی ملوادیں۔

(4) سائرہ رضا (اللہ پاک انہیں دائمی رضا مندی) نصیب فرمائے۔ آمین

وہ افسانہ نام یاد نہیں جس میں "مرید حسین" کی بیوی نے اس کی دوسری شادی کرائی اور آخر میں وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ اف مجھے لگا دروازے کے اس پار ہیروئن نہیں میں خود رو رہی ہوں۔

جون کے شمارے میں "یہ رسمیں" کی دلہن کا کردار بے حد پسند آیا۔ 80 فی صد دلہنیں اسی طرح خوار ہو کر نئے گھر پہنچتی ہیں۔ اف توبہ۔ ایک ہی تو دن ہوتا ہے پروٹوکول کا، لوگ وہ بھی انجوائے نہیں کرنے

سلمیٰ مسرت......راولپنڈی

(1) الحمدللہ ایسے بے شمار لمحے اللہ تعالیٰ نے عطا کیے ان کو یاد کر کے تنہائی میں مسکرا دیتی ہوں۔

فائیو کلاس میں پورے اسکول میں ٹاپ کیا کراچی کالج کے ہر کونے میں خصوصاً جمنازیم کینٹین لائبریری میں ہم چاروں فرینڈز کے قہقہے گونجتے تھے۔ منوڑہ میں لائٹ ہاؤس کے نیچے نیوی کا وہ بنگلہ جو موتیا گلابوں سے مہکتا تھا اس سبزہ زار پر بے شمار پارٹیاں، محفلیں اداس دنوں میں خوب رنگ بھر دیتی ہیں فرحت ہاشمی سے ملاقات ان سے تفہیم القرآن کی ڈگری وصول کی وہ لمحے میری روح کو شاد کر دیتے ہیں، جس روز ارسلان میری گود میں آیا میری کوئی بات والدین کے چہرے پر چمکتی مسکراہٹ کے حسین رنگ اور اب چھوٹی مرحا جس طرح میری طرف لپکتی ہے، پر بیٹے میری نواسی جتنے پیار سے امی جان کہتی ہے، میں کیا کیا لکھوں شکریہ اس حسین سوال کا جس نے اتنا کچھ یاد کروا دیا۔

(2) بے شمار طنز کے نشتر کھائے لیکن وہ ایک جملہ جو میرے والد کو کسی عورت نے کہا تھا تمہیں اللہ نے سب کچھ دے کر بھی کچھ نہیں دیا کیونکہ تمہارا بیٹا نہیں ہے۔ یہ سب مال پرائے گھروں میں چلا جائے گا۔"

اور ایک واقعہ بہت قریبی رشتہ دار کے گھر سے پنڈی واپس آنا تھا بچے بہت چھوٹے تھے۔ انہوں نے اپنی گاڑی پر ریلوے اسٹیشن چھوڑا اور پلٹ کر خبر نہ لی حالانکہ ان کے سامنے بات ہوئی تھی کہ ریل گاڑی کا انجن فیل ہو گیا ہے وہ پوری رات شدید حبس اور گرمی میں جس طرح بسر کی بھی نہیں بھولی۔

(3) عمیرہ احمد کی کہانی من وسلویٰ کی زینب کا یہ انجام نہ ہونے دیتی احد میں اصل کی شادی اسود سے کروا دیتی۔ کچھ کہانیاں بھول گئی ہیں۔ ابھی چاندی کے گھر کا بھی انجام پسند نہیں آیا سب کو ہیپی اینڈ اچھے لگتے ہیں یہ مانا کہ اصل جزا ہر بندے کو آخرت میں جنت میں ہی ملے گی لیکن اس دنیا میں بھی کچھ اچھے انجام انسان کو حوصلہ عطا کرتے ہیں، قلم کو جنبش ہی تو دینی ہے تو پلیز خیالوں میں سہی خوشیاں بانٹا کریں میں اتنی حساس ہوں کہ ٹی وی ڈراموں میں برائی نہیں دیکھی جاتی اکثر ظلم والی قسطیں ڈراپ کر دیتی ہوں اور پھر انجام بڑے شوق سے دیکھتی ہوں پتا نہیں کیوں لوگوں کی خوشیاں مجھے اپنی خوشیاں لگتی ہیں۔

(4) منفی کردار تو کبھی اچھے نہیں لگے البتہ "حالم" میں سعدی کی بہن کا کردار بہت مزے کا تھا۔ ثمرہ بخاری کے جوادی شیلی بھی بڑے مزے کے کردار تھے۔

حالم میں نمرہ کی ہیروئن اور اس کی افریقی دوست بہت زبردست کردار تھے۔

اس کے علاوہ عمیرہ سید کے ماسٹر ہدایت اللہ، عمیرہ احمد کے ناول دانہ پانی کا وہ ماشکی کیا خوب صورت کردار تھا۔

یہ کبھی نہیں بھولیں گے۔

میثے علی خان......خانیوال

(1) شعاع دسمبر 2023ء صفحہ 197 پر میری نظم چھپی تھی (عینا عبدل کے نام سے) جو کہ میں نے بالکل نہیں دیکھی اور جنوری کا شمارہ بھی پڑھ لیا تھا جب عالیان نے نظم رسالے میں پڑھ کر مجھے کہا ماما یہ تو وہ نظم نہیں ہے جو آپ نے لکھی ہے اور ہمیں بھی سنائی ہیں پر نام کوئی اور ہے تب میں نے دیکھی تو اس لمحہ جو خوشی محسوس ہوئی وہ تا حال محسوس ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ میں اسکول کوچنگ کرتی تھی تو میری ایک دوست جس کے ساتھ بہت گہری دوستی تھی میری ایک دفعہ میں بیمار ہو گئی تو تین دن تک اسکول نہیں جا سکی تو چوتھے دن جب میں اسکول گئی تو فرزانہ میری دوست جو دوسرے گاؤں سے آنے کی وجہ سے تھوڑا لیٹ آتی تھی مجھے دیکھتے ہیں جس طرح سے دونوں



ہاتھ اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا اس نے میرے دل کو بہت خوشی سے بھر دیا (دراصل ہمیں تو اتوار کا دن بھی ایک دوسرے کے بغیر گزارنا مشکل لگتا تھا کجا کہ میری بیماری کی چھٹیاں) تو دوست کے چہرے کی خوشی آج بھی یاد ہے۔

(2) میری شادی کے کچھ سالوں بعد میری نند کی شادی تھی تو میرے سسرال والوں نے مجھے ایک سوٹ اور جوتا دلوایا تھا (دھیان رہے صرف ایک سوٹ اور جوتا) اور دوسرا جوتا آدھے پیسے ملا کر میں نے خود لیا۔ اور یقین کریں کہ شام تک اور اگلے دن تک ہمارا قریباً سارا محلہ اور قریب کے رشتے دار وہ سوٹ دیکھنے اور جوتے دیکھنے کے لیے آچکے تھے مجھے بہت برا لگا۔ آج بھی غصہ آتا ہے۔

اس کے علاوہ وہ مجھے ایک دفعہ باجی نے کہا تھا (کسی بات پر) کہ اگر ہم تمہیں کچھ نہیں بتا رہے تو تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہمارے حلق میں انگلیاں ڈال کر ہم سے بات اگلواؤ، ان کی یہ بات آج بھی تکلیف دیتی ہے۔

(3) بہت سی کہانیاں بہت سے کردار پڑھ کر بہت رونا آیا اور اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں ماہ الملوک کی زیب النساء کو زندہ رکھتی۔ مجھے "کوئی لمحہ گلاب ہو" کے شہریار کی موت بھی پسند نہ آئی۔ یہیہ عبادی کہانی میں عباد کو بھی زندہ دیکھنا چاہتی تھی (حالانکہ تب شاید ناول لکھنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا)

(4) ... سیریز میں نانا ماموں کا کردار بہت پسند آیا ... لاجواب تھیں۔

رضوانہ وقاص کراں ... پور

سب سے پہلے شعاع کو اپنے چالیس سال مبارک ہو بلکہ چالیسویں سالگرہ مبارک ہو۔

(1) یادیں تو بہت ساری ہیں۔ سب سے زیادہ جو یادگار ہے وہ لکھ دیتی ہوں۔ تو وہ ہے میرا جہاز میں سفر کرنا وہ بھی اکیلی کراچی سے اسلام آباد۔ میں میٹرک کرنے کے بعد کراچی چلی گئی۔ نانو کے پاس رہنے کے لیے تو میرے عمیر ماموں کے گھر ننھے مہمان کی آمد ہوئی، دانیال کی کزن بھی اور ممانی بھی افسانہ ان کی خدمت کی بخیال رکھا، جو کام نانو اور نگینہ باجی بتاتی تھیں، وہ کر دیتی تھی۔ وہ عمر ہی لاپرواہی ہوتی ہے۔ اور ماموں نے سونے کے ٹاپس بنوا کر دیے تھے۔ وہ میری زندگی کے یادگار ترین دن تھے۔

ابو نے سعودیہ سے ٹکٹ بھیجا میرے ابو سعودیہ میں نوکری کرتے تھے۔ اس ٹائم تو سب نے بولا کیسے اکیلی جائے گی تم تو نانا ابو نے بولا میرا بیٹا سمجھ دار ہے۔ چلا جائے گا۔ اور کبھی نہ بھولنے والے دن۔ اور جب

دادی ماں زندہ تھیں تو ٹوبہ ٹانا میں سب گھومنے گئے تھے کیا دن تھے۔ بس اب اچھے دنوں کی یادیں ہی رہ گئی ہیں میرے پاس۔ ٹھیک کر دے اللہ جی! تیرے خزانے میں کسی چیز کی کمی نہیں۔

(2) ناگوار واقعہ میں گری میرا پاؤں ٹوٹ گیا اس کے بعد میں چل نہیں سکتی اور طنز کہ تم کوئی ٹی وی میں آتی ہو جو ہر کسی کو بتا رہی ہو۔ تم بیمار ہو۔ سب کو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ مشہوری کرتی بیوی بیمار ہے۔ لوگ آئیں دیکھنے کے لیے۔

اور جب پہلی بار بولا گیا کہ تم محتاج ہو گئی ہو۔

یہ دونوں باتیں ایسی چبھتی ہیں ناں جو کچھ بھی کر لوں یہ دل سے نہیں نکل سکتی۔ اب تو عادی ہو گئی ہوں اس بات کی۔ ہائیں یہ محتاج ہو گئیے۔ جوانی کی عمر چار پائی پر گزار رہی ہے۔

(3) خواتین کی کہانی ہے۔ ساری تو نہیں پڑھی۔ آخری قسطیں پڑھیں۔ "انگنا پھول کھلیں گے" راحت جبیں کی ثانیہ کے ساتھ فرخ کا سلوک اچھا نہیں لگا۔ پہلے اسے پانے کے لیے ثانیہ کا گھر خراب کر دیا اور جب بیوی بن گئی، پہلی رات ہی بے عزتی شروع اور پہلے شوہر کے طعنے دینا۔ میں مصنفہ ہوتی تو جہاں ثانیہ کی ساری غلطیاں عبید معاف کرتا آیا ہے۔ آخری بھی معاف کر کے اپنی زندگی میں جگہ دیتا اور تختی کرتا کہ اب آئندہ اور غلطی نہیں کرنی۔

(4) "شہر شام ہجر" مومن اور ایلیا کا کردار اچھا لگا۔ ان کی باتیں لطف دیتی تھیں۔ پوری کہانی میں ان کا پڑھ کر ہنستی رہی ویلڈن مومن ایلیا..... کیوٹ کپل۔ خاص کر ایلیا چھوٹی سی لڑکی دو بچوں کی اماں جانی (ہاہاہا)

ریحانہ چوہدری مدو کے (رندھیر یا گڑیاں)

سوشل میڈیا کے دور میں بھی ڈائجسٹ کی اہمیت کم ہونے کے بجائے بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ نا صرف قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر پسند کیا جاتا ہے۔ جس کا زندہ ثبوت دیس دیس سے آنے والے بہنوں کے خطوط ہیں۔

شعاع کے مرتب کرنے، لکھنے اور پڑھنے والوں سب کو سالگرہ مبارک۔

(1) جی جناب کیا سوال کیا ہے واہ!

حسین ساعتیں جو دل کے آنگن میں ٹھہر جاتی ہیں۔ اتنا شاعرانہ سوال ہے ہم جیسے خوش گمان، انتہائی جذباتی، وقت کے دامن سے اکثر حسین ساعتوں کو چرانے میں کامیاب تو ہو جاتے ہیں مگر رہ گیا ہے کہ عمر عزیز کے ہر دور میں ان ساعتوں کا رنگ جدا ہوتا ہے۔

اپنے دل کے آنگن میں ٹھہری ہوئی ساعتوں میں ایک تو وہ ساعت ہے جب ڈائجسٹ میں پہلی دفعہ میرا نام شائع ہوا۔ پھر جب امل جی کی فون کال آئی تو یوں محسوس ہو رہا تھا گویا میں ہواؤں میں اڑ رہی ہوں۔ پھر جب عمرے پہ گئے تو جب بیت اللہ میں پہلی مرتبہ داخل ہوئی۔

جب مسجد نبوی میں پہلی دفعہ گئی۔ ریاض الجنہ میں جب جب گئی۔ وہ تمام ساعتیں دل کی مکین ہیں۔

جب میں اپنے والد محترم سے آخری دفعہ ملی۔ وہ گھر کی بالائی منزل کی چھت پہ چارپائی پہ لیٹے تھے۔ تھوڑا اونچا سنتے تھے۔ میں سامنے ہوئی مسکرا کے انہیں سیلوٹ کیا تو مجھے دیکھ کر ان کی ذہانت سے بھرپور آنکھوں میں جو چمک پیدا ہوئی۔ ان کے فرشتوں جیسے سفید نورانی چہرے پہ جو مسکراہٹ نمودار ہوئی وہ یاد میرے دل کو اپنی مٹھی میں لیے ہوئے ہے۔ (اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے آمین)

(2) زبردست حسین امتزاج وضع کیا ہے یعنی پھولوں کے ساتھ خار بھی۔

ہزاروں الفاظ، جملے ایسے ہیں جو دل میں ترازو ہیں۔ مگر کیا کریں اپنی وفا کی خیابتیں ہم ان الفاظ اور جملوں کے خالق، طنزیہ الفاظ کی بارش کرنے والوں مہربانوں کو چاہ کر بھی بے نقاب نہیں کر سکتے۔

کہ ہم یہ نوازشات بھی کبھی کسی غیر کی سوغات نہیں ہیں۔ یہ ہمارے بہت اپنوں بہت پیاروں کی کرم فرمائیاں ہیں۔

ہزاروں ایسی باتیں ہیں جو یاد آ رہی ہیں لیکن بے قدر لوگ کی یادوں میں اپنا وقت برباد نہیں کروں گی۔ بس ان سب کے لیے ایک ہی دعا ہے۔

خدا نصب کرے، ان کو دائمی خوشیاں
عدم وہ لوگ جو ہم کو اداس رکھتے ہیں

جو ہماری پر خلوص رفاقت کے حقدار تھیں ہم انہیں میسر ہی نہیں ہوں گے۔

(3) بہت سی کہانیوں نے رونے پہ مجبور کیا۔ جنہیں مشکل سے مکمل کرنے کے بعد بہت دن تک کچھ بھی پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔

بہت معذرت کہ یادداشت اتنی اچھی نہیں مگر آج کل تو سمیرا جی کی، پردیس پہ ہر مہینے موتیوں کے یہ خزانے بے دریغ اور بے حساب لٹائے جا رہے ہیں۔ بہت سی کہانیوں کے بہت سے کردار رلا دیتے تھے۔ دل میں اک درد کی لہر جگا دیتے تھے۔

(4) ہر شمارے میں بہت سے کردار دل پہ دستک دینے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ مگر آپ نے شرط ایک کردار کی رکھی ہے تو میرا خیال ہے کہ جنوری 2025 کے شمارے میں مکمل ناول شائع ہوا تھا، عائشہ نصیر احمد کا جس کا نام تھا "سلسلے دل کے" اس ہیرو کے اباجی فضل صاحب کا کردار دلچسپ بھی تھا اور اپنے اندر ورائٹی بھی رکھتا تھا۔

صائمہ گل......مردان

1۔ دھوپ چھاؤں سی زندگی خوشی و غم سے عبارت ہے۔ اس رب کریم کا بڑا احسان ہے کہ وقت نے بہت سے حسین پل کئی خوش گوار یادیں ہماری جھولی میں ڈالے ہیں۔ جیسے پہلی بار ماں بننا جب نہال میری گود میں آیا۔ پہلی بار اس کا "ماما" بولنا میرے خیال میں یہ دنیا کی ہر خطے کی ہر عورت کا سب سے خوب صورت قیمتی اور یادگار لمحہ ہوتا ہے۔

اسی طرح کچھ عرصہ پہلے عمرہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ خانہ کعبہ پر پڑنے والی پہلی نظر۔ جب نگاہ جھک جھک جاتی۔ آنسو دامن بھگوئے جاتے یقین و بے یقینی کی کیفیت دل کا مچل مچل کر رب کو پکارنا عجب سی سرشاری، عجیب سا احساس جہاں صرف آپ ہوتے ہیں اور آپ کا اللہ۔ اللہ ہر مومن کو اپنے در کی حاضری نصیب کرے۔ آمین۔

اور چودہ دسمبر کا وہ دن بھی یادگار ہے جب میری فرمائش پر میاں صاحب مجھے اپنی کینٹ لائبریری لے کر گئے۔ کتابوں سے بھری خوب صورت لائبریری جہاں خاموشی کا راج تھا مگر کتابیں گفتگو کرتی رہیں۔ وہاں دل کھول کر آپ بیتی، مزاح، سفرنامے، ناول، افسانے چن چن کر نکالے اور بیگ بھر کر لائی۔ بہت سارا تھینک یو میاں جی۔

(2) ہم مشرقی خواتین دل پر پتھر رکھ کر ناگوار جملے اور طنز سہنے میں ماہر ہیں۔

وہ باتیں کھا گئیں مجھ کو
جو باتیں پی گیا تھا میں

ویسے جملوں سے زیادہ روکھے رویے تکلیف دیتے ہیں، جب ماں باپ کے جانے کے بعد کوئی عید پر بھی نہ بلائے تو نہ پوچھیں وہ پھر کیسے گزرتی ہے۔

اور جب سسرال میں ہر دوسرا بندہ پوچھے آپ گئیں نہیں تو کبھی گرمی کا، کبھی بچوں کا کبھی وقت کی قلت کا بہانہ بنا کر درد دل چھپا لیتے ہیں۔

اللہ ہر بیاہی بیٹی کے والدین کو سلامت رکھے اور جو بیاہی بیٹیاں ہیں، وہ اپنی بیاہی نندوں کا اس ایک دن کا بھرم رکھ لیں۔

(3) جون 2015 میں شعاع میں شائع ہونے والی تحریر خالی آسمان نے پہلے ہنسایا اور پھر رلایا۔ جون 2025 میں دوبارہ پڑھ کر سوچا اس دفعہ خط لکھوں گی تو سائرہ سے ریکویسٹ کروں گی کہ اس کا دوسرا حصہ لکھ دیں۔ جس میں بے جی کو اس کا تارے مل جائے مگر کیا پتا تھا کہ لکھنے والی ہی نہ رہے گی۔ سائرہ کے انتقال کی خبر مجھے تین جولائی کو ملی۔

(4) خالی آسمان کا معصوم سا تارے عجیب سی انسیت ہو گئی تھی اس کردار سے۔

آب حیات کا شریر نٹ کھٹ سا چن کا بچپن۔ دل کرتا کہ یہ یونہی چھوٹا رہے، کبھی بڑا نہ ہو۔

یارم کا کارل عمر یسرا میں جنت کا بچپن۔ نمل کا ہاشم کا کردار جو ولن ہو کر بھی ولن نہیں لگتا تھا۔

☆☆

دستک، دستک
دستک

شاہین رشید



مصباح نوشین

"عشق تماشا"، "مہر پوش"، "سکون"، "اے دل"، "بدذات"، "کبھی سوچا نہ تھا"......اور کئی ڈرامہ سیریل کی تخلیق کار اور سب کی پسندیدہ مصنفہ مصباح نوشین ہیں۔

مصباح سے تھوڑی بات چیت اور آج کل کیا مصروفیات ہیں اس حوالے سے جو گفتگو ہوئی۔ آپ کی نذر ہے۔

تمہارا ایک سیریل شروعات میں ہی تنقید کا نشانہ بنا۔ کیا کہو گی اس بارے میں؟

"ہم جب مارکیٹ میں کوئی نئی چیز لے کر آتے ہیں تو یقیناً کچھ الگ ہی چیز لے کر آتے ہیں تو اس میں تنقید و تعریف ہونا بنتی ہے۔ میں بہت زیادہ ذہنی طور پر تیار تھی، اس سیریل کو لکھتے ہوئے کہ اس پر تنقید ہوگی۔ مگر اتنی امید نہیں تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں پروڈکشن کے بہت زیادہ مسائل ہیں۔ اس میں ڈائریکشن کی بہت زیادہ غلطیاں ہیں۔ میرے لکھے ہوئے بہت سارے سین شوٹ نہیں ہوئے۔

ڈرامہ تو تنقید کا نشانہ بنا ہی ہے مگر مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ لوگوں نے مجھے بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ میری ذاتیات پر بات کی ہے۔ مجھے پر پرسنل اٹیک کیے ہیں۔ میری رائٹنگ پر بہت باتیں ہوئیں کہ میں تو لکھتی ہی بہت برا ہوں۔

مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں نے آج تک کوئی اچھا کام کیا ہی نہیں ہے۔ لوگوں کی عادت ہے کہ ایک برا کام دس اچھے کاموں پر بھاری کر دیتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ تنقید بھی مارکیٹنگ کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ اس لیے میں بہت زیادہ پروا نہیں کرتی۔ ڈرامہ میں نہ اکیلی لکھتی ہوں، نہ ڈائریکٹر کے پاس ڈائریکٹ جاتا ہے اور نہ ہی فنکاروں کے پاس ڈائریکٹ جاتا ہے اور فنکار اسی وقت کوئی کردار قبول کرتے ہیں جب انہیں اس میں کچھ نظر آ رہا ہوتا ہے۔

"اب لوگ اسے پسند کر رہے ہیں، اس کی ریٹنگ میں روز اضافہ ہو رہا ہے۔ تو کسی بھی چیز کے لیے نتیجہ جلدی اخذ نہیں کر لینا چاہیے۔ تھوڑا انتظار

کرلیا کریں۔"

"تنقید سے دل تو دکھتا ہوگا؟"

"تنقید بھی اسی پہ ہوتی ہے جس کا کام دیکھا جاتا ہے۔ لوگ دیکھ رہے ہیں تو بات کر رہے ہیں اور ہر انسان کا اپنا پوائنٹ آف ویو ہوتا ہے۔ سوچنے کا انداز مختلف ہوگا جس طرح میں زندگی کے بارے میں سوچتی ہوں یقیناً آپ اس طرح نہیں سوچتی ہوں گی۔

تو تنقید سے میرا دل نہیں دکھتا بلکہ میں تو تنقید کو مثبت لیتی ہوں۔ میں نے اس کو منفی کبھی نہیں لیا۔ ہاں اگر کوئی پرسنل اٹیک کرے تو پھر میرا دل دکھتا ہے۔ سوشل میڈیا پر لوگ پرسنل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی بندہ چھپا وطنی میں بیٹھ کے یو کے میں، کراچی میں یا چیچوں کی ملیاں میں بیٹھ کر کوئی بات کرے میرے بارے میں جس کو میں جانتی نہیں ہوں تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا فرق پڑتا ہے ان کی تنقید سے جو نہ صرف پڑھے لکھے ہیں بلکہ جن کو میں ذاتی طور پر جانتی ہوں۔

جب میرا پروڈکشن ہاؤس میرے کام سے مطمئن ہے۔ میری کاسٹ اور ڈائریکٹر مطمئن ہے تو میری کامیابی تو یہی ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ چیز اچھی تھی یا بری محنت سب نے کی ہے۔ بہت اچھے کاموں پر اگر ایک برا کام حاوی ہو رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ لوگوں کو مجھ سے بہت زیادہ توقعات تھیں، جس پر میں پوری نہیں اتری تو ان شاءاللہ میں کوشش کروں گی کہ زیادہ محنت کروں اور لوگوں کی توقعات پر پوری اتروں۔

ویسے ہم رائے قائم کرنے میں بہت جلدی کر دیتے ہیں۔ کوئی بھی چیز نہ مکمل بری ہوتی ہے اور نہ ہی مکمل اچھی ہوتی ہے۔ فلاوز ہمیشہ ہوتے ہیں مگر ہم بہت جلد بازی دکھا دیتے ہیں جو کہ رائٹر کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔"

"کہانی تمہاری اپنی ہوتی ہے یا کسی کی کہانی پر



ڈرامہ لکھتی ہو۔"

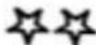
"میں ہمیشہ اپنی کہانی دیتی ہوں۔ ٹاپک پوچھ لیتی ہوں کہ آپ کو کس موضوع پر ڈرامہ چاہیے۔"

"تم نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ اس پر ایک طویل انٹرویو ہو سکتا ہے کچھ نجی زندگی کے بارے میں بتاؤ؟"

"الحمدللہ گھریلو لائف بہت اچھی ہے۔ اور اللہ کا بہت شکر ہے کہ میرے میاں صاحب بہت سپورٹیو ہیں۔ ہمارے گھر کا ماحول بہت اچھا ہے لڑائی جھگڑے سے پاک۔ بچوں کی تربیت بہت اچھی ہو رہی ہے اور الحمدللہ جب بھی کوئی مل کے جاتا ہے تو کہتا ہے کہ اتنی مصروفیات کے باوجود، تم نے بچوں کی پرورش بھی بہترین کی ہے کہ تمہارے بچے سلجھے ہوئے اور بہت تمیزدار ہیں۔ تمہارا گھر بہت صاف ستھرا ہے تو میں سمجھتی ہوں کہ بہ حیثیت ہاؤس وائف کے اور بہ حیثیت ایک ماں کے یہی میری کامیابی ہے۔

اور بچے بھی ماشاءاللہ بڑے ہو گئے ہیں اور ٹین ایج میں چلے گئے ہیں میرا بڑا بیٹا سیونتھ کلاس میں ہے۔ بیٹی بھی کلاس سیونتھ میں ہے۔ ماشاءاللہ"

مصباح نوشین کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں۔ اتنی پیاری اتنی پرخلوص، اتنی اچھی لکھاری اور اتنی کوآپریٹو ہے کہ مجھے کبھی انٹرویو کے لیے اس کی منت سماجت نہیں کرنی پڑی۔ اور مصباح کے دل میں میرے لیے جو عزت واحترام ہے اس کے لیے میں اس کی بہت مشکور ہوں۔



معروف اداکار

زین افضل سے ملاقات

ثمینہ رشید



زین افضل کا شمار بھی اب ان فنکاروں میں ہوتا ہے جو نہایت سلجھے ہوئے پوزیٹو کردار کرتے ہیں۔ آج کل ان کے ڈرامے مختلف چینلو سے آن ایئر ہیں۔ ان کا ایک مختصر انٹرویو آپ کی نظر ہے۔

"السلام علیکم کیسے مزاج ہیں؟"

"الحمدللہ...... اللہ کا شکر ہے آپ بتائیں۔"

"کیا مصروفیات ہیں آج کل؟"

"وہی جو ایک فنکار کی ہوتی ہیں۔ کام کام اور بس کام۔"

"گویا قائداعظم کے قول پر عمل ہو رہا ہے؟"

"جی...... جی بالکل۔"

"آپ نے زیادہ تر کامیڈی رول کیے۔ اب آپ کے ڈرامے یا آپ کے کردار تھوڑے سنجیدہ ہو گئے ہیں۔ کیوں؟"

"بس۔ تو انسان کے موڈ پر اور ملنے والے کرداروں پر منحصر ہے۔ کبھی کامیڈی کردار آفر ہو جاتے ہیں تو کبھی سنجیدہ۔ تاہم مجھے دونوں طرح کے کردار کرنا پسند ہے۔"

"آپ کے ڈراموں کی فہرست کافی لمبی ہے تاہم شہرت کے لیے کس ڈرامے کا نام لیں گے؟"

"آپ بالکل صحیح کہہ رہی ہیں۔ میں کافی ڈراموں میں کام کر چکا ہوں مثلاً "تم ہو جینے کی وجہ"۔ "ریشم گلی کی حسنہ"۔ "مایا"۔ "ضدی"۔ "قفس"۔ "بے پناہ" وغیرہ وغیرہ اور جو ڈرامہ بہت پسند کیا گیا وہ "سانوری" اور "بے پناہ" تھا اور کامیڈی تو سب ہی مقبول ہوئے ہیں میرے مقبول ڈراموں میں "کون کرتا ہے وفا"۔ "جان نثار"۔ "میرے چھوٹے میاں"۔ "بدنام"۔ "جبر" اور "سانوری" جس کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔"

"آس پاس کیمرے اور اس پر رومینٹک کردار مشکل ہوتی ہے؟"

ہنستے ہوئے۔ "دلچسپ سوال ہے۔ مشکل بھی ہے۔ لیکن میں ہوں یا جو میرے سامنے ہے سب کو پتا ہے کہ ہم ڈرامہ ریکارڈ کروا رہے ہیں۔ حقیقت میں ایسا کچھ نہیں ہے اور ہم تو کیمرے کے سامنے اور اپنی ٹیم کے سامنے ہر طرح کے کردار کر رہے ہوتے ہیں اور انجوائے کرتے ہیں۔"

"اس فیلڈ سے وابستہ ہوئے کتنے سال ہو گئے ہیں اور جب پہلی بار اپنے آپ کو اسکرین پہ دیکھا تو کیسا لگا؟"

"مجھے اس فیلڈ سے وابستہ ہوئے تقریباً چودہ سال ہو گئے ہیں۔ اور جب پہلی بار اپنے آپ کو اسکرین پہ دیکھا تو بہت فخر ہوا۔ بہت اچھا لگا۔"

"ایک کردار جو بھول نہیں سکتے اور ایک کردار جو

آپ کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں نے ایک تھیٹر پلے کیا تھا جس کا نام "جھانجر دی پون" اس میں جو کردار میں نے کیا تھا نہیں بھول پاؤں گا اور فیوچر میں...... شاہد آفریدی کا رول کرنا چاہتا ہوں وہ میرا پسندیدہ کھلاڑی ہے۔"

"اپنی پرفارمنس پہ کوئی تبصرہ کرنا چاہیں گے؟"

"بالکل ...... کہ میں کام میں اپنا سو فیصد دیتا ہوں مگر پھر بھی جب اپنی پرفارمنس دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ کہیں نہ کہیں کچھ کمی رہ گئی ہے۔ تو پھر اسے مزید بہتر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"اپنے ہی کسی کردار سے کوئی مایوسی ہوئی؟"

"مطلب کر کے...... نہیں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں بہت سوچ سمجھ کر کردار لیتا ہوں۔"

"فلمیں کیں؟"

"جی جی الحمدللہ کی بھی ہیں اور کر بھی رہا ہوں۔"

"اس فیلڈ میں کام کے حوالے سے کوئی خواہش؟"

"کہتے ہیں نا کہ ہزاروں خواہشیں...... اور اس طرح میری بھی خواہش ہے جو کہ بہت ہی انوکھی خواہش ہے کہ مجھے "آسکر ایوارڈ" ملے ہاہاہا...... خواہش کرنے میں کیا حرج ہے۔"

"ہوں گڈ...... زندگی میں سب سے قیمتی چیز کیا خریدی اپنی کمائی سے؟"

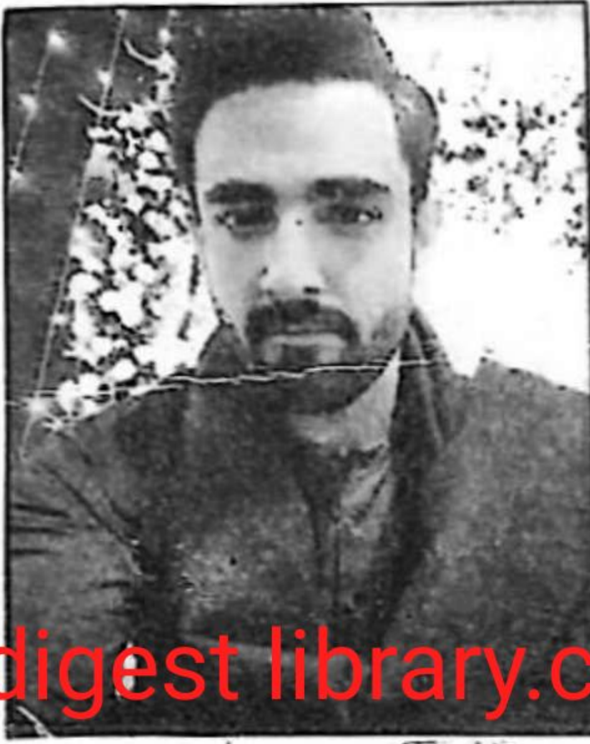
"اپنی کمائی سے پہلے تو صدقہ دیا پھر ایک اچھا سا موبائل خریدا اور اپنی کمائی سے کچھ خریدنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔"

"اور اب تو...... اللہ کا کرم بھی ہے؟"

"بالکل کرم ہے۔ مگر مجھ سے بچت نہیں ہوتی۔ اگرچہ میں فضول خرچ بھی نہیں ہوں مگر پھر بھی دور ہی ایسا ہے مہنگائی نے سب خوشیاں چھین لی ہیں۔"

"فیوچر کے لیے تو سوچتے ہوں گے؟"

"ہاں سوچتا ضرور ہوں۔ مگر پلاننگ نہیں کرتا۔ کیونکہ ہمارے لیے پلان کرنے والا اوپر یعنی ہمارا اللہ ہے۔ وہ جو کرے گا بہتر کرے گا۔ مجھے اللہ سے



پوری امید ہے۔"

"بے شک کامیابی کے لیے اللہ وسیلہ بناتا ہے۔ آپ کا وسیلہ کون ہے؟"

"اگر میں کہوں کہ میرا وسیلہ میری فیملی ہے۔ میری بیگم ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ ان کا تعاون ان کی دعائیں سب نے مجھے اس مقام تک پہنچایا ہے۔ اسی لیے میں اپنی فیملی کا بہت شکر گزار ہوں۔"

"دنیا میں بہترین انسان کس کو کہیں گے...... اور آپ نے اپنی ترقی میں بیگم کا ذکر بھی کیا۔ بیگم کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں؟"

"میری نظر میں دنیا کا بہترین انسان وہ ہے جس کے دل میں پیار و محبت کے جذبات ہوں اور جن کے دل میں انسانیت کے لیے دکھ درد کا احساس ہو......

اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ بیگم کے ساتھ کاموں میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ مگر اب زیادہ فرصت نہیں ملتی۔ لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ میں کوکنگ بہت اچھی کر لیتا ہوں اور مجھے شوق بھی بہت ہے۔ تو کچھ نہ کچھ ٹرائی کرتا رہتا ہوں۔"

"تو کبھی شیف بننے کا خیال آیا؟"

"نہیں کبھی نہیں...... کیونکہ مجھے اپنے کام سے

فرصت ہی نہیں۔ یہ تو ایک شغل ہے جو کر لیتا ہوں۔ مجھے خود بھی اچھا لگتا ہے۔"

"شوبز سے یا وہاں کے لوگوں سے کوئی شکایت؟"

"لوگوں سے تو کوئی شکایت نہیں ہے۔ البتہ یہ ایک ایسی جاب ہے کہ جس کے لیے کوئی ٹائمنگ نہیں۔ عام جاب میں ٹائم فکس ہوتا ہے۔ مگر اس فیلڈ میں کوئی ٹائم نہیں۔ کبھی بہت جلدی فارغ ہو جاتے ہیں کبھی بہت دیر میں...... کبھی صبح جلدی جانا پڑتا ہے تو کبھی دوپہر کو جانا ہوتا ہے۔"

"بیک وقت آپ ہوں یا دیگر فنکار کئی کئی ڈرامے کر رہے ہوتے ہیں جن کی شوٹس بھی روزانہ ہی ہوتی ہیں موڈ بنانے میں مشکل تو ہوتی ہوگی؟"

"بالکل ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ ہمیں اسٹوری اور اپنے کردار یاد ہوتے ہیں تو سیٹ پہ جانے سے پہلے کچھ ٹائم ہم موڈ بنانے میں ضرور لیتے ہیں۔ پھر سب نارمل ہو جاتا ہے۔ اور میں ہی کیا اللہ نے یہ صلاحیت سب ہی فنکاروں کو دی ہوتی ہے۔ اب ایک موڈ کو بار بار بدلنے میں زیادہ پریشانی نہیں ہوتی۔" "پہلے زمانے میں ایک ہی ڈراما ہوتا تھا دوسرا ڈراما اس وقت تک نہیں ملتا تھا جب تک کہ پہلے ڈرامے کو تین ماہ نہیں گزر جاتے تھے...... اب ایسا نہیں ہے؟"

"جی...... جی بالکل اب ایسا نہیں ہے...... اور ہمارے ڈرامے بھی اتنی جلدی جلدی آن ایئر نہیں ہوتے۔ ان کی تیاری میں ایڈیٹنگ میں مارکیٹنگ میں کئی کئی ماہ بلکہ سال بھی گزر جاتے ہیں۔ تو ایسا نہیں کہ روز کام ہے تو روز کے روز کا ہے۔ ہر کام میں ٹائم لگتا ہے۔"

"لوگ پہچان لیتے ہیں؟"

"ہاں...... ہاں کیوں نہیں...... پہچان لیتے ہیں دور سے اشارے بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ اپنے ساتھ والے کو بھی بتا رہے ہوتے ہیں اور کچھ تو نزدیک آ کر سیلفی بھی بنوا رہے ہوتے ہیں۔ تو اچھا لگتا ہے یہ سب کچھ...... لوگ پیار محبت سے ملتے ہیں تو ہم بھی ویسا ہی رسپانس دیتے ہیں۔"

"اب شہرت حاصل کرنا آسان ہے یا گزرے وقت میں آسان تھا؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ اب شہرت حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ حالانکہ اب چینل بے شمار ہیں۔ ڈرامے لاتعداد ہیں۔ لوگ دیکھتے ہیں بس ختم...... پہلا زمانہ اور ہوتا تھا۔ ہفتے میں ایک ڈراما اور بعد میں ڈیلی ایک ڈراما، ایک ہی چینل...... تو لوگوں کو ڈرامے بھی یاد رہ جاتے تھے اور کام کرنے والے بھی۔ اب نہ لوگوں کو ڈرامے یاد رہتے ہیں نہ کام کرنے والے...... تو اس دور میں شہرت حاصل کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ میری نظر میں۔"

"معیار پر بھی اثر پڑا ہے شاید اسی لیے؟"

"یہ ایک لمبی بحث ہے۔ ڈرامے تو آج کے دور میں بھی بہت اچھے اور برے پیش کیے جا رہے ہیں۔ جس طرح میرے دور میں بھی ایسا ہی تھا۔ کوئی چیز ہمیشہ پرفیکٹ نہیں ہوتی۔"

"اپنی شخصیت کو بیان کریں؟"

"یہ تو دوسرے لوگ زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں۔ پھر بھی اپنے لیے کہہ سکتا ہوں کہ مزاج کا اچھا ہوں۔ اپنی فیملی کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ رومینٹک مزاج بھی ہوں۔ خوش خوراک بھی ہوں اور اچھا پکا بھی لیتا ہوں۔ بھوک برداشت نہیں تو بھوک کو کم کرنے کے لیے سگریٹ پیتا ہوں۔ یہ اور دوسروں کی بھلائی چاہتا ہوں۔ نفرت کرنا آتی بھی نہیں۔ محبت بانٹتا ہوں۔ بس میرے حساب سے کافی ہے۔"

"کوئی بات جو دوسروں سے کہنا چاہیں گے؟"

"یہی کہ دوسروں سے زیادہ امیدیں نہ باندھا کریں کہ سوائے دھوکہ اور دکھ کے کچھ نہیں ملتا۔ صبر و شکر کرنا اور برداشت کرنا سیکھیں۔ اگر آپ میں صبر و شکر ہوگا تو زندگی بہت آسان گزرے گی۔"

☆☆

فرخندہ سلیم نے ملتان سے شرکت کی ہے
فرخندہ نے پورے سال کے شماروں کا جائزہ لیا ہے۔ لکھتی ہیں جہاں پہلی شعاع نے پورے سال اپنی مثبت و تعمیری باتوں سے ہمیں روشنی کی شعاع دکھائی۔
وہیں نبیؐ کی باتیں ہر ماہ پڑھ کر دینی آگاہی حاصل ہوتی رہی۔
شاہین نے ہر ماہ کچھ بہت اچھے اور کچھ کم اچھے اداکاروں کے انٹرویو کیے، سال نو، عید نمبر اور بقر عید نمبر اور 2024 کے سالگرہ نمبر میں مجھ سمیت قارئین نے خوب دھڑلے سے سروے میں شرکت کرنا اپنا حق سمجھا۔ پورے سال ''ناتا جوڑا'' میں عرق ریزی سے سسرال والوں کے ظلم و ستم کی داستانیں بیان ہوئیں۔ ''باتوں سے خوشبو آئے کی خوشبو نہ ہوتی تو شعاع نامکمل ہوتا۔
قارئین بھی شعاع کے ساتھ ساتھ رہیں سلسلے میں اور موسم کے پکوان ہمیں سسرال اور شوہر کی معدے سے شروع دل تک رسائی حاصل کرنے کا فن سکھا رہے تھے آخری سلسلہ کے بے ضرر کار آمد نسخے اتنے اچھے تھے کہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو ہر کوئی ہم پر لٹو ہو جائے۔ تاریخ کے جھروکوں میں ہر ماہ اڑنے والے قالین پر بیٹھ کر ماضی میں جانا اور ان کے کارنامے دیکھنا کافی دلچسپ تھا تو مسکراہٹیں ہر ماہ ہنسانے میں کبھی ناکام کبھی کامیاب ہوئیں۔
دھوپ دریچہ سلسلے وار ناول میں مریم عرق ریزی سے سنجیدہ پن دکھا رہی ہیں مجال ہے کوئی شوخی یا ہنسی مذاق ہو جس سے دلچسپی آ جائے اور ہر ماہ نئے کردار پیدا ہو رہے ہیں۔
نگہت کا کامیاب ترین سلسلے وار ناول اینڈ پر ہے جس میں زل کی خوشیوں کے سنگ حمزہ اور مرتضٰی کے انجام کا انتظار ہے۔
اگست 2024 کے سرورق کی پیاری دلہن ''سلام عشق میری جاں ذرا قبول کر لو'' گانے میں ریکھا کی کاپی لگی۔ کہانیوں میں افشاں آفریدی کا ناول سالگرہ نمبر میں رومانوی انداز اور مزاح کی وجہ سے پسند آیا تھا زرقا سکندر، شازیہ جمال اور عقیلہ ہاشمی نے خوب تر لکھا۔
ستمبر کی ماڈل حسین سے نیلے لباس میں کردار کی کمزور لگی۔ ناولز میں صائمہ نور اور قانتہ رابعہ جب کہ افسانوں میں جویریہ مریم، نظیر فاطمہ نے خوب لکھا۔





خط بھجوانے کے لیے پتا۔
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:shuaa@khawateendigest.com

اکتوبر کی ماڈل حسین سے پہاڑی علاقے میں صبح کے وقت چہل قدمی کرتی نظر آئی اور اللہ جانے کیوں صبح سویرے نکل پڑی۔ اس بار صبا واجد اور ساجدہ لطیف کے ناول جچ رہے تھے شازیہ الطاف، حنا بشریٰ اور حمیرا شیخ کے دلچسپ افسانے شامل تھے۔
نومبر کے سرورق پر گاؤں میں موجود اے آئی کی پیداوار پاگل سی ماڈل کو دیکھا، مجھے بالکل بھی سرورق پسند نہ آیا۔ ام ہانی جمع آسیہ رئیس کے ناول وہیں جویریہ حیدر اور ماریہ غزال کے افسانے خوب رہے۔
دسمبر کی باولی سی ماڈل نخرے سے کالے رنگ کے لباس میں کیلاش اسٹائل میں کھڑی اترا رہی تھی۔ ثمین صداقت کا ناول زیادہ اچھا لگا وہیں دانیہ سمیع، زینب نور اور دونوں حمیراؤں (عروش و نوشین) نے افسانے خوب لکھے۔
جنوری کی ماڈل بھینس کی طرح موٹی تازی تھی جس کی سرخی کا شید اور لمبے جھمکے پیارے تھے عائشہ نصیر اور فلک تنویر کے ناول حسین تر تھے امبر، نازنین فردوس اور قرۃ العین ہاشمی کے افسانے اچھے زیادہ لگے۔
فروری کی ماڈل کا اسٹائل بہت پسند آیا۔ عیشہ حسین

اور بشریٰ احمد کے ناول وہیں آسیہ جمہ، قراۃ العین سکندر اور عقیلہ ہاشمی کا لکھا دل پر گولی کی طرح ٹھا کر کے لگا۔

مارچ کی ماڈل کی آنکھیں کچھ بھینگی سی تھیں مگر سوٹ ہلکے نیلے رنگ کا اچھا تھا۔ نزہت جبین ضیا، راشدہ رفعت کے ناول جب کہ آسیہ ساجد علی اور عینا عمر خان کے افسانے زیادہ اچھے تھے۔

اپریل کی ماڈل اپنی سسرال سے آئے عید کے سوٹ میں تیار ہو کر کافی اچھی لگی۔ حبیبہ شیراز کا مکمل ناول اور ریحانہ وقاص اور عاصمہ فرحین کے افسانے زیادہ پسند آئے۔

مئی کی ماڈل جس نے حسین سی ساڑھی کا پلو سر پر لیا ہوا تھا۔ اللہ جانے کیوں شعاع پڑھنے والیوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ امت العزیز شہزاد اور ایمن علی کے ناول اور سارے ہی افسانے حسین تر تھے۔

جون کی ماڈل خوب دھڑلے سے تنی ہوئی گردن کے ساتھ کھڑی تھی۔ جس کے کانوں کے بندے اور بالوں کے پھول خوب تھے۔ عید کی مناسبت سے افشاں آفریدی کا طویل مکمل ناول جو کافی مزاحیہ تھا عید نمبر کی پہچان تھا جو پسند آیا۔ ساتھ مریم طاہر اور مریم انصاری کے افسانے دلکش تر تھے۔ جولائی کی ماڈل اترا اترا کر پوز بنا کر تصویریں بنوتی ہوئی بہت اچھی لگی۔ صائمہ نور کا ناولٹ، صدف عمر کا ناول اور انشین نعیم وحنا جاوید کے افسانے بہت پسند آئے۔

اگست 2025 کا سالگرہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے جسے آپ پڑھ رہی ہیں اور مجھی اے آئی کی ماڈلز میں کیڑے نکالنا ہمارا حق ہے۔ کون سا ماڈل اللہ کی بنائی انسان ہے۔ ایک بار پھر سے اس دعا کے ساتھ سالگرہ مبارک۔ ڈائجسٹ پہلے کی طرح ہاتھی کی طرح صحت مند سے ہو جائیں سب کہو آمین۔

ج: پیاری فرخندہ! آپ نے پورے سال کے شماروں پر بڑی باریک بینی سے تبصرہ کیا ہے۔ خصوصاً ہماری بے چاری ماڈلز کو تو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا وہ تو اب ٹائٹل پر آتے ہوئے سو بار سوچیں گی۔

اقراء عزیز نے گاؤں جلبانی سے لکھا ہے

اس دفعہ میرا ذرا بھی دل نہیں چاہ رہا کسی بھی چیز پہ تبصرہ کروں، میں بھی خط لکھتی تھی کیونکہ یہاں ڈاک کا مسئلہ ہے بابا میرا خط T.C.S کرواتے تھے اور میرا ٹوٹا پھوٹا خط میرے بابا پڑھ کے خوش ہوئے تھے، میری تو دنیا ہی اجڑ گئی ہے میرے پیارے شفیق بابا ہم سے باتیں کر کے اچھے بھلے سوئے اور فجر کے ٹائم اٹھے نماز پڑھی تسبیحات پڑھنے کے بعد جو سوئے تو پھر ہمارے لاکھ جگانے کے باوجود بابا نہیں اٹھے ہفتے کے دن میرے ابو کی وفات ہوئی ابھی تک ہمیں یقین نہیں آتا کہ بابا ہمیں چھوڑ گئے ہیں ایسا لگتا ہے بابا اچانک سے کہیں آئیں گے۔

میرے بابا سندھی زبان کے صوفی شاعر تھے غریبوں کے ساتھ بابا کی دوستی تھی ہر وقت ہر ایک کے لیے فکرمند بابا۔ لوگ پیسوں کے امیر ہوتے ہیں۔ میرے بابا دل کے امیر تھے اللہ بھی کسی بیٹی سے باپ کا سایہ نہ چھینے۔

مسکراہٹیں ہوں یا احادیث ہر چیز پرفیکٹ ہوتی ہے۔ شمارہ چودھویں کے چاند کی طرح تب مہکتا ہے جب سمیرا احمید اپنے لفظوں سے روشنی بکھیرتی ہے۔ دعا ہے یہ محفل یونہی سجتی رہے قائم دائم رہے آمین۔

ج: پیاری اقراء! امیرا احمید کے لیے آپ جو خط لکھا ہے۔ ہم پوری کوشش کریں گے ان تک پہنچ جائے۔

آپ کے والد کی وفات کا جان کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

آپ نے یہ کیسے لکھا کہ آپ کی اردو کمزور ہے۔ عزیز بہن آپ کی اردو بہت اچھی ہے۔ خط بھی آپ نے بہت اچھا لکھا ہے۔ رائٹنگ پڑھنے میں تھوڑی دشواری ضرور ہوئی ہے۔

پشاور سے کائنات وزیر نے لکھا ہے

یقین کریں زندگی میں مجھے شاید ہی کبھی اپنا نام اتنا پیارا لگا ہو جتنا آپ کے جواب دینے پر لگا۔ خوشی اور جوش کے مارے بہن کو نیند سے ہڑبڑا کر اٹھایا۔ بچاری گھبرا گئی نجانے کیا ہو گیا۔ پھر خط لگنے کی خوشی میں انعام بھی وصول کیا۔

حمد و نعت سے مستفید ہو کر پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھ کر دل ایمان کی روشنی سے بھر گیا۔

اداکار احد رضا میر سے ملاقات اچھی رہی۔ ویسے مزے کی بات بتاؤں احد رضا میر کا پہلا انٹرویو بھی میں نے شعاع میں ہی پڑھا تھا اور وہ ڈائجسٹ آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ "عید الاضحیٰ" کے سروے کے جوابات پڑھ کر مزہ آیا۔ ہر گھرانے کی اپنی ایک الگ روٹین ہوتی

ہے لیکن عید کی صبح یکجی سب گھروں میں بنتی ہے۔" دھوپ
دریچہ" اچھا جا رہا ہے۔ اگلی قسط کا بے صبری سے انتظار رہتا
ہے۔ مکمل ناول" چاند کی عید" افشاں آفریدی کا پسند آیا۔
ایمن علی کے ناول کی دوسری قسط" چاندی کے گھر" نے
چند لمحوں کے لیے اداس کر دیا۔ ماہم جیسے لوگ جو ہمیشہ
شارٹ کٹ ڈھونڈتے ہیں ان کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔
اور موسیٰ جیسے معصوم یوں ہی گلیوں میں رل جاتے ہیں۔
کہانیوں میں سب اچھا ہوتا ہے۔ حقیقت میں ایسا نہیں
ہوتا...... اور ہر کسی کو بیلا اور ہارون جیسے لوگ نہیں ملتے۔

افسانوں میں سب سے بیسٹ قانتہ رابعہ کا کہکشاں
جگمگ لگا۔ مریم طاہر کی" قربانی سے پہلے قربانی" پسند
آئی" کیا بنے گا شیا کا" کا پڑھ کر میں دیر تک سوچتی رہی
واقعی" کیا بنے گا شیا کا"۔

نگہت سیما کا" ماہ الملوک" پڑھا۔ آزین کے
جانے کا پڑھ کر اداس ہو گئے۔ مریم انصاری کا یہ رسمیں
پڑھ کر اتنا ہنسے کہ مت پوچھے واقعی ایسا ہوتا ہے۔ ہمارے
ہاں بھی دلہن کی گاڑی خواتین رشتہ دار اور بچوں سے اتنی
بھر جاتی ہے کہ دلہن بیچاری سانس بھی بمشکل لے پاتی
ہے۔ باقی سارے سلسلے بہترین تھے۔

ج: پیاری کائنات! آپ کے افسانے پڑھے۔
آپ میں ماشاءاللہ صلاحیت ہے، بہت اچھا لکھ سکتی ہیں۔
آپ فانٹ ناول مکمل کر کے بھجوائیں۔ فون کریں بات ہو
جائے گی بلکہ زیادہ بہتر ہے کہ اپنا فون نمبر لکھ دیں۔ ہم خود
آپ کو فون کر لیں گے۔

پیاری صفہ کو ہماری طرف سے وعلیکم السلام کہہ
دیں۔ خط اور ڈاک ہمیں 20 تاریخ تک موصول
ہو جانے چاہئیں۔

ماہ رخ بلند سواتی کراچی سے شریک محفل ہیں

شعاع ملا چاند رات کو چونکہ چاند رات کو جمعہ تھا تو
میں اور میری چاچی بازار گئے چوڑیاں لینے چوڑیاں لینے
کے بجائے رسالے والے کے اسٹال پر گئی اور جن پیسوں
سے چوڑیاں لینی تھیں میں نے ڈائجسٹ لے لیے۔

اب بات ہو جائے شعاع مئی 2025 کی ٹائٹل
بہت پیارا تھا ماڈل کی آنکھیں خوب صورت تھیں۔" پیارے
نبی ﷺ کی پیاری باتیں زبردست عید کے رنگ، محبتوں کے سنگ
۔ رضوانہ وقاص، صائمہ گل، زرینہ خانم لغاری کے جوابات
پسند آئے ویسے ایک بات بولوں عید میں تو آپ لوگوں نے
انجوائے کیا ہو گا میں تو گوشت ہی نہیں کھاتی (ہی ہی ہی)
دستک میں نازش جہانگیر کے جوابات پسند آئے ظفر معراج
سے ملاقات پسند آئی۔ نو سال کی عمر میں رسالے پڑھنا
اسٹارٹ کیا تھا پہلے مجھے سمجھ میں نہیں آتے تھے پھر آہستہ
آہستہ سمجھنے لگی اور اب خط بھی لکھتی ہوں (آج میری امی
ہوتیں تو میرا خط دیکھ کر کتنا خوش ہوتیں) مکمل ناول میں بس
تھوڑی سی بے وفائی اور چاندی کے گھر بہت پسند آئی
ویلڈن۔ افسانے سارے اچھے تھے۔

ج: پیاری ماہ رخ! آپ کا خط شامل اشاعت ہے۔
اتنے پرانے ناولوں پر آپ نے تبصرہ کیا۔ پڑھ کر خوشی کے
ساتھ ساتھ حیرانی بھی ہوئی کہ ہماری قارئین شعاع کی
تحریروں کو اتنی دلچسپی سے پڑھتی ہیں۔ ان کے کرداروں کو یاد
رکھتی ہیں۔ یہ ہمارے لیے بڑی بات ہے۔

رضوانہ وقاص کرلاں ہری پور سے لکھتی ہیں

آپ کی بات پڑھ کر بہت دل دکھی ہو گیا۔ کیا میرے
خط اچھے نہیں ہوتے میری لکھائی ٹھیک نہیں۔ کیا آپ میری
بیماری کی وجہ سے خط کو جگہ دیتی ہیں۔ بتانا ہے مجھے۔ اپنی
سائرہ رضا کی وفات کا پڑھا۔ اور ہی دل دکھی ہو گیا۔ ان کے
لیے دعا کی، اللہ پاک جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین
ان کی کہانیاں خواتین اور کرن میں آتی رہی ہیں۔
کرن اور خواتین میں اب پڑھنے لگی ہوں۔ اگر کسی بہن
کے پاس ہے تو مجھے بھجوا دیں ضرور بتانا ہے۔ شکریہ۔" حمد و
نعت پڑھی"۔" پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں" بہت ہی
پیاری اور بہت ہی اچھی۔ دستک پڑھا غنی کا لیکن کوئی
ڈرامہ دیکھا نہیں ان کا۔" میری آپی" حمیرا رضا کا پڑھا۔
پڑھ کر روتی رہی۔ بچیاں قبر کی تختی پر نام لکھنے دیتیں شوہر
کا۔" خط آپ کے" عینا عمر نے بات کی، بہت اچھا لگا
شکریہ جی۔ اسماء بنت محمد فیاض خان شکریہ دعا کرنے کے
لیے۔ سلمیٰ مسرت آپ کی بہن کا پڑھ کر دل کانپ گیا۔
اللہ پاک آپ کی بہن کو صبر دے (آمین)۔ بھائی کی
شادی کا احوال لکھ کر بھیجا تھا۔ وہ بھی نہیں لگا رہیں۔ بار بار

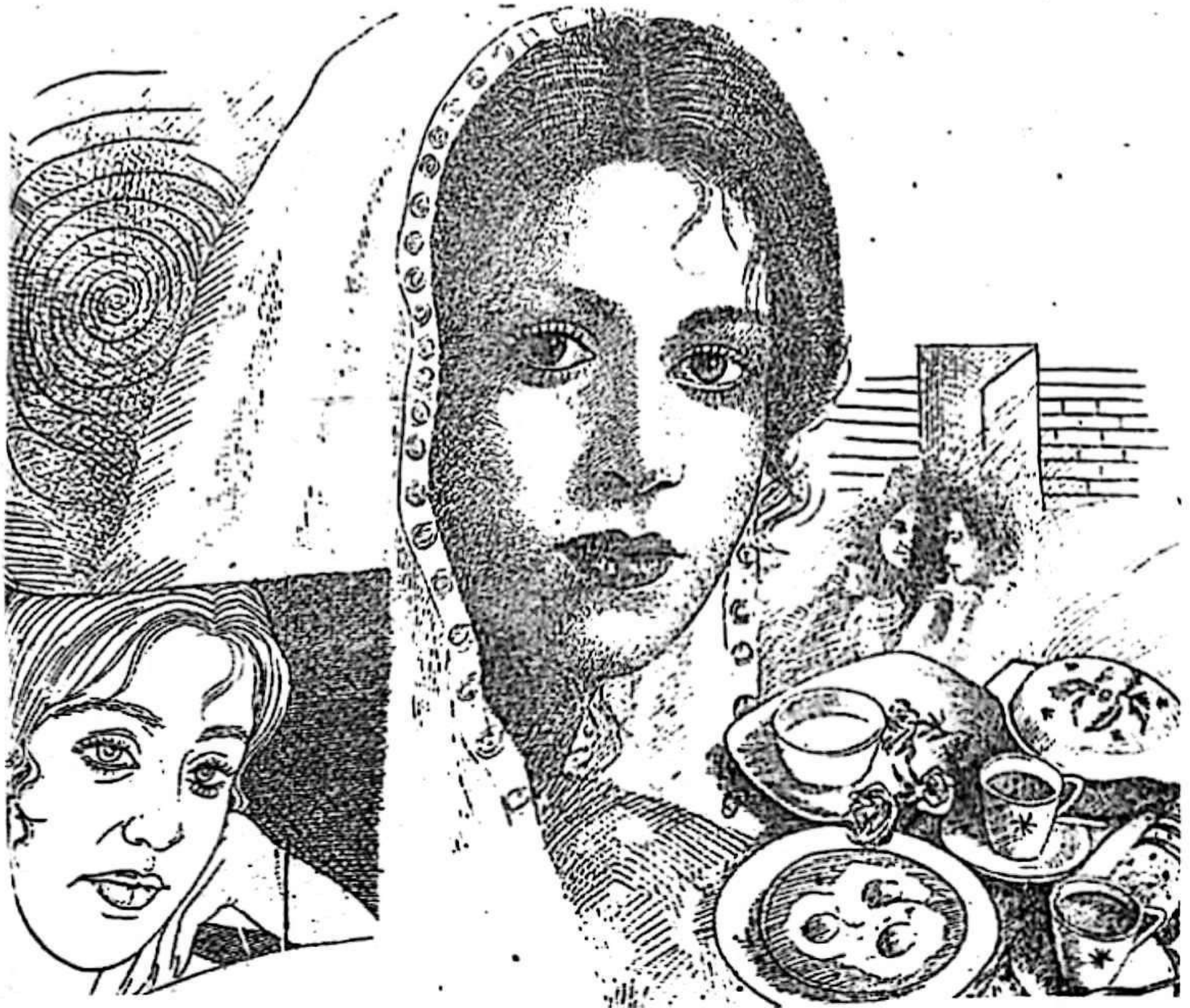
بقیہ صفحہ نمبر 200 پر

مریم عزیز

دھوپ دریچہ

لاہور کے ایک بڑے بزنس مین غلام عباس کی خوب صورت بیٹی یونی ورسٹی میں پڑھتی ہے جہاں ایک لڑکا ثاقب اس میں دلچسپی لیتا ہے۔ ہالہ اسے نظر انداز کرتی ہے۔ غلام عباس کا بڑا بیٹا حارث بزنس میں باپ کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ اس کی ناہید خالہ جو لاہور کے پسماندہ علاقے میں رہتی ہیں اپنی ماں کے کہنے پر ان کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہے، ان کی بڑی بیٹی کومل حارث کے خواب دیکھتی ہے جبکہ حارث کی منگنی بچپن ہی میں اپنے مرحوم چچا ایاز کی بیٹی زیمل سے ہو چکی ہے۔ زیمل کی ماں فرحانہ کی شادی اس کے لالچی بھائی وحید نے عبدالقدوس سے کر دی تھی زیمل اپنے ماموں کے پاس رہتی تھی۔ اس کے ماموں ممانی اس کی شادی پیسوں کے لالچ میں کسی غنڈے سے کرانا چاہتے تھے۔

بیرون ملک سے آئی شاہانہ اپنی بھتیجی زیمل کو غلام عباس کے گھر لے آتی ہیں۔



ضامن اور فرقان گہرے دوست ہیں ضامن کے باپ ہاشم اپنی بیوی شاہینہ سے رہتے ہیں جن کی کئی بہنیں کینیڈا میں رہتی ہیں۔ ضامن کی دوست علیزہ اب سے شادی کی خواہش مند ہے۔ ایک فنکشن میں وہ ڈرنک کرتی ہے ضامن اس سے ناراض ہوتا ہے اور وہ معافی مانگتی ہے۔

کوثر زیمل کے آنے پر خوف زدہ ہے، وہ ہر حال میں حارث کو پانا چاہتی ہے اس کے لیے وہ نیند کی گولیاں کھا لیتی ہے مجبوراً حارث اس کو شادی کے لیے اپنا پہلا آپشن بتاتا ہے۔

عالیہ حارث کو زیمل کے خلاف [illegible] کاتی ہے۔

علیزہ کا کزن سمیر پاکستان سے امریکہ [illegible] سے علیزہ پسند آجاتی ہے۔ جو اس کی ماں کی بھی پسند ہے۔

یونی ورسٹی کے چیریٹی فنکشن میں فائن آرٹس کا [illegible] ثاقب کا ہاتھ دیکھ کر سچ بتاتا ہے۔ جسے ثاقب جھوٹ قرار دیتا ہے جبکہ ہالہ کو کسی سازش کا شکار بتاتا ہے۔

ضامن کی پھوپھو اور ان کا بیٹا اسد امریکہ جاتے ہیں۔ پھوپھو کو [illegible] اپنے بھائی سے چھپاتی ہیں لیکن ضامن اسد سے اگلوا لیتا ہے۔ زیمل کے ماموں وحید کے گھر اس کا نام نہاد [illegible] غنڈوں کے ہمراہ زیمل کی تلاش میں آتا ہے۔

نویں قسط

ڈائننگ ٹیبل پر رکھے کریلے گوشت، ماش کی دال اور مٹر پلاؤ دیکھ کر ان کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ پلیٹ آگے سرکا کر انہوں نے ماش کی دال اپنی پلیٹ میں ڈالی۔ تھوڑا اسلاد اور چٹنی ڈال کر انہوں نے چپاتی کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن پھر ہاتھ روک کر سامنے دیکھا اور ارد گرد دیکھ کر ساتھ بیٹھی عشنا کو دیکھا۔

”فائزہ کدھر ہے۔“

”وہ اپنے کمرے میں ہے۔“

”کیوں؟“ وہ حیران ہوئے تو عشنا نے ہاتھ روک کر رضا کو دیکھا۔

”اب یہ مجھے کیسے پتا ہوگا کہ وہ کیوں اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھی ہے۔“ عشنا کے انداز پر انہوں نے ہونٹ بھینچ کر نرگس کو آواز دی۔

”آپا! فائزہ کو بلایا نہیں آپ نے...... کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔“

”رضا آپ بھی کمال کرتے ہیں، وہ بچی تھوڑی ہے کہ اسے ہر گھنٹے بعد آواز دی جائے، میچیور لڑکی ہے اور اسے بھی پتا ہے، کھانے کا وقت ہے، بھوک ہوتی تو آجاتی۔“ رضا نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر دوبارہ سوالیہ نظروں سے نرگس کی طرف دیکھا۔

”میں گئی تھی بے بی کو بلانے، پر اس نے کہا، اسے بھوک نہیں۔“

”لیں ہو گئی تسلی۔“ عشنا نے سر جھٹک کر کہا۔

”اب آپ کھانا شروع کریں گے کہ میں اٹھ کر چلی جاؤں۔“ عشنا کے لہجے میں غصہ محسوس کر کے وہ خاموشی سے پلیٹ پر جھک گئے لیکن ان کی بھوک جیسے مر سی گئی تھی عشنا کا ساتھ دینے کے لیے انہوں نے چند لقمے ہی زہر مار کیے، عشنا کے اٹھتے ہی وہ تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھے وہ ہاتھ دھو کر دوبارہ اندر آئی تو رضا صاحب غائب تھے جبکہ نرگس برتن اٹھا رہی تھی ”رضا کہاں ہیں؟“

”پتا نہیں، میں تو کچن میں تھی۔“ نرگس مصروف انداز میں جواب دے کر برتن اٹھانے لگی تو عشنا نے دانت

پیس کر کے سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔
''ایک تو ان باپ بیٹی کے چونچلے ہی ختم نہیں ہوتے۔'' وہ بڑبڑاتی، پیر پٹختی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔
دروازے کو دو انگلیوں سے ہلکا سا بجا کر انہوں نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے فائزہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ وہ بغور اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ گئے۔
''میری گڑیا کی طبیعت ٹھیک ہے؟''
''میں ٹھیک ہوں پاپا۔'' اس کی بھاری آواز پر انہوں نے بغور اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھا۔
''تو کھانا کیوں نہیں کھایا۔''
''بھوک نہیں تھی۔''
''کیوں؟'' ان کی کیوں پر فائزہ نے اپنی نظروں کا رخ ان کی طرف کیا۔
''میں نے بھوک سے پوچھا نہیں کہ وہ مجھے کیوں نہیں لگی۔'' اس کے نروٹھے لہجے پر وہ ہنس پڑے۔
''مجھے پتا ہے، میری بیٹی کو بھوک لگتی ہے اگر وہ کھانا نہیں کھا رہی تو مطلب اسے کوئی بات بری لگی ہے۔ تو اب میری گڑیا مجھے بتائے کہ کیا بات میری پرنسس کو بری لگی ہے۔''
''کچھ نہیں پاپا۔'' وہ آنکھوں میں آئے آنسو پیتے ہوئے بمشکل بولی تو رضا صاحب پریشان ہوئے اور دایاں ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔
''تم جانتی ہو نا فائزہ! جب تک تم مجھے بتا نہیں دیتیں کہ تمہیں کیا پریشانی ہے مجھے سکون نہیں آئے گا۔'' ان کے کہتے ہی آنکھوں میں رکے آنسو نکل کر گالوں پر بہنے لگے۔
''فائزہ۔'' رضا صاحب مزید پریشان ہوئے۔ ''بولو بچے ہوا کیا ہے میں پریشان ہو رہا ہوں۔''
''پاپا! امی کا ہماری زندگی سے چلے جانا ایک بہت بڑا سانحہ تھا اتنا بڑا کہ لگتا تھا کہ زندگی ختم ہوگئی لیکن اگر میں زندہ ہوں اور جی رہی ہوں تو اس کی وجہ آپ ہیں، آپ نے مجھے کبھی امی کے بعد اکیلے ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا لیکن جب آپ امی کو بھول کر اپنی زندگی میں آگے بڑھ گئے تو مجھے بہت دکھ ہوا۔''
وہ روتے ہوئے بول رہی تھی۔ اس کی بات پر رضا صاحب نے بولنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس کے چہرے کا دکھ دیکھ کر ہونٹ بھینچ گئے۔
''لیکن آپ کو خوش دیکھ کر میں نے اپنے دکھ کا اظہار نہیں کیا، سوچا چلو کوئی تو خوش ہے میں نے کبھی آپ کی پرسنل لائف میں انٹرفیئر نہیں کیا اور نہ کبھی آپ کی بیوی کی لائف میں...... اور نہ مجھے پسند ہے کہ وہ میری لائف میں انٹرفیئر کریں۔'' اس کی بات پر رضا صاحب نے گہرا سانس لیا۔
''کیا کیا ہے اس نے؟''
''آپ کی وائف ہیں وہ، آپ ان کو ایز اے وائف انٹرڈیوس کروائیں مجھے پرابلم نہیں لیکن وہ میری ماں نہیں اور نہ میں انہیں کسی بھی حیثیت سے اپنی فرینڈ اور کلاس فیلوز سے متعارف کروانا چاہتی ہوں۔ میری ایک ہی بیسٹ فرینڈ ہے اور ان کی وجہ سے میں اسے کھونا نہیں چاہتی۔''
''تمہاری بیسٹ فرینڈ کا عشنا سے کیا تعلق؟'' رضا صاحب نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔
''ہالہ کو یہی پتا ہے کہ میری مدر کی ڈیتھ ہو چکی ہے اور آج مال میں میرے اگنور کرنے کے باوجود جان بوجھ کر ہالہ سے ملیں بلکہ فضول باتیں بھی کیں۔''
''کیسی فضول باتیں؟'' وہ اب سنجیدگی سے فائزہ کو دیکھ رہے تھے۔
''میں نے سب یاد نہیں رکھا، لیکن ان کا فضول انداز اور اپنی دوست کی حیرت زدہ شکل مجھے نہیں بھول

رہی۔" ہالہ اور اس کے بھائی کے ایکسپریشن یاد آتے ہی وہ دوبارہ روہانسی ہوئی۔
"کیا تمہاری دوست نے کچھ کہا ہے۔"
"میری اس سے کوئی بات نہیں ہوئی لیکن میں جانتی ہوں کہ کل پرسوں جب بھی اس سے ملوں گی وہ ضرور پوچھے گی۔" رضا صاحب نے گہرا سانس لیا۔
"فائزہ! مجھے پتا ہے، ماں کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا اور یہ بھی جانتا ہوں تم نے عشنا کو ماں کے طور پر قبول نہیں کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عشنا اب اس گھر کا، اس فیملی کا حصہ ہے۔ جس طرح تم میری بیٹی ہو اسی طرح وہ میری بیوی ہے۔" ان کے سنجیدہ انداز میں چھپی ناراضی فائزہ کو بری طرح چبھی تھی۔
"میں نے کب کہا کہ وہ آپ کی بیوی نہیں، میں صرف یہ کہہ رہی ہوں وہ میری ماں نہیں اور میری پرسنل سپیس میں نہ گھسیں ورنہ میں اگلی بار لحاظ نہیں کروں گی۔" اب کے وہ غصے سے بولی۔
"فائزہ بی ہیو یور سیلف۔" وہ ناگواری سے بولے۔
"اگر عشنا نے تمہاری دوست کے سامنے خود کو تمہاری ماں کہہ دیا تو کون سا طوفان آ گیا، یہ تو اس کی بڑائی ہے کہ وہ تمہاری طرح شرمندگی محسوس نہیں کرتی وہ اتنی ینگ ہے، کیا کسی اینگل سے لگتا ہے وہ تمہاری ماں ہے، اسے شرمندگی نہیں تو تمہیں کیا مسئلہ ہے۔" ان کا لہجہ غصیلا تھا۔
"میں نے کتنی دفعہ نوٹ کیا ہے، تم اس سے سیدھے منہ بات نہیں کرتیں جبکہ وہ مجھ سے ہمیشہ تمہاری اچھی بات ہی کرتی ہے۔"
"تو کون سا احسان کرتی ہیں۔ ہمیشہ بس بی ہیو وہ میرے ساتھ کرتی ہیں، میں نہیں۔" وہ ایک بار پھر غصے سے چیخی۔
"اُف فائزہ۔" رضا صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روکا۔
"میں آفس سے تھکا ہوا آیا ہوں، کاروباری سو مسئلے ہوتے ہیں جن کو لے کر میں اکیلا جھیلتا رہتا ہوں۔ گھر سکون کے لیے آتا ہوں، ایسے میں اگر تم دونوں اپنی لڑائیاں لے کر بیٹھ جاؤ گی تو مجھے لگتا ہے میرا سر پھٹ جائے گا۔" اشتعال ضبط کرنے کے مارے ان کا چہرہ لال ہو رہا تھا جبکہ ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔ ان کی حالت دیکھ کر فائزہ اپنا غصہ بھول کر پریشانی سے ان کی طرف بڑھی۔
"پاپا! آپ ٹھیک ہیں۔" اس نے پریشانی سے ان کی پشت کو سہلایا جو لمبے لمبے سانس لے رہے تھے۔
"میں ڈاکٹر کو کال کرتی ہوں۔"
"نہیں۔" گہرے گہرے سانس لیتے اب وہ سنبھل چکے تھے جبکہ فائزہ ان کے قریب بیٹھی پریشانی سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی جبکہ رضا صاحب اس کو دیکھ ہی نہیں رہے تھے۔
"پاپا۔" فائزہ نے اپنا ہاتھ ان کے گال پر رکھ کر ان کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔
"آئی ایم سوری پاپا۔" رضا صاحب نے نظریں اس کے چہرے پر ٹکائیں جو آنسوؤں بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔
"میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا فائزہ! لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ عشنا اور تمہارے درمیان تناؤ ہو مجھے گھر میں سکون چاہیے۔"
"جی پاپا! میں سمجھ گئی۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" وہ ان کی حالت دیکھ کر بہت ڈر گئی تھی۔ اس لیے غلطی نہ ہوتے ہوئے بھی اس نے معافی مانگ لی تھی۔
"چلو شاباش کھانا کھاتے ہیں۔" ان کے کہنے پر وہ بمشکل مسکراتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ وہ کافی دیر سے شاپنگ میں لی چیزوں کو بیڈ پر پھیلاتے رضا کا انتظار کرتی رہی لیکن جب انتظار طویل ہونے لگا تو وہ غصے سے

باہر نکلی اور رضا کو فائزہ کے ساتھ ڈائننگ روم کی طرف بڑھتا دیکھ کر اس نے بے ساختہ دانت پیسے۔
"ایک تو اس آدمی کو چین نہیں، بیٹی کے بغیر نوالہ حلق سے نہیں اتر تا، اس کا بس نہیں چلتا تھا فائزہ کو کوئی منتر پڑھ کر غائب کردے' اندر سے باپ بیٹی کے ہنسنے اور باتوں کی آواز پر وہ کتنی دیر تک وہاں کھڑی کڑھتی رہی پھر پیر پٹختی اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔

☆☆☆

پچھلے آٹھ سالوں سے زندگی جس طرح اس کے لیے پریشان کن اور گھٹن زدہ رہی تھی اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ زندگی کبھی اپنے خوشنما رنگوں کے ساتھ اس پر مہربان ہوگی، یہ رشتے جواب اس کی زندگی میں شامل ہوئے تھے یہ تو کب سے اس کی زندگی کا حصہ تھے پر چھوٹی سی عمر میں وہ رشتوں کے اتنے بھیانک روپ دیکھ چکی تھی کہ اسے خون کے رشتوں پر نہ اعتبار تھا اور نہ انتظار پر شاید اللہ کو اس کی خوشیاں منظور تھیں اسی لیے اس کے بابا اور پھوپھو اسے لینے آگئے، یہاں آکر اسے پتا چلا کہ ہر رشتہ اور اس سے جڑے احساسات کتنے خوب صورت ہوتے ہیں۔ ہر رشتہ مفاد پرست اور مطلبی نہیں ہوتا۔ کچھ رشتے بے لوث اور چاہنے والے بھی ہوتے ہیں جیسے اس کی فیملی یہاں اسے پیار، عزت، تحفظ سب کچھ جو پرسکون زندگی کے لیے ضروری تھا اور اب یہ سب رشتے اس کے پاس ہمیشہ رہنے والے تھے اس شخص کی وجہ سے جس کا نام بچپن سے اس نے اپنے نام کے ساتھ سنا تھا پہلے، وہ صرف ایک نام تھا اس نام کے ساتھ پہلے کبھی کوئی احساس اور لطیف جذبہ وہ جوڑ نہیں پائی کیونکہ زندگی کبھی اس کے لیے پھولوں کی سیج نہیں رہی۔ اس نے نہ کبھی اسے دیکھا تھا اور نہ کبھی سنا تھا اور ماموں ممانی نے ہمیشہ یہی اسے کہا تھا، وہ کبھی نہیں آئے گا تو امید رکھنا ہی فضول تھا۔
پر معجزہ ہو گیا وہ وہاں آ گئی جو اس کا اصل تھا، باقی گھر والوں کی نسبت وہ بہت مختلف تھا۔ سنجیدہ ۔۔ اور مغرور یا شاید یہ سارے رویے صرف اس کے لیے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ خوش فہم ہوگئی تھی، وہ اسے بلاتا نہیں تھا دیکھتا نہیں تھا حتیٰ اسے ان دیکھا کر کے اسے اس کی جگہ بھی دکھا دیتا تھا پر اس کا ننھا سا دل پہلی بار کسی کو دیکھ کر عجیب انداز میں دھڑ کا تھا وہ اسے اپنی دعاؤں کا حاصل لگتا تھا اس شان دار شخص کو دیکھ کر لگتا تھا اس کے ہوتے کوئی اسے ٹیڑھی نظر سے نہیں دیکھ سکے گا۔ اب تو وہ اس کے خوابوں میں بھی آنے لگا تھا۔ اس سے پہلے وہ خواب کو سوچتی دروازے پر ہونے والی دستک پر اس نے ہڑ بڑا کر آنکھیں کھولیں۔ دروازے میں کھڑی ہالہ کو دیکھ کر وہ مسکرائی جو اسے گھور رہی تھی۔
"تم کمرے میں کپڑے رکھنے آئی تھیں یا چلہ کاٹنے پچھلے آدھے گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"
"میں بس آرہی تھی۔" زیمل نے تیزی سے بیڈ پر پھیلائے اپنے کپڑے سمیٹنے شروع کیے۔
"اب جلدی آجانا، اسٹڈی میں بابا تمہیں بلا رہے ہیں۔" اور تیزی سے چلتے اس کے ہاتھ رکے، اس نے گھبرائی نظروں سے ہالہ کو دیکھا۔
"کوئی بات ہوئی ہے۔" اس کے گھبرائے لہجے پر ہالہ نے چونک کر اسے دیکھا جہاں ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔
"تم تو ایسے ڈر رہی ہو جیسے بابا نے تمہیں کوئی سزا سنائی ہے۔" اس کا چہرہ دیکھ کر ہالہ کو مزہ آ رہا تھا۔
"ارے پاگل، ویسے ہی بلایا ہے۔ اتنا پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ اب جلدی سے آجاؤ۔" کہہ کر وہ مڑ گئی تو زیمل بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تیزی سے باہر نکلی۔ دروازہ پہ دستک دے کر اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا سامنے بڑے سے ٹیبل کے اس پار غلام عباس کے ساتھ حارث کو بیٹھا دیکھ کر وہ بری طرح گھبرائی 'دروازہ کھلنے پر غلام عباس اور حارث نے ایک ساتھ سامنے دیکھا ایک سرسری نظر کے بعد حارث دوبارہ اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا جبکہ عباس صاحب اسے دیکھ کر مسکرائے۔
"آپ نے بلایا بابا۔" وہ پریشانی سے ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ہاں میں نے بلایا تھا بیٹھو۔" وہ کہہ دوبارہ کمپیوٹر اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئے تو وہ پرسوچ انداز میں چلتی اندر آئی اور دیوار کے ساتھ رکھے صوفے پر حماد کو بیٹھا دیکھ کر حیران ہوئی۔

حماد نے آنکھیں گھمانے کے بعد ہاتھ سے صوفے کی طرف اشارہ کیا جس کا مطلب تھا بیٹھ جاؤ۔ وہ بالکل صوفے کے کونے پر ٹک کر بیٹھ گئی اور غور سے عباس صاحب کا چہرہ دیکھا وہ ہمیشہ کی طرح سنجیدہ انداز میں حارث سے بات کر رہے تھے اسے ڈھونڈنے سے بھی ان کے چہرے پر غصہ نظر نہیں آیا، اور بالکل غیر ارادی نظر حارث کی طرف اٹھی اور پھر جیسے اس کے چہرے پر ٹھہر گئی، کل دیکھا خواب پھر اس کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگا تو زیمل کی مسکراہٹ گہری ہوئی، خود پر مسلسل نظروں کا احساس ہونے پر اس نے سامنے دیکھا اور خود پر جمی زیمل کی نظروں پر اس کی پیشانی پر لکیریں سی بنیں، اس کے دیکھنے پر بھی جب اس کی نظریں نہیں ہٹیں تو اس نے بے ساختہ انداز میں ابرو اچکائے اور زیمل جیسے ایک دم ہوش میں آئی اور گھبرا کر نظریں جھکالیں۔

اب وہ پریشانی سے گود میں رکھے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے جکڑے ہوئے بھی حارث کی آواز پر اس نے سامنے دیکھا جو عباس صاحب سے بات کر رہا تھا۔ زیمل نے بے اختیار گہرا سانس لے کر بائیں طرف دیکھا اور سانس ایک بار پھر سینے میں اٹکی کیونکہ شاید اس کی نظروں کی بے اختیاری حارث کے علاوہ حماد کی نظروں میں بھی آچکی تھی جبھی وہ مسکراتی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا، اس نے آنکھوں کو جنبش دے کر جیسے اس کی ہمت کو داد دی، تو زیمل نے شرمندگی سے نظروں کا زاویہ بدل لیا۔ تو حماد تھوڑا کھسک کر اس کے قریب ہوا، اس سے پہلے وہ اس سے کوئی بات کرتا، عباس صاحب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"ہاں بھئی برخوردار! تو کیا مصروفیت ہے آج کل تمہاری اور کتنے دن تک تمہارا تفریحی پروگرام جاری رہے گا؟" حماد شاید اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا بوکھلا کر انہیں دیکھنے لگا۔

"میں سمجھا نہیں بابا۔" اس کی بوکھلاہٹ دیکھ کر حارث کے چہرے پر آنے والی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔

"اتنی مشکل بات تو میں نے کی نہیں جو تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ ایم بی اے کیے تمہیں سال ہونے والا ہے انجوائے کرنے کے لیے ایک سال کافی نہیں کیا؟" عباس صاحب کی بات ختم ہوتے پر حماد نے مدد طلب نظروں سے حارث کی طرف دیکھا جس نے کندھے اچکا کر لال جھنڈی دکھا دی تھی۔ اس نے برا سا منہ بنا کر دوبارہ عباس صاحب کو دیکھا۔

"ایک سال ہو بھی گیا۔" وہ مصنوعی حیرت سے بولا تو اس کی ایکٹنگ پر زیمل بھی سر جھکا کر مسکرا دی۔

"بیٹا جی! مزید ڈرامے بازی اب نہ چلے گی بس یہ بتاؤ، آفس کب جوائن کر رہے ہو۔" عباس صاحب کے سنجیدہ انداز پر حماد نے سر کھجایا۔

"بابا اگر تھوڑا اور ٹائم مل جاتا، ابھی تو میرا پڑھائی کا اسٹریس بھی ختم نہیں ہوا اور پھر بھائی سارا کچھ سنبھال تو رہے ہیں۔"

"تو۔" عباس صاحب نے ماتھے پر بل ڈال کر اسے دیکھا۔ "تمہیں اندازہ ہے ہمارا بزنس کتنا پھیلا ہوا ہے حارث نے ضرورت سے زیادہ ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر لی ہوئی ہیں اگر اسے باپ کا احساس ہے تو تمہارا فرض بنتا ہے، باپ بھائی کا احساس کرنا۔" ان کا سخت اور سنجیدہ انداز دیکھ کر زیمل نے گھبرا کر عباس صاحب کو دیکھا جبکہ حارث بے ساختہ بولا۔

"بابا! اگر یہ ابھی یہ ذمہ داری نہیں اٹھانا چاہتا تو کوئی بات نہیں۔ آگے تو اسے ہی کرنا ہے۔" غلام عباس نے کچھ حیرانی سے حارث کی طرف دیکھا۔

"یہ بچہ نہیں بڑا ہو گیا ہے، تم اس کی ایج میں دو فیکٹریوں کو دیکھ رہے تھے میں یہ نہیں کہتا کہ یہ سب کچھ ابھی سنبھال لے لیکن آفس آئے گا دیکھے گا تو ہی کچھ ایکسپرینس ہوگا اگر ایکسپرینس نہیں ہوگا تو چلتا ہوا کاروبار بھی یہ سنبھال نہیں سکے گا۔" اب کی بار حارث کچھ نہیں بولا تھا جبکہ زیمل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس ڈسکشن میں وہ

کیوں تھی۔ ڈر کے مارے وہ پوچھ بھی نہیں رہی تھی کہ اسے یہاں کیوں بلایا ہے۔

''بابا۔'' حماد نے منہ بسورا ''میں آفس نہ آؤں تو آپ ناراض ہوتے ہیں اور اگر آفس آ کر کام کروں تو بھی ڈانٹ پڑتی ہے، آپ بتائیں کیا کروں۔''

''یہ جو تم آفس آ کر کرتے ہو، وہ کام کرنا ہوتا ہے وہ کام بگاڑنا ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے سوچا ہے کہ اپنا بزنس جوائن کرنے سے پہلے تمہیں ایز اے ایمپلائی کسی اور کمپنی میں کام کرنا چاہیے۔'' غلام عباس کی تجویز پر وہ اچھل ہی پڑا۔

''بابا! یہ ظلم تو نہ کریں، مالک ہو کر میں کسی اور کی کمپنی میں تنخواہ دار ملازم ہوں گا۔'' اس نے اب ناراضی سے حارث کی طرف دیکھا جو اس کی طرف داری میں کچھ نہیں بول رہا تھا۔

''بابا! یہ کچھ زیادہ ہو جائے گا۔'' اس کی نظریں محسوس کر کے حارث بول پڑا تھا۔ غلام عباس نے مسکرا کر حماد کی طرف دیکھا جس کا منہ پھولا ہوا تھا۔

''ابھی یہ صرف میرا خیال ہے، فیصلہ نہیں کیا ابھی۔'' کہہ کر انہوں نے زیمل کی طرف دیکھا۔ ''پڑھائی کیسی جا رہی ہے تمہاری؟''

''ٹھیک جا رہی ہے بابا۔''

''یہاں دل لگ گیا ہے۔'' ان کے سوال پر نظر پھر بھٹکی تھی تب ہی سامنے والے نے بھی نظریں اٹھائیں، نظروں کے تصادم پر اس نے ایک سیکنڈ میں نظروں کا زاویہ بدلا۔

''جی بابا!''

''چلو یہ تو اچھی بات ہے۔ یہ تمہارے لیے۔'' انہوں نے ایک لفافہ جو ٹیبل پر رکھا تھا انگلیوں سے آگے کی طرف کھسکایا تو اس نے اس لفافے کی طرف دیکھا۔

''جاؤ۔'' اسے یونہی بیٹھا دیکھ کر حماد دھیمی آواز میں بولا تو وہ جلدی سے اٹھی اور جھجکتے ہوئے وہ لفافہ اٹھایا اور اس میں رکھے نوٹوں کو دیکھ کر وہ حیران ہوئی اور پھر پریشانی سے غلام عباس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''تمہاری پاکٹ منی ہے۔'' ان کے کہنے پر اس نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے وہ لفافہ واپس ٹیبل پر رکھ دیا۔

''بابا! مجھے اس کی ضرورت نہیں۔'' وہ اتنی پریشان ہوئی جیسے اس کے ہاتھ میں پیسوں کی جگہ بم تھما دیا ہو۔ حارث نے چونک کر اسے دیکھا، عباس صاحب بھی حیران ہوئے۔

''ضرورت کیوں نہیں۔''

''بابا! میرے پاس سب کچھ ہے، میں ان پیسوں کا کیا کروں گی۔''

''وہی کرو گی جو سب کرتے ہیں۔ ہالہ ہر ماہ مجھ سے پاکٹ منی لیتی ہے آج بھی اگر وہ مجھے یاد نہ کرواتی تو میرا دھیان ہی نہ جاتا اور اگر مجھے خیال نہیں آیا تو تم نے بھی مجھ سے نہیں کہا، بہر حال یہ رکھ لو۔'' انہوں نے دوبارہ لفافہ اس کی طرف کھسکایا۔ وہ تذبذب کی کیفیت میں مبتلا اس لفافے کو دیکھنے لگی تبھی حماد اٹھ کر اس کے قریب آیا۔

''رکھ لو یار! بابا اتنے پیار سے دے رہے ہیں سو ضرورتیں ہوتی ہے اگر تمہیں استعمال نہیں کرنا تو کوئی نہیں جمع کر لینا۔ کسی کو ادھار لینے کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔'' وہ اسے سمجھانے والے انداز میں بولا تو اس کا مطلب سمجھ کر حارث کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی جبکہ عباس صاحب نے افسوس سے سر ہلایا۔

''پیسے استعمال کرنے کے لیے ہیں۔'' عباس صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا اور شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے باہر نکل گئے۔

''سنو تمہاری کون سی اتنی ضرورت ہوتی ہے، کون سا تم نے فرینڈز کی ساتھ پارٹی کرنا ہوتی ہے۔ بابا ہر ماہ تمہیں پاکٹ منی دیں گے تم جمع کرتی رہنا اور جب میں مانگوں تو مجھے دے دینا۔ ٹھیک ہے۔''

''دماغ ٹھیک ہے تمہارا حماد۔'' اس سے پہلے وہ کچھ کہتی حارث غصیلی آواز پر زیمل نے گھبرا کر اسے دیکھا جو خشمگیں نظروں سے حماد کو گھور رہا تھا۔
''مذاق کر رہا تھا بھائی۔'' حارث کو غصہ میں دیکھ کر وہ جلدی سے بولا۔ زیمل جو پہلے ہی وہاں سے نکلنے کے لیے پر تول رہی تھی، ایک سیکنڈ کے بغیر تیزی سے باہر نکلی، باہر نکلتے ہی اس نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔

☆☆☆

وہ اپنے دھیان میں چلتی گلی کے اندر داخل ہوئی جب اسے محسوس ہوا کسی نے اس کا نام لیا ہے، اس نے حیران ہو کر پیچھے دیکھا، رینا اپنی لمبی ہیل پر چلتی تیزی سے اس کی طرف آ رہی تھی۔
''کب سے آوازیں دے رہی ہوں، سنائی نہیں دیتا کیا۔'' وہ اس کے قریب آتے ہانپتے ہوئے بولی۔
''مجھے ابھی تمہاری آواز سنائی دی ہے۔'' کومل اسے ایک نظر دیکھ کر دوبارہ چلنے لگی۔
''تین دفعہ تمہاری طرف آئی ہوں لیکن تم ملتی ہی نہیں کہاں بزی ہوتی ہو۔''
''کہاں بزی ہونا ہے، نئی جاب ہے تو تھوڑا ٹائم کا دھیان رکھنا پڑتا ہے، تم بتاؤ، خیریت تھی جو اتنے چکر میرے گھر کے لگا رہی تھیں۔''
''تمہیں تمہارا وعدہ یاد دلانا تھا۔''
''وعدہ۔'' کومل نے رک کر اسے دیکھا۔
''میرا خیال ہے، تم نے اپنے کزن سے ملوانے کا بلکہ اس کے آفس لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔'' کومل نے سن کر سر جھٹکا۔
''مجھے یاد ہے لیکن ٹائم نہیں مل رہا۔'' رینا نے ماتھے پر بل ڈال کر اسے دیکھا۔
''ٹائم نہیں ملا یا بہانے بنا کر مجھ سے جان چھڑا رہی ہو، مجھے تو پہلے ہی شک تھا، تم شو آف کر رہی ہو۔'' کومل نے اب غصے سے اسے دیکھا۔
''تمہیں کیا دلچسپی ہے میرے کزن میں۔''
''تم جانتی تو ہو۔'' اب کے رضیہ نے مسکرا کر اسے دیکھا تو سمجھ کر کومل بھی مسکرائی لیکن طنزیہ۔
''افسوس تمہاری ان اداؤں کا جادو اس پر نہیں چلے گا۔''
''اچھا۔'' رینا نے اچھا کو لمبا کھینچا۔
''یہ تو ملنے پر پتا چلے گا۔''
''ضرور میں بھی دیکھنا چاہوں گی۔ تم کیا کرتی ہو اور وہ کیا کرتے ہیں۔'' وہ کہہ کر پھر چلنے لگی۔ وہ دروازے کے قریب پہنچی جب اسے دوبارہ رینا کی آواز سنائی دی۔
''امی بتا رہی تھیں۔ تمہارے ابو آئے ہوئے ہیں۔'' کومل نے کوفت سے آنکھیں گھمائیں اس محلے میں کچھ بھی سیکرٹ نہیں رہتا تھا۔
''کیا آنٹی سے ان کی صلح ہو گئی۔'' وہ متجسس لگ رہی تھی۔
''ناراضی کب تھی۔'' کومل ناراضی سے بولی۔
''اچھا۔'' وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔
''پھر سالوں سے کہاں غائب تھے؟''
''وہ غائب نہیں تھے۔'' کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی اور بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔
''میں جلدی چکر لگاؤں گی۔'' اس کا پھولا منہ دیکھ کر مسکرا کر کہتی آگے بڑھ گئی۔ دروازہ کھلتے ہی کومل غصے سے بڑبڑاتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ لاؤنج کے صوفے پر ناہید کو ماتھے پر دوپٹہ باندھے دیکھ کر اس کا موڈ مزید

خراب ہو گیا وہ شولڈر بیگ صوفے پر پھینک کر خود بھی گرنے کے انداز میں صوفے پر لیٹ گئی اور اکتائے ہوئے انداز میں ناہید کو دیکھا جو سر پر ہاتھ رکھے مسلسل ہائے ہائے کر رہی تھیں۔
"آپ کو کیا ہوا ہے۔" مزید تین منٹ تک جب ان کی ہائے ہائے جاری رہی تو اس نے اکتا کر پوچھا۔ ناہید نے غصے سے اسے دیکھا۔
"یہ سوال تم اپنے باپ سے پوچھو، ہفتہ ہونے کو آیا ہے ابھی تک یہیں ڈیرا جمائے بیٹھا ہے۔ ماں نے گھر سے نکال دیا ہے یا دوسری بیوی کو طلاق دے آیا ہے۔" ان کے زہر خند انداز پر کومل نے کوفت سے انہیں دیکھا۔
"آپ کو اعتراض کس بات پر ہے، یہ جو دو باتیں آپ نے کہی ہیں اگر ایسا ہوا ہے تو اچھی بات ہے اس صورت میں وہ ہمارے ساتھ رہیں گے۔" وہ ایک دم سر کا درد بھلا کر تڑپ کر سیدھی ہو۔
"میں کبھی اسے اپنے ساتھ نہ رکھوں، جتنے سال اس کے ساتھ رہی، اس نے اور اس کی ماں نے پابندیاں لگا کر میری زندگی حرام کر دی تھی۔ یہ مت کرو یہ مت پہنو، یہاں مت جاؤ، وہاں مت جاؤ، اس سے نہ ملو، تم لوگوں کو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ تینوں کو میں اس قید خانے سے نکال کر لے آئی، آج جو تم لوگ اپنی مرضی سے زندگی گزار رہے ہو۔ وہ میری وجہ سے ہے۔"
"بس کر دیں امی۔" کومل نے بے اختیار ہاتھ اٹھا کر انہیں ٹوکا۔ "بچپن سے یہ باتیں سنتی آ رہی ہوں اتنی بھی چھوٹی نہیں تھی، جب وہاں سے آئی تھی مجھے تو اس جہنم کا کوئی نظارہ یاد نہیں آتا جس کا نقشہ آپ کھینچتی رہتی ہیں۔" ناہید نے ہونٹ بھینچ کر اور نتھنے پھلا کر اسے گھورا جیسے خود پر ضبط کر رہی ہوں۔
"اگر اتنا ہی پیار آ رہا ہے اپنے باپ پر تو دفع ہو جاؤ اس کے ساتھ اور جا کر اس کی ماں کی اور بیوی کی غلامی کرو۔" انہوں نے پاس رکھا کشن غصے سے اس کی طرف پھینکا جو اس کے قریب آ کر لگا۔
"امی۔" وہ غصے سے بولی۔
"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" وہ بھی غصے سے کہہ کر اپنا سر دبانے لگیں۔ وہ ناگواری سے سر جھٹکتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی جہاں سلیم صاحب کے ساتھ عالیہ اور طاہر بھی موجود تھے۔
"آؤ آپی! تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا! آج دیر کر دی آنے میں۔" اسے دیکھتے ہی عالیہ تیزی سے بولی تو وہ بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔
"وقت پر آئی تھی راستے میں ریٹا مل گئی، بیس منٹ اس نے دماغ کھایا اور اندر آ کے امی کے مسئلے سنتے سنتے یہ وقت آ گیا ہے۔"
"امی کو کیا مسئلہ ہے۔" عالیہ کے پوچھنے پر اس نے جواب دینے کے بجائے صرف آنکھیں گھما کر سلیم صاحب کو دیکھا خود پر اس کی نظریں محسوس کر کے وہ مسکرا دیے۔
"تمہاری ماں کا شروع سے ایک ہی مسئلہ ہے اور وہ میں ہوں۔" سلیم صاحب کے کہنے پر عالیہ نے برا سا منہ بنایا جبکہ طاہر ہنس پڑا تھا لیکن کومل سنجیدگی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔
"مجھے امی کی پریشانی بے وجہ تو نہیں لگ رہی، ہم نے تو آپ کا انتظار کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ مجھے تو یاد نہیں آخری بار آپ کب آئے تھے اگر آپ کو یاد ہے تو آپ بتا دیں۔" سلیم صاحب جو کومل کے آنے سے پہلے بڑے خوش گوار موڈ میں اپنے دونوں بچوں سے باتیں کر رہے تھے کومل کی بات سن کر ان کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔
"تمہیں میرا آنا برا لگا ہے۔" وہ اس سے سوال کر رہے تھے۔
"نہیں، مجھے کیوں برا لگے گا لیکن میں حیران ہوں۔ امی کی طرح میرے دل میں بھی سوال ہیں آخر یہاں آنے اور اتنے لمبے قیام کی وجہ کیا ہے۔"

''آپی۔'' عالیہ نے ماتھے پر بل ڈال کر ناگواری سے اسے دیکھا جبکہ طاہر بغیر کوئی ردعمل دیے خاموشی سے دیکھ اور سن رہے تھے۔

''میں ہمیشہ تم لوگوں کے ساتھ ہی رہنا چاہتا ہوں، بے شک اتنا عرصہ میں تم لوگوں سے ملا نہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں مجھے تم لوگوں کی پرواہ نہیں یا مجھے تم تینوں سے پیار نہیں، میں صرف اس لیے دور رہتا ہوں کیونکہ تمہاری ماں کو میرا یہاں رہنا پسند نہیں۔''

''اگر آپ کو اتنا ہی ہم سے پیار تھا تو ہمیں گھر سے نہ نکالتے۔'' کومل کی بات پر وہ تڑپ کر سیدھے ہوئے۔

''غلط الزام ہے مجھ پر، میں نے کبھی بھی تمہاری ماں کو گھر چھوڑنے کو نہیں کہا اور نہ نکالا۔ وہ اپنی مرضی سے مجھ سے علیحدہ ہوئی تھی اور وہ بھی بہت بری طرح لڑ کر۔ میں تمہاری ماں سے محبت کرتا تھا لیکن اسے کبھی مجھ سے محبت نہیں تھی، میری محبت ہمیشہ سے اس کے لیے قید تھی، وہ ایک بے وفا عورت ہے۔'' اس کی بات سن کر کومل استہزائیہ مسکرائی۔

''اچھی محبت ہے آپ کی، وہ آپ سے دور کیا گئیں کہ ان کو منانے کے بجائے آپ دوسری بیوی بے لے آئے اور بے وفا بھی وہی ہیں جو ابھی تک آپ کے نام پر بیٹھی ہیں۔''

''تمہاری ماں نے تم لوگوں کے دلوں میں کافی نفرت بھر رکھی ہے میرے لیے لیکن میں اس کی سچائی بتا کر تم لوگوں کی نظر میں اس کی عزت کم نہیں کرنا چاہتا۔'' ان کے کہنے پر ان تینوں نے چونک کر سلیم صاحب کو دیکھا۔

''جب آپ خود کو جسٹیفائی نہیں کر سکتے تو امی کو بلیم کر رہے ہیں۔'' کومل اب غصے سے بولی۔

''میں کسی پر الزام نہیں لگا رہا۔'' وہ تھکے ہوئے انداز میں بولے۔ ''میں تم لوگوں کے لیے آیا تھا لیکن اگر تمہیں برا لگ رہا ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔'' طاہر اور عالیہ نے غصے سے بہن کو گھور کر دائیں بائیں سے باپ کو بازو سے پکڑ کر روکا۔

''ابو! آپی کو چھوڑیں، انہیں بھی کبھی کبھی امی کی طرح دورے پڑتے ہیں۔'' طاہر نے برا سامنہ بنا کر کومل کو دیکھا۔

''منہ سنبھال کر بات کرو۔'' کومل ناگواری سے بولی۔ ''بڑی ہوں تم سے۔''

''تم بھی منہ سنبھال کر بات کرو ابو ہیں وہ ہمارے۔'' عالیہ بھی آنکھیں نکال کر اسے گھورتے ہوئے بولی۔

''باپ کی طرح عزت چاہیے لیکن باپ والے فرائض پورے نہیں کرنے۔ خود اتنے بڑے گھر میں عیش کی زندگی گزار رہے ہیں اور ہم دو کمروں کے اس گھٹن زدہ گھر میں رو رہے ہیں۔'' وہ آج دل میں دبی ساری بھڑاس نکالنا چاہ رہی تھی۔

''میں نے کبھی نہیں سوچا تھا، تم لوگوں کو خود سے جدا کروں گا لیکن یہ تمہاری ماں کا فیصلہ تھا جس پر وہ آج تک ڈٹی ہوئی ہے۔ میری اس دفعہ یہاں آنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ تم لوگ میرے ساتھ چلو۔ تمہاری دادی تمہیں بہت یاد کرتی ہیں اور نازیہ ایک اچھی عورت ہے اس کی طرف سے تم لوگوں کو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔'' کہنے کے بعد انہوں نے سوالیہ نظروں سے تینوں کے چہرے دیکھے جو تذبذب کا شکار تھے۔

''کیا تم لوگ میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتے۔''

''امی نہیں مانیں گی۔'' عالیہ مایوسی سے بولی۔

''امی کے علاوہ بھی اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔ میری جاب یہاں ہے، عالیہ کا کالج ہے اور طاہر کے لیے یہاں اچھی جاب کے زیادہ مواقع ہیں جبکہ آپ ایک بالکل چھوٹے سے علاقے میں رہتے ہیں جہاں ہمارا کوئی فیوچر نہیں۔'' کومل کے طنزیہ انداز پر وہ غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔

''میرے ہوتے ہوئے تمہیں یا عالیہ کو جاب کرنے کی کیا ضرورت ہے اور رہی طاہر کی بات میں اس کے کاروبار کے لیے سرمایہ فراہم کروں گا۔'' طاہر نے ایک دم خوش ہو کر باپ کو دیکھا جبکہ کب سے باہر کان لگا کر سنتی

ناہید غصے سے اندر داخل ہوئیں۔
''سلیم صاحب! اب کون سا نیا کھیل کھیلنے آئے ہو۔ کیوں میرے بچوں کو میرے خلاف ورغلا رہے ہو۔''
ناہید کو دیکھ کر سلیم صاحب کھڑے ہو گئے۔
''یہ صرف تمہارے ہی نہیں میرے بھی بچے ہیں۔''
''بڑی جلدی یاد نہیں آ گیا، میرے بھی بچے ہیں۔'' وہ نقل اتار کر بولیں۔ ''اتنے سالوں سے یہ محبت کہاں سوئی ہوئی تھی۔''
''بار بار ایک بات مت کرو ناہید، ورنہ میرا منہ کھل جائے گا۔'' ان کی دھمکی بھرے انداز پر ناہید ایک پل کے لیے گڑبڑائی تھیں۔
''ہم اتنے سالوں سے تمہارے بغیر رہ رہے ہیں اور بہت اچھی طرح سے رہ رہے ہیں تو لالچ دے کر میرے بچوں کو بہکانے کی ضرورت نہیں۔'' کہہ کر وہ باہر نکل گئیں۔ سلیم صاحب تیزی سے ان کے پیچھے گئے تھے جبکہ وہ تینوں اپنی جگہ مختلف کیفیات کا شکار تھے۔

☆☆☆

''ناہید۔'' وہ ان کو آواز دیتے۔ ان کے پیچھے کمرے تک آئے تھے۔ ''کیوں میرے بچوں کو مجھ سے دور کرنا چاہتی ہو۔''
''میرے کرنے سے کچھ نہیں ہوگا، وہ تمہیں پسند نہیں کرتے۔''
''وہ کرتے ہیں لیکن تم انہیں غلط باتیں بتا کر ان کے دل میں میرے لیے نفرت پیدا کر رہی ہو حالانکہ نفرت کے قابل تم ہو، تمہارے گھناؤنے کردار اور حرکتوں کے بارے میں تمہارے بچوں کو پتا چلا تو اتنی نفرت کریں گے کہ دوبارہ کبھی تمہاری شکل نہیں دیکھیں گے۔'' ان کے نفرت بھرے انداز پر ناہید نے نفرت بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔
''میری سچائی، کون سی سچائی جسے تم بھی ہمیشہ ان دیکھا کرتے ہو جس کو چھپانے کے لیے تم نے بچوں کو خود سے دور کر دیا۔ وہ بتاؤ گے۔ ضرور بتاؤ۔'' ان کا انداز چیلنج کرتا ہوا تھا۔
''پھر ساری عمر اپنی بیٹیوں کو اپنے گھر کی دہلیز پر بٹھا کر کھلانا یہ جو اتنے غیرت مند بنے پھرتے ہو لوگ تھوکیں گے تم پر۔'' ان کے چہرے پر نفرت ہی نفرت تھی جس نے ان کے چہرے کو مزید بدصورت بنا دیا تھا۔
''ہاں غیرت مند نہیں ہوں تب ہی تو اتنا کچھ ہونے کے باوجود تمہیں طلاق نہیں دی۔'' ان کی بات پر ناہید استہزائیہ ہنسیں۔
''مجھے طلاق نہ دینے کے پیچھے نہ تمہاری غیرت تھی اور نہ محبت۔ صرف بدلہ تھا نفرت تھی۔'' کہہ کر وہ خاموش ہو گئیں۔ ''تمہارے لیے بہتر ہے، تم چلے جاؤ۔''
''تمہاری مرضی سے نہیں جاؤں گا۔ جب دل کرے گا تب جاؤں گا۔'' کہہ کر انہوں نے پاس پڑی کرسی کو ٹھوکر ماری اور باہر نکل گئے جبکہ ناہید نے دانت پیستے کرسی کو دھکا دیا جیسے سلیم صاحب ٹھوکر مار کر گئے تھے۔

☆☆☆

کلاس میں داخل ہوتے اس نے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور ثانیہ کے ہاتھ ہلانے پر مسکراتی ہوئی اس کی طرف آ گئی۔
''کیسی گزریں چھٹیاں۔''
''پڑھائی میں، سات تو چھٹیاں تھیں، کیسے گزریں پتا ہی نہیں چلا۔'' ہالہ کے پوچھنے پر ثانیہ نے برا سا منہ بنا

کر جواب دیا تو اس نے مسکرا کر اپنی کتاب کھولی اور پھر کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر گہرا سانس لے کر گردن دوبارہ سیدھی کر لی۔

''اگر کسی کو ڈھونڈ رہی ہو تو فضول ہے کیونکہ وہ آج نہیں آیا۔'' ثانیہ کے شرارتی انداز پر ہالہ نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

''ثاقب اور معین آج نہیں آئے۔'' ثانیہ کی بات پر ہالہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

''میں فائزہ کو ڈھونڈ رہی تھی۔'' اس کے سخت لہجے پر ثانیہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

''میں مذاق کر رہی تھی۔'' اس کا سخت چہرہ دیکھ کر ثانیہ جلدی سے بولی پر ہالہ کوئی جواب دیے بغیر سامنے دیکھنے لگی۔

''ویسے حیرت ہے، فائزہ کلاس میں نہیں آئی ورنہ میں نے اسے گیٹ سے اندر آتے ہوئے دیکھا تھا۔'' ثانیہ کے کہنے پر اس نے دوبارہ نظر کلائی پر بندھی گھڑی پر ڈالی اور تیزی سے سامنے رکھا بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور کھڑی ہو گئی۔

''ارے کہاں جا رہی ہو، سر آنے والے ہیں۔''

''میں لیکچر تم سے لے لوں گی۔'' ابھی مجھے فائزہ سے کام ہے۔'' وہ عجلت میں کہتی باہر کی طرف بڑھی۔ اس کا رخ گراؤنڈ کی طرف تھا۔ وہ گراؤنڈ کے اس مخصوص کونے کی طرف بڑھنے لگی جہاں وہ زیادہ تر بیٹھتے تھے اور اسے دور سے ہی فائزہ نظر آ گئی جو بڑے آرام سے شہتوت کے درخت سے ٹیک لگائے موبائل دیکھ رہی تھی وہ دبے پاؤں اس کی طرف بڑھنے لگی اور اس کے قریب پہنچ کر بیگ اس کے پاؤں کے پاس رکھا اپنے دھیان موبائل کی اسکرین اسکرول کرتی فائزہ نے ہڑبڑا کر سر اٹھایا اور ہالہ پر نظر پڑتے ہی اسے گھور کر دیکھا۔

''میرا ہارٹ فیل ہو سکتا تھا۔'' فائزہ کے کہنے پر ہالہ اس کے قریب اسی کے انداز میں درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''مجھے پتا ہے۔ تمہارا دل بہت مضبوط ہے سو اس کے فیل ہونے کا کوئی ڈر نہیں۔'' کہہ کر اس نے فائزہ کی طرف دیکھا۔

''میں کلاس میں تمہارا انتظار کر رہی تھی، مجھے لگا تم آج آئی ہی نہیں وہ تو ثانیہ نے بتایا کہ اس نے تمہیں دیکھا ہے۔''

''دل نہیں کر رہا تھا بور لیکچر سننے کا۔'' وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی تو ہالہ نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

''اوکے آئی ایگری کہ لیکچر کا موڈ نہیں ہو گا پر مجھ سے کیوں نہیں ملیں۔'' فائزہ نے گہرا سانس لیا اس کی خاموشی پر ہالہ کو تشویش ہوئی۔

''مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے فائزہ کہ تم مجھے اگنور کر رہی ہو۔ کیا میری کوئی بات تمہیں بری لگی ہے۔'' فائزہ اب رخ موڑ کر بالکل اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔

''میں کیوں تمہیں اگنور کروں گی۔'' فائزہ کے سوالیہ انداز پر ہالہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا جو ہمیشہ کی طرح فریش نہیں لگ رہی تھی۔

''یہی تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا، اس دن بھی مال میں تم کچھ کہے بغیر چلی گئیں۔ میں نے کتنے فون کیے نہ تم نے اٹینڈ کیے اور نہ کال بیک کی اور آج جب تمہیں سب سے پہلے مجھ سے ملنا چاہیے تھا تو تم ملے بغیر اس کونے میں بیٹھی پتا نہیں کون سا خزانہ کھوج رہی ہو۔''

''میں نہ تم سے ناراض ہوں اور نہ تمہیں اگنور کر رہی ہوں بس...... اس دن بھی تم اچانک اتنی پریشانی سے وہاں سے گئیں اور وہ لڑکی کون تھی تمہارے ساتھ جو خود کو تمہاری ممی کہہ رہی تھی۔'' ہالہ کے سوال پر فائزہ نے اضطرابی انداز میں ہاتھ میں پکڑے موبائل کو گھمانا شروع کر دیا۔

''وہ عورت میرے پاپا کی وائف ہے۔'' فائزہ کے کہنے پر ہالہ بے حد حیران ہوئی۔

''تمہاری ممی اتنی ینگ ہیں۔''
''وہ میری ممی نہیں، میری ممی کی ڈیتھ ہو چکی ہے وہ صرف میرے پاپا کی وائف ہے۔'' اب کے فائزہ ناراضی سے بولی۔
''تو اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔ تم تو ایسے وہاں سے بھاگ گئیں جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔''
''میرے لیے تو وہ بھوت ہی ہے۔'' وہ افسردگی سے بولی۔ میں نے آج تک کسی کو نہیں بتایا کہ وہ عورت میری سوتیلی ماں ہے جو عمر میں میرے برابر ہے کیونکہ اس کے ہونے سے مجھے سوائے مذاق اور شرمندگی کے کچھ نہیں ملا، وہ عورت جب بھی میرے کسی قریبی سے ملتی ہے اسے مجھ سے چھین لیتی ہے، بدگمان کر دیتی ہے، میری زندگی میں چند لوگ ہی تھے جن سے میں پیار کرتی ہوں اور جنہیں میں کھونا نہیں چاہتی اور تم ان میں سے ایک ہو۔ اس دن جب وہ تم سے ملیں تو میں ڈر گئی تھی میں نے تمہیں کبھی پہلے ان کے بارے میں نہیں بتایا تھا لگا۔ حقیقت جان کر تم مجھ سے بدگمان ہو جاؤ گی۔ میں اس لیے فون نہیں اٹھا رہی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ تم ان کے بارے میں سوال کرو گی تو میں کیا کہوں گی۔''
ہالہ خاموشی سے اسے سن رہی تھی اس کے بات ختم کرنے پر ہالہ نے دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھام لیا جس سے وہ موبائل گھما رہی تھی۔
''جس طرح میں تمہارے لیے خاص ہوں، اسی طرح تم بھی میرے لیے بہت خاص ہو۔ میں نے کبھی دوست نہیں بنائی تھی، بس کلاس فیلوز ہی رہیں، دوستی بس تم سے کی اور دل سے کی۔ بے شک ہماری دوستی کو سالوں نہیں گزرے لیکن مختصر عرصہ بھی سالوں پر بھاری ہے، کیا اتنی سی چھوٹی بات کے لیے میں اپنی دوست کو جج کروں گی اگر تمہارے پاپا نے دوسری شادی کی ہے تو تم کیوں شرمندہ ہو اور تمہارے پاپا دو شادیاں کریں یا تین، اس کا ہماری دوستی سے کیا تعلق ہے۔''
''اللہ نہ کرے وہ اور شادی کریں۔'' فائزہ نے دہل کر آنکھیں پھیلا کر ہالہ کو دیکھا۔ اور اس کے انداز پر ہالہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس سے بات کر کے اور اسے یوں ہنستا دیکھ کر فائزہ جیسے ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔
''دیکھو فائزہ! آئندہ ایسا مت کرنا، چیزوں کو، باتوں کو اپنے تک محدود رکھ کر ان سے الجھتی مت رہنا۔ تمہاری دوست ہے تمہارے لیے۔ تم ہر بات ہر پریشانی ہر درد مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔''
''جانتی ہوں۔'' فائزہ نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا دباؤ بڑھایا۔
''تم جانتی ہو، مجھے میں ڈرپوک نہیں، بس جن سے پیار کرتی ہوں۔ ان کو کھونے سے ڈرتی ہوں۔''
''میں سمجھ سکتی ہوں۔'' ہالہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
''چلو اب اٹھو۔ اگلی کلاس شروع ہونے والی ہے۔'' ہالہ نے خود اٹھ کر اسے بھی بازو سے کھینچتے ہوئے کھڑا کیا۔

☆☆☆

زیمل نے نظر اٹھا کر سامنے بیٹھی فریحہ کو دیکھا جو ایک ہاتھ سے بار بار ماتھے پر آئے بالوں کو پیچھے ہٹا رہی تھی جبکہ دوسرا ہاتھ نوٹس کے صفحوں پر گھوم رہا تھا۔ نظروں کا احساس ہونے پر فریحہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اس کے اچانک دیکھنے پر پہلے تو زیمل گڑبڑائی پھر اس کے مسلسل دیکھنے پر کھسیانی ہو کر مسکرا دی۔
''خیریت مجھے اتنی غور سے کیوں دیکھا جا رہا ہے۔ کیا اچھی لگ رہی ہوں۔'' اس نے شرارت سے دیکھا۔
''میں اس لیے دیکھ رہی تھی کہ تم بزی تو نہیں۔''
''نہیں بزی تو نہیں، بولو۔'' وہ نوٹس بند کرتے ہوئے بولی۔
''کینٹین چلیں۔'' زیمل کے کہنے پر فریحہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔
''کیوں آج تم اپنا لنچ گھر سے نہیں لائیں؟'' کیونکہ اتنے ماہ میں پہلی بار وہ کینٹین جانے کا کہہ رہی تھی

حیرت تو بنتی تھی۔
"وہ دراصل بابا نے مجھے پاکٹ منی دی ہے تو میرے پاس کافی زیادہ پیسے ہیں میری سمجھ میں نہیں آرہا کیسے خرچ کروں تو...... میں نے سوچا، اپنی دوست کو ٹریٹ دینی چاہیے۔ تمہیں وہاں کے سموسے اور چکن رول پسند ہیں نا۔" فریحہ کتنی دیر اس کا پرجوش چہرہ دیکھتی رہی۔
"تمہارا مطلب ہے، میں تمہاری دوست ہوں۔" فریحہ کے سوالیہ انداز پر اس نے زور سے اثبات میں سر ہلایا۔
"اور یہ تمہیں کب پتا چلا، میں تمہاری دوست ہوں کیونکہ کچھ عرصے پہلے تک تو تم میری دوستی کو قبول کرنے سے انکاری تھیں۔" اس کے سوال پر زیمل کا جگمگاتا چہرہ بجھ سا گیا۔
"تو کیا میں تمہاری دوست نہیں۔"
"ارے میرا وہ مطلب نہیں تھا۔" فریحہ جلدی سے بولی۔ "میں اس اچانک تبدیلی کی وجہ پوچھ رہی ہوں۔"
"تمہیں پتا ہے کہ پورے کالج میں صرف تم سے بات کرتی ہوں۔ تمہارے ساتھ رہتی ہوں تو مطلب دوست سمجھتی ہوں لیکن بتایا اس لیے نہیں کہ بابا کو دوستی کرنا پسند نہیں، وہ کہتے ہیں کالج آپ پڑھنے جاتے ہیں دوستی کرنے نہیں لیکن جب میں نے ہالہ کو تمہارے بارے میں بتایا کہ اس نے کہا کہ دوست اچھے ہوتے ہیں اور مجھے تم سے دوستی کرنا چاہیے۔" فریحہ نے ابرو اچکائے۔
"اور اگر ہالہ نہ کہتی تو تم مجھے دوست نہ مانتی۔"
"ایسا نہیں ہے فریحہ! بس میں بابا کو ناراض نہیں کر سکتی۔"
"یار اس میں ناراضی والی کیا بات ہے دوست تو انسان اپنی مرضی سے بنا سکتا ہے، میرے پاپا نے تو مجھ پر یا میرے بہن بھائی پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ تمہارے بابا عجیب ہیں۔" وہ منہ بنا کر بولی تو زیمل کو برا لگا۔
"میرے بابا عجیب نہیں، بہت اچھے ہیں۔"
"یہ پابندی تمہارے لیے ہے یا تمہارے دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔"
"وہ سب کے ساتھ ایسے ہی ہیں۔"
"تب ہی تمہارا یہ حال ہے۔"
"مطلب؟" فریحہ کے کہنے پر زیمل نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔
"تمہارے پاپا تم پر اتنی پابندیاں لگاتے ہیں، اسی لیے تم میں کانفیڈنس نام کو نہیں۔"
"تم ٹھیک کہہ رہی ہے مجھ میں کانفیڈینس بالکل نہیں لیکن اس کی وجہ بابا نہیں آج اگر میں یہاں ہوں، پڑھ رہی ہوں۔ اچھی لائف جی رہی ہوں تو یہ سب بابا کی وجہ سے ہے۔" اب کی بار فریحہ نے الجھ کر اسے دیکھا وہ اس کی باتوں کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔
"میں بہت چھوٹی تھی جب میرے بابا کی ڈیتھ ہو گئی۔ مجھے تو وہ ٹھیک سے یاد بھی نہیں، بس تصویروں کی حد تک واقفیت تھی۔ میں ماموں ممانی کے ساتھ رہتی تھی۔" کہہ کر وہ رکی ان سالوں کی ساری اذیت جیسے جسم میں اترنے لگی تو اس نے گہرا سانس لیا۔
"پھر بابا اور پھوپھو مجھے وہاں سے لے کر آئے۔ وہاں مجھے کالج جانے کی اجازت نہیں تھی، یہاں آ کر بابا نے سب سے پہلے میرا ایڈمیشن کروایا اگر انہوں نے مجھ پر پابندی لگائی ہوتی تو کبھی مجھے کالج نہ بھیجتے ہی نہیں ویسے بھی بوا بتا رہی تھیں ہماری فیملی میں لڑکیوں کو زیادہ تعلیم نہیں دلواتے تھے یہ میرے ہی پاپا تھے جنہوں نے ہالہ کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن دلوایا۔ وہ بہت بہادر ہیں اور میری پھوپھو بھی۔" اس کے لہجے میں اپنے بابا اور پھوپھو کے لیے بہت پیار تھا۔ فریحہ کو ہر بار یہ لڑکی نئے سرے سے متاثر کرتی تھی، آج کل کے دور میں کون اتنا سیدھا

اور رشتوں کے معاملے میں اتنا شفاف ہوتا ہے۔"
"چلو اٹھو، مجھے اب بھوک لگ گئی ہے ویسے بھی مفت کا کھانا ہو تو بھوک زیادہ لگتی ہے۔" فریحہ کے شرارتی انداز پر وہ مسکرادی تھی۔ ان کی آخری کلاس انگلش لٹریچر کی تھی اور آج ان کی پروفیسر نہیں آئی تھیں تو وہ دونوں گیٹ کے قریب رکھے بینچ پر آ کر بیٹھ گئیں۔
"ویسے حیرت کی بات ہے نا کہ ہم نے آج تک کبھی اپنے گھر والوں کی بات ہی نہیں کی۔" فریحہ نے چپس کا پیکٹ کھول کر اس کے آگے کیا تو زیمل نے ایک چپس نکال کر منہ میں ڈال لیا۔
"ہاں یہ تو ہے۔" زیمل آتی جاتی لڑکیوں کو دیکھ کر بولی۔
"میرے گھر میں، امی، پاپا، میری بہن اور ایک چھوٹا بھائی ہے، بہن مجھ سے بڑی ہے، پھر میں ہوں اور پھر میرا بھائی۔ پاپا بینک میں جاب کرتے ہیں۔ امی ہاؤس وائف ہیں۔ آپی بھی جاب کرتی ہیں چھوٹا بھائی نائنتھ کا اسٹوڈنٹ ہے۔ یہی فیملی ہے ہماری۔" وہ اترا کر بولی۔
"میرا اتنا لمبا چوڑا تعارف نہیں۔ میں بابا کے گھر رہتی ہوں اور وہی میری فیملی ہے۔ بابا، تائی امی، ہالہ، بوا، پھوپھو، حماد بھائی اور ان کے بھائی۔" زیمل شرم کے مارے حارث کا نام ہی نہیں لے سکی، لیکن چپس کھانے میں مصروف فریحہ نے اس بات پر غور ہی نہیں کیا۔" وہ سرہلاتی کھانے میں مصروف تھی۔
"لو میری وین آ گئی۔" اس نے موبائل دیکھا اور عجلت میں کھڑی ہو گئی۔
"اتنی جلدی۔" زیمل پریشانی سے بولی۔
"آج مس راشدہ نہیں آئیں تو میں نے وین والے کو میسج کر دیا تھا۔ مجھے جلدی لے جائیں ورنہ سارے شہر کو وین میں ٹھونسنے کے بعد مجھے لینے آتے۔" وہ کندھے پر بیگ ڈالتی ہوئی بولی۔ "چلو کل ملاقات ہوتی ہے۔" وہ اس سے ہاتھ ملا کر گیٹ کی طرف بڑھ گئی جبکہ وہ پریشانی سے گیٹ سے باہر جاتی لڑکیوں کو دیکھنے لگی۔

☆☆☆

"پاکستان آ کر بھی لگتا نہیں تم آئی ہو۔" نفیسہ کے شکوے پر شاہانہ نے افسوس سے سر جھکا۔
"کیا کروں بھابھی میں خود اس بنجاروں والی لائف سے تنگ آ گئی ہوں۔ یہاں آنے سے تقریباً سال پہلے جنید نے اپنے بھائی سے گھر شروع کروانے کو کہا تھا۔ ہم نے وہاں سے موو تب کیا جب ہمیں لگا گھر مکمل ہو گیا ہوگا اور جنید کے آنے پر جب ہم گھر دیکھنے گئے تو وہ ابھی تک نامکمل ہے نہ کچن کمپلیٹ نہ باتھ رومز، ٹائلز تک نہیں لگیں، جنید نے جب اپنے بھائی سے پوچھا تو ان کے علیحدہ سے بہانے ہیں۔ مزدور نہیں آئے، سامان نہیں پہنچا، پیسے کم پڑ گئے تھے، حالانکہ وہ ضرورت سے زیادہ لے چکے ہیں، مزدوروں کے پیچھے بھاگتے، ٹھیکے دار کے بہانے سنتے جنید اچھے خاصے پریشان ہو گئے اور ان کو پریشان دیکھ کر میرا دماغ گھوم گیا۔ تو ظاہری بات ہے تو مجھے اپنے بھائیوں کی یاد ہی آنی تھی۔ میں غیور بھائی کے گھر گئی وہاں عباس بھیا کو بھی بلا لیا اب جنید، بھیا اور غیور بھائی کے ساتھ گھر دیکھنے گئے ہیں۔ بچے تنگ کر رہے تھے تو میں نے غیاث سے کہا مجھے بھیا کی طرف چھوڑ دے، ابھی وہ ہی چھوڑ کر گیا ہے۔"
شاہانہ پہلے کے برعکس تھکی تھکی لگ رہی تھیں، تبھی انور گلاس اور جگ لے کر اندر داخل ہوئیں۔
"کیسی ہیں آپا۔" شاہانہ انہیں دیکھ کر مسکرائی۔
"میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن تم ٹھیک نہیں لگ رہیں۔" وہ ٹرے ٹیبل پر رکھ کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔
"میں ٹھیک ہوں آپا بس تھوڑا تھک گئی ہوں۔"
"اس لیے تمہارے لیے یہ سکنجبین بنا کر لائی ہوں۔ ہمارے اپنے لان کے تازہ لیموں ہیں۔ ساتھ میں

پودینے کے پتے بھی پیس کر ڈالے ہیں، پیو گی تو فریش ہو جاؤ گی۔"
"جیو میری آپا۔" شاہانہ ایک دم خوش ہوئیں اور گلاس تھام کر ہونٹوں سے لگا لیا۔
"تمہارے شیطان کدھر ہیں۔"
"توبہ کریں آپا! میرے معصوم بچوں کو آپ ہمیشہ شیطان کہتی ہیں۔"
"ہاں بڑے معصوم ہیں، جہاں کھڑے ہوتے ہیں۔ زلزلہ آ جاتا ہے۔" ان کے منہ بگاڑ کر کہنے پر شاہانہ نے منہ پھلا کر نفیسہ کو دیکھا۔
"دیکھ رہی ہیں بھابھی آپ۔"
"ارے مذاق کر رہی ہے انور...... روز بچوں کو یاد کرتی تھی، اب آ گئے ہیں تو خوش ہے بس تمہیں تنگ کرنے میں مزہ آتا ہے انور کو۔" نفیسہ کے کہنے پر انور زیرِ لب مسکرائیں۔
"ہالہ انہیں کمرے میں لے گئی ہے۔" نفیسہ کے کہنے پر انور نے سر ہلاتے سرور کو آواز دی۔
"یہ ہالہ کے کمرے میں دے آؤ۔" سرور کے جاتے ہی شاہانہ نے متلاشی نظروں سے ارد گرد دیکھا۔
"زیمل نظر نہیں آ رہی۔"
"کالج گئی ہوئی ہے۔"
"ابھی تک نہیں آئی؟" انہوں نے کچھ حیرت سے گھڑی کی طرف دیکھا جہاں دوپہر کے تین بج رہے تھے ان کے پوچھنے پر نفیسہ اور انور بوا کی نظریں بے اختیار گھڑی کی طرف اٹھیں، ان کو پریشان دیکھ کر شاہانہ نے گلاس واپس ٹیبل پر رکھ دیا۔
"تمہارے ساتھ باتوں میں لگ کے دھیان ہی نہیں گیا۔" نفیسہ پریشانی سے بولتی باہر دروازے کی طرف بڑھیں۔ لاؤنج کا دروازہ کھول کر وہ گیٹ کی طرف بڑھیں۔
"ناصر! حفیظ بھائی ابھی تک نہیں آئے۔" گیٹ پر موجود گارڈ سے انہوں نے پوچھا۔" جواباً اس نے سر نفی میں ہلایا تو وہ سر ہلاتی تیزی سے اندر بڑھیں۔"
"کیا ہوا؟" ان کے اندر داخل ہوتے شاہانہ نے پوچھا۔
"حفیظ بھائی ابھی تک نہیں آئے۔" کہتے ہوئے انہوں نے موبائل اٹھایا دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔
"ہیلو حفیظ بھائی! آئے نہیں آپ ابھی تک۔" ان کی آواز سنتے۔ وہ تیزی سے بولیں۔
"نہیں بی بی! ابھی راستے میں ہوں گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ مکینک کو فون کیا ہے پر ابھی تک نہیں آیا۔"
"تو زیمل آپ کے ساتھ ہے۔"
"نہیں۔ میں ابھی کالج نہیں گیا۔"
"کیا؟" وہ اونچی آواز میں بولیں۔
"آپ پریشان نہ ہوں بی بی! میں نے حماد بیٹے کو فون کر دیا تھا۔" ڈرائیور کی بات سن کر انہوں نے گہرا سانس لیا۔

☆☆☆

"بابا کو ہمیشہ میری گردن ہی پتلی نظر آتی ہے۔" حماد نے جھنجھلا کر سگنل کی لال بتی کو دیکھا اور دوسری بیزار نظر ٹریفک پر ڈالی جبکہ حارث اطمینان سے اپنے لیپ ٹاپ کو دونوں ٹانگوں پر رکھے کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔
"بیٹا! حرکت میں برکت ہے۔" حارث اسکرین پر نظر جمائے بولا۔
"میں بغیر حرکت کے بھی برکت میں ہوں۔"

"اتنا اچھا پروگرام بنایا تھا ہم دوستوں نے، سارا خراب کر دیا، ویسے یہ بتائیں، بابا آپ کی گاڑی کیوں لے گئے ہیں۔"
"کیونکہ ان کی گاڑی آفس میں پارک ہے۔"
"اور وہ خود کہاں ہیں۔"
"وہ جنید انکل کے ساتھ گئے ہیں۔"
"تو آپ گھر سے گاڑی منگوا لیتے۔" اس کے مسلسل شکووں پر حارث نے اسکرین سے نظریں اٹھا کر اسے گھورا۔
"سوری۔" اس کے گھورنے پر اس نے منہ بسور کر کہا۔ سگنل کی سبز بتی جلتے ہی اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ تب ہی اس کا موبائل بجا تو اس نے ڈیش بورڈ پر رکھا فون اٹھایا اور اسکرین پر حفیظ انکل دیکھ کر کال آن کرا سپیکر پر لگا دی۔
"جی انکل! بولیں۔"
"بیٹا! میں زیمل بیٹی کو لینے کالج جا رہا تھا پر راستے میں گاڑی خراب ہو گئی۔ آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا ہے مجھے مکینک کا انتظار کرتے۔" حماد نے بے ساختہ وقت چیک کیا۔
کالج ٹائم ختم ہوئے ایک گھنٹہ ہو گیا تھا۔
"آپ مجھے اب بتا رہے ہیں۔" وہ غصہ ضبط کرتا بڑی مشکل سے لہجے پر قابو رکھ کر بولا اور فون بند کر دیا۔
"بھائی! مجھے زیمل کے کالج جانا ہوگا۔" وہ پریشانی سے بولا۔ اسے پریشان دیکھ کر حارث نے سر جھٹکا۔
"اس کو فون کر کے انفارم کر دو، گاڑی خراب ہو گئی ہے، وہ کیب کروا کے آ جائے۔" اس کے مشورے پر حماد نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھائی۔
"اس کے پاس فون نہیں۔"
"کیا؟" حارث نے حیرت سے ابرو اچکائے۔
"حد ہوتی ہے۔" وہ جھنجھلا کر بولا۔ جس وقت وہ کالج پہنچے، چار بجنے والے تھے کالج کے ارد گرد کا سارا ایریا ویران پڑا تھا۔ حماد تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھولتا کالج کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ کالج کی ویرانی دیکھ کر حارث بھی بے ساختہ گاڑی سے باہر آیا تھا۔ حماد کالج کے چوکیدار کے پاس کھڑا کچھ بات کر رہا تھا تب ہی وہ گیٹ کھول کر اندر چلا گیا جبکہ حماد اضطرابی انداز میں ٹہلنے لگا۔ حارث کی نظریں بھی گیٹ پر ٹکی تھیں، چوکیدار کو اندر گئے دس منٹ سے زیادہ ہو گئے تھے۔ گیٹ کھلنے پر دونوں نے چونک کر دیکھا، چوکیدار باہر آیا وہ اکیلا تھا، حماد کا رنگ اڑا جبکہ حارث دو قدم آگے بڑھا۔ اس سے پہلے وہ چوکیدار تک پہنچتا، وہ گیٹ سے باہر آ گئی تھی، ڈری سہمی، سرخ چہرے، سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ، اس کی پہلی نظر حماد پر پڑی اور اسے دیکھتے آنکھیں ایک بار پھر لبالب آنسوؤں سے بھر گئیں، حماد تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔
"تم ٹھیک ہو؟" حماد نے جھک کر غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ زیمل نے روتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا جبکہ اسے صحیح سلامت دیکھ کر حارث نے غصے سے سر جھٹکا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر زور سے دروازہ بند کیا۔ آواز پر حماد کے ساتھ زیمل نے بھی اس طرف دیکھا اور حارث کو دیکھ کر زیمل کا سہما دل مزید سہما تھا، اس نے ان ہی سہمی نظروں سے حماد کو دیکھا۔
"کچھ نہیں کہتے، چلو تم۔" اس کا ڈر دیکھ کر حماد نے اسے تسلی دی تو اس کے پیچھے چل دی۔ یہ شکر ہی تھا سارا راستہ حارث نے کوئی بات نہیں کی لیکن اس کے نمایاں ہوتے جبڑے بتا رہے تھے کہ وہ غصہ ضبط کرنے کی کوشش

میں ہے۔ کار پورچ میں رکتے ہی سب سے پہلے حارث تیزی سے اترا اور اب کی بار بھی اس نے گاڑی کا دروازہ اتنی ہی زور سے بند کیا تو حماد نے برا سامنہ بنایا۔
''انسان کم از کم غصہ تو اپنی گاڑی پر نکالتا ہے، مجھ غریب کی کار کے انجر پنجر ہلا دیے ہیں۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا اترا تو پیچھے زیمل بھی اتری۔
''بھائی! میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔'' وہ آنسوؤں کو ضبط کرتی بولی تو دروازے کی طرف بڑھتا حماد بے ساختہ مڑا۔
''ہاں زیمل! مجھے پتا ہے، تمہاری غلطی نہیں، حفیظ انکل کی غلطی ہے اور آج میں بابا سے ان کی شکایت بھی لگانے والا ہوں۔'' اس کی تسلی کے لیے وہ دھمکی والے انداز میں بولا تو وہ مزید گھبرا گئی۔
''آپ بابا سے بالکل کوئی بات نہیں کریں گے۔''
''ٹھیک ہے۔ نہیں کرتا، ابھی تو اندر چلو، سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔'' حماد کے کہنے پر اس نے سر ہلاتے ہوئے اپنی چادر سے چہرے کو صاف کیا لیکن اندر داخل ہوتے ہی شاہانہ پر نظر پڑتے ہی وہ بھاگتی ہوئی ان کی طرف بڑھی اور ان کے گلے لگتے ہی زار و قطار رونے لگی جبکہ لاؤنج سے گزرتے حارث نے کوفت سے یہ منظر دیکھا۔
''زیمل۔'' اس کے یوں رونے سے وہ پریشان ہو گئی تھیں۔
''کیا ہوا میری جان، کیوں اس طرح رو رہی ہو۔ دیکھو سب تمہیں دیکھ کر پریشان ہو رہے ہیں۔'' شاہانہ کے کہنے پر اس نے ان کی گردن سے منہ نکال کر سامنے دیکھا، جہاں نفیسہ اور انوری بوا پریشانی سے اسے دیکھ رہی تھیں اس نے ایک بار پھر چادر سے اپنا چہرہ صاف کیا سفید رنگ میں چادر کی رگڑ سے مزید سرخیاں گھل گئی تھیں۔
''سوری۔'' وہ تیزی سے پلکیں جھپک کر آنسو اندر اتارنے لگی۔
''حفیظ بھائی کی تو میں ابھی کلاس لیتی ہوں جن کی وجہ سے میری بیٹی اتنی پریشان ہوئی۔'' نفیسہ نے قریب آ کر اس کا چہرہ سہلایا۔
''تائی امی! بابا کو نہیں بتانا۔''
''ہاں نہیں بتائیں گے تم چلو شاباش جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ بوا نے آج تمہاری پسند کی کڑھی پکوڑہ بنایا ہے، پسند ہے نا تمہیں۔'' نفیسہ کے پوچھنے پر اس نے سر ہلایا۔ اس کے مڑتے ہی نفیسہ کے اشارہ کرنے پر شاہانہ ان کے ساتھ کچن میں آ گئیں۔ جہاں حارث اپنے لیے فروٹ کاٹ رہا تھا۔
''یہ کیا کر رہے ہو، کھانا نہیں کھانا۔'' اسے فروٹ کھاتا دیکھ کر نفیسہ نے حیرت سے پوچھا۔
''یہ جو آپ نے پکایا ہے، کیا میں وہ کھاتا ہوں۔'' اس نے ہنڈیا کی طرف اشارہ کیا جس میں کڑھی تھی۔
''تمہیں کباب فرائی کر دیتی ہوں۔ یہ زیمل کے لیے بنائی تھی۔ اس کو پسند ہے۔'' سیب کا ٹکڑا منہ میں رکھتے وہ ایک پل کے لیے رکا۔
''اس گھر میں زیمل کے علاوہ اور لوگ بھی رہتے ہیں جب سے وہ آئی ہے، آپ لوگ ایسے بی ہیو کر رہے ہیں جیسے وہ الگ ہی سیارے سے تشریف لائی ہے۔ کچھ اس کی حرکتیں بھی ایسی ہی ہیں۔ آج کی حرکت کو لے لیں۔ اگر ڈرائیور لیٹ ہو گیا تھا تو فون کرنا چاہیے تھا لیکن پھر پتا چلتا ہے۔ اس کے پاس فون ہی نہیں۔ کیا انسان کو اتنا جاہل ہونا چاہیے۔'' وہ اب رخ موڑ کر شاہانہ کو دیکھ رہا تھا۔
''اگر فون نہیں تھا تو پرنسپل کے آفس سے گھر پر فون کر لیتیں کتنے لوگ ہیں گھر پر۔ آپ ہیں اماں ہیں۔ بوا ہیں حماد ہے، ہالہ، بابا سب کے پاس موبائل ہیں لیکن نہیں ان محترمہ کو تو کرتب کر کے لوگوں کو پریشان کرنے میں

مزہ آتا ہے۔ سارے گھر کو اس نے پریشان کر کے رکھ دیا۔ میں اور حماد اتنے ضروری کام سے جا رہے تھے۔ سب چھوڑ کر اس کو ڈھونڈنے نکل گئے۔ وہ کوئی بچی ہے۔ کالج اسٹوڈنٹ ہے اگر ڈرائیور نہیں آیا تھا تو کیب کروا کے آ جاتی۔ اس طرح کالج کے کونے میں چھپ کر بیٹھ گئی اور کسی کو پتا ہی نہیں۔ وہ اندر ہے۔ کچھ اندازہ ہے آپ کو، اس کی یہ حماقت اس پر کتنی بھاری پڑ سکتی تھی۔''

وہ واقعی سخت تپا ہوا تھا اس کا ناراض اور غصیلا انداز محسوس کر کے نفیسہ اور شاہانہ نے دزدیدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ نفیسہ کے اشارہ کرنے پر شاہانہ گلا کھنکھار کر اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔

''حارث باتیں کرنا بہت آسان ہے کہ ایسی پچویشن تھی تو ایسا کر لیتی، اس کی وجہ سے سب کو پریشانی ہوئی ہونی بھی چاہیے تھی لڑکی ذات ہے، کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن ہماری پریشانی میں فکر تھی جبکہ تمہاری پریشانی میں ناگواری ہے۔'' حارث کچھ بولنے لگا تھا جب انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

''کیا ہالہ گھر نہ پہنچتی تو تم پریشان نہ ہوتے۔'' ان کے سوال پر وہ ہونٹ بھینچ گیا۔

''ہالہ فون کر دیتی۔'' حارث کے کہنے پر شاہانہ مسکرائیں۔

''ہالہ کے پاس فون ہے۔'' ریمل کے پاس نہیں ہے۔''

''اب یہ بھی میری غلطی ہے۔'' وہ جھنجلا کر بولا۔

''بالکل اس غلطی میں تم بھی شامل ہو، کسی کو خیال نہیں آیا کہ اس کو بھی فون کی ضرورت ہو سکتی ہے اور دوسری بات وہ سادہ ہے، معصوم ہے۔ اس نے عام لڑکیوں کی طرح زندگی نہیں گزاری۔ اس کی زندگی کسی غلام کی طرح ایک ایک چیز کے لیے ترستے ہوئے گزری ہے، باہر کی دنیا اس نے نہیں دیکھی۔ وہ گیٹ سے باہر اکیلی نہیں جا سکتی، مال میں زیادہ لوگوں کو دیکھ کر ڈر جاتی ہے۔ میرے ساتھ مال گئی تھی۔ سارا ٹائم وہ میرا ہاتھ ایک بچی کی طرح تھام کر چلتی رہی اور تمہیں لگتا ہے کہ وہ اکیلی کیب کروا کر آ جاتی جبکہ مجھے یقین ہے راستے تو دور کی بات، اسے گھر کا ایڈریس بھی پتا نہیں ہوگا تو کیا اس کا اکیلا آنا سیف تھا؟'' ان کے سوال پر حارث نے سنجیدہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''چلیں، میں آپ سے سوال کرتا ہوں، نیوٹرل ہو کر جواب دیجیے گا۔ جو لڑکی اکیلے گھر سے باہر نہیں جا سکتی۔ دو لوگوں سے خود اعتمادی سے بات نہیں کر سکتی جس کو موبائل کا پتا نہیں بلکہ کسی چیز کا بھی پتا نہیں اس کی شادی آپ مجھ سے کروانا چاہتے ہیں، کیا یہ صحیح ہوگا۔''

''شادی کے بعد سب صحیح ہو جاتا ہے۔'' کب سے خاموشی سے سنتی نفیسہ بے ساختہ بولیں۔

''اماں! دل بہلانے کے لیے یہ خیال اچھا ہے۔'' وہ استہزائیہ مسکرایا۔

''بھابھی ٹھیک کہہ رہی ہیں حارث! لڑکیاں بہت حساس ہوتی ہیں شادی کے بعد امیچور لا ابالی لڑکی بھی میچور ہو جاتی ہے اگر ہر وقت اسے چھوٹی چھوٹی باتوں پر ٹوکا جائے گا تو وہ اور احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے گی اگر اسے پیار اور اپنے ہونے کا احساس دو گے تو بالکل اس سانچے میں ڈھل جائے گی جیسا تم چاہتے ہو۔'' حارث نے بے ساختہ سر جھٹکا۔

''پھوپھو! میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں، میں نے کبھی اس کے بارے میں نہیں سوچا، مجھے پہلے بھی اس کی ایج پر اعتراض تھا اور اب جب میں اس کی حرکتیں دیکھ رہا ہوں تو مجھے اپنا فیصلہ اور ٹھیک لگ رہا ہے کیونکہ وہ میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتی۔''

نفیسہ نے پریشانی سے حارث کو دیکھا جبکہ شاہانہ کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ نہ حیرت اور نہ غصہ کیونکہ وہ جانتی تھیں حارث پہلے بھی ان سے یہ کہہ چکا تھا۔

''مما! بھوک لگی ہے۔'' تناؤ والی خاموشی کو رجا کی آواز نے توڑا تھا۔ حارث کے باہر جاتے ہی شاہانہ نے نفیسہ کی طرف دیکھا جو پریشان لگ رہی تھیں۔

''پریشان نہ ہوں بھابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ان شاء اللہ!'' نفیسہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں اور گہرا سانس لے کر باہر نکل گئیں جبکہ شاہانہ سر جھٹک کر رجا کے لیے کھانا نکالنے لگیں۔

☆☆☆

وہ اندر آئیں تو زیمل اپنے سامنے کتابیں پھیلائے ان پر جھکی تھی دروازہ کھلنے پر اس نے سر اٹھایا اور شاہانہ کو دیکھ کر مسکرا دی۔

''کھانا کیوں نہیں کھایا۔'' وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''بھوک نہیں تھی۔''

''اور بھوک کیوں نہیں؟'' ان کے سوال پر وہ کتنی دیر گردن جھکائے بیٹھی رہی اور جب چہرہ اٹھایا تو بڑی بڑی سبز نگینوں جیسی آنکھیں پانی سے بھری تھیں۔

''میری گڑیا۔'' انہوں نے بے ساختہ آگے کھسک کر اسے اپنے سینے سے لگایا۔

''پھوپھو! میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا، حفیظ انکل ہمیشہ میرے گیٹ سے نکلنے سے پہلے وہاں موجود ہوتے تھے۔ اس دن وہ باہر نہیں تھے میں کچھ دیر کھڑی ان کا انتظار کرتی رہی لیکن وہ نہیں آئے۔ سب لڑکیاں جا رہی تھیں پھر وہاں کچھ عجیب سے آدمی آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ صرف مجھے دیکھ رہے تھے تو میں کالج کے اندر چلی گئی دکان کافی دیر بعد جب باہر آئی تب بھی وہ لوگ وہیں تھے تو میں دوبارہ اندر چلی گئی سارا کالج خالی ہو گیا تھا، میں بہت ڈر گئی تھی پھوپھو! مجھے گھر کا راستہ بھی نہیں آتا تھا۔'' وہ کہہ کر رونے لگی۔

''ٹھیک ہے بیٹا! رونے والی کوئی بات نہیں۔'' شاہانہ نے پیار سے اس کی پشت سہلائی۔

''تم نے بالکل ٹھیک کیا۔'' انہوں نے اسے خود سے علیحدہ کر کے اس کا چہرہ صاف کیا۔ ''میری بیٹی بہت سمجھ دار ہے۔''

''پھوپھو سب مجھ سے ناراض ہیں؟''

''کس نے کہا سب ناراض ہیں۔''

''حماد بھائی اور وہ......'' کہہ کر وہ خاموش ہو گئی جبکہ شاہانہ سمجھ گئیں کہ وہ حارث کی بات کر رہی ہے۔

''ناراض نہیں ہے زیمل! وہ سب پریشان ہو گئے تھے لیکن اگر کبھی دوبارہ ایسا ہو تو سمجھ داری سے کام لینا اپنے پاس سب کے نمبر سیو کر لو کبھی بھی کوئی ایمرجنسی ہو سکتی ہے اور تمہیں گھر کا ایڈریس بھی زبانی یاد ہونا چاہیے۔ یا اس کو ڈائری پر لکھ لو۔''

''پھوپھو! اگر ایڈریس آتا بھی ہو تو بھی میں اکیلے نہیں آ سکتی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔'' اس کی بات پر شاہانہ نے گہرا سانس لیا۔

''دیکھو زیمل۔'' انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اس کو پکڑا۔ ''تمہیں خود کو تھوڑا بدلنا ہو گا۔ حارث کو خود اعتماد لڑکیاں اچھی لگتی ہیں اگر تم یونہی ڈرتی رہو گی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر روتی رہو گی تو وہ کیا سوچے گا۔ روتی بسورتی لڑکیاں کسی کو بھی اچھی نہیں لگتیں۔'' انہوں نے پیار سے اس کے گال پر چپت لگائی تو وہ مسکرا دی۔

''میں کوشش کروں گی پھوپھو۔'' وہ فرماں برداری سے بولی۔

''مجھے میرے بچے سے یہی امید تھی۔'' تب ہی دروازہ کھول کر حماد اندر آیا۔ ان دونوں نے ایک ساتھ اس

کی طرف دیکھا۔
"لڑکے! تھوڑی تمیز بھی ہوتی ہے کسی لڑکی کے کمرے میں آنے کی۔" شاہانہ نے آنکھیں کھول کر اسے گھورا۔
"لڑکی کون سی لڑکی۔" اس نے اردگرد آنکھیں گھمائیں۔
"تمہارے سامنے اتنی خوب صورت حسین لڑکیاں بیٹھی ہیں۔" شاہانہ کے کہنے پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔
"مذاق اچھا کر لیتی ہیں آپ پھوپھو۔" وہ بیڈ کے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔
"اللہ اس لڑکی نے سب کی جان نکال کر رکھ دی بلکہ کسی کی جان شاید زیادہ ہی نکلی تھی۔" اب کے اس نے آنکھیں گھمائیں تو زیمل اس کا مطلب سمجھی نہیں تو سر جھکائے بیٹھی رہی البتہ شاہانہ نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا تو حماد نے پیچھے ہاتھ گھما کر موبائل کا ڈبہ ان کے سامنے رکھا۔
"بھائی نے دیا ہے زیمل کے لیے۔" اب کی بار شاہانہ کے ساتھ زیمل نے بھی حیرت سے اسے دیکھا۔
"حارث نے...... مذاق کر رہے ہو۔" شاہانہ نے بے یقینی سے پوچھا۔
"ارے مذاق والی کیا بات ہے، سچ میں تو خود حیران ہوں۔ آتے ہی مجھے یہ موبائل تھمایا اور کہا "اسے دے دو اور سب کے نمبرز فیڈ کر کے اسے سمجھا دو، نیکسٹ ٹائم ایسا نہیں ہونا چاہیے۔" وہ اپنی بھاری آواز کو مزید بھاری کر کے حارث کے انداز میں بولا تو شاہانہ ہنس پڑیں جبکہ اس مہربانی پر زیمل کا دل اور ہی لے پر دھڑک اٹھا تھا بظاہر وہ لاپرواہ نظر آتا تھا پر اسے اس کی پروا تھی اسے دل خوش فہم۔
"موبائل یوز کرنا آتا ہے۔" حماد موبائل کا ڈبہ کھولتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر شاہانہ کو دیکھا اور بولی۔
"میں سیکھ لوں گی۔"
"مطلب نہیں آتا۔" وہ فون نکالتے ہوئے بولا۔
"مستو۔ موبائل چینج کر لیتے ہیں۔" موبائل نکالتے ہی حماد کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔
"وجہ۔" شاہانہ نے ابرو اچکا کر پوچھا۔
"پھوپھو! آپ کو اندازہ بھی نہیں کتنا مہنگا فون ہے یہ اور اسے استعمال کرنا بھی نہیں آتا، ابھی میرا لے لے، جب چلانا آجائے گا تو واپس لے لے۔ ٹھیک ہے زیمل۔"
"جی۔" اس نے زور سے سر ہلایا۔
"کوئی ٹھیک نہیں۔" شاہانہ نے موبائل تقریباً اس کے ہاتھ سے جھپٹا۔
"ابھی تم نے نیا موبائل لیا تھا۔" انہوں نے اسے یاد دلایا۔
"اور یہ موبائل حارث نے زیمل کو دیا ہے تو مطلب زیمل کا ہے۔"
"تم چپ رہو۔" زیمل کو حماد کی حمایت میں منہ کھولتا دیکھ کر شاہانہ نے ٹوک دیا۔ تب ہی ہالہ، رجا اور ایان اندر آئے تھے اور بھاگتے ہوئے بیڈ پر چڑھ گئے۔ اب ایک زیمل سے چمٹ گیا تھا جبکہ دوسرا حماد کے کندھوں پر جھول رہا تھا۔
"تم لوگ ابھی سوئے نہیں۔" شاہانہ نے صدمے سے انہیں دیکھا جو رات بارہ بجے تک جاگ رہے تھے پاکستان آ کر ان کی روٹین بالکل خراب ہو گئی تھی۔
"میں زیمل کا موبائل دیکھنے آئی تھی۔" ہالہ شرارت سے کہتی زیمل کے ساتھ بیٹھ گئی تو زیمل نے شرماتے ہوئے حماد کی طرف اشارہ کیا جو موبائل میں گم تھا۔

''میں نے اس میں سب کے نمبر سیو کر دیے ہیں۔'' کہتے ہوئے اس نے موبائل اس کے سامنے کیا اور اب وہ اسے سمجھا رہا تھا اور دوسری طرف ہالہ بھی اسے بتا رہی تھی زیمل کو کچھ سمجھ میں آ رہا تھا کچھ نہیں۔

''اب اس خوشی میں زیمل ہمیں ٹریٹ دے گی۔'' حماد کے کہنے پر شاہانہ نے اس کے کندھے پر تھپڑ لگایا۔

''ٹائم دیکھا ہے تم نے۔''

''پھوپھو! یہ لاہور ہے جو ساری رات جاگتا ہے۔''

''ماما! آئس کریم۔'' ٹریٹ کے نام پر رجا اور ایان بھی اچھلنے لگے تھے، گاڑی گیٹ سے نکلی تو گیٹ سے کافی فاصلے پر کھڑی ایک اور گاڑی کی ہیڈ لائٹس بھی روشن ہوئیں۔ بچوں کی فرمائش پر گاڑی ریسٹورنٹ کے آگے رکی دونوں بچے بھی حماد کے ساتھ اندر گئے تھے جبکہ گاڑی میں شاہانہ، ہالہ اور زیمل تھے۔

''ویسے پھوپھو! آپ کی وجہ سے بہت رونق ہوگئی ہے، مزہ آتا ہے۔'' وہ باہر نظر آتی رونق کو دیکھتے ہوئے بولی تو شاہانہ نے مڑ کر ہالہ کو دیکھا جو باہر آتے جاتے لوگوں کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی جبکہ زیمل اپنے موبائل کو دیکھ رہی تھی۔ تب ہی بچے شور کرتے اندر آئے۔ حماد نے ہاتھ میں پکڑے آئس کریم کپ ان تینوں کو پکڑائے جبکہ وہ اور بچے برگر کھا رہے تھے۔

''زیمل نے ایک وعدہ کرنا ہے مجھ سے۔'' برگر کا بڑا سا بائٹ لیتے اس نے مڑ سے پیچھے بیٹھی زیمل کو دیکھا جو آئس کریم کھاتے بھی موبائل دیکھ رہی تھی شاہانہ نے چہرہ موڑ کر حماد کو دیکھا جس کے چہرے پر شرارت محسوس کر کے ان کے چہرے پر آنے والی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔ وہ جانتی تھیں یقیناً اس کے زرخیز دماغ میں ضرور کوئی نہ کوئی کھچڑی پک رہی ہے۔

''جی۔'' وہ موبائل اور آئس کریم چھوڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

''اب بھائی نے تمہیں موبائل لے کر دیا ہے تو یقیناً اس کی وجہ بھی ہوگی۔'' اس کے سوال پر زیمل کے ساتھ ہالہ نے بھی نا سمجھی سے اسے دیکھا جبکہ شاہانہ نے مسکراتے ہوئے افسوس سے سر ہلایا۔

''بھائی ہمارے سامنے اینگری ینگ مین بنتے ہیں، یقیناً اب ان کا دل ہوگا تم سے بات کرنے کا اب وہ ضرور فون پر تمہیں لمبے لمبے رومانٹک میسج کریں گے اور فون کر کے دل کی باتیں کریں گے جو وہ سب کے سامنے نہیں کر سکتے تو جب بھی ایسا ہو، تم سب سے پہلے مجھے بتاؤ گی۔ وعدہ کرو۔'' حماد کی بات پر ہالہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی جبکہ شاہانہ نے ایک بار پھر تھپڑ اس کے کندھے پر مارا۔

''باز آ جاؤ تم۔'' جبکہ زیمل تو یہ سوچ کر پریشان ہوگئی تھی کہ حارث اسے فون کرے گا تو وہ کیا بات کرے گی۔ ہالہ نے اس کا چہرہ دیکھا جہاں ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''یہ مذاق کر رہا ہے۔'' ہالہ نے اسے تسلی دی۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' وہ اب بھی باز نہیں آیا تھا۔

''حماد! سدھر جاؤ ورنہ میں بھیا سے تمہاری شکایت کر دوں گی اور زیمل! تم نے ہرگز کوئی بات حماد کو نہیں بتانی جو حارث تم سے کرے گا۔'' انہوں نے اسے ٹوکنا مناسب سمجھا ورنہ اس بے وقوف سے کوئی بعید نہیں تھا واقعی حماد کو سب بتا دیتی۔

''پھر آپ مانتی ہیں نا کہ حارث بھائی کی نیت ٹھیک نہیں۔''

''گاڑی چلا رہے ہو یا میں فون کروں حارث کو۔'' ان کی دھمکی پر اس نے ہنستے ہوئے کار اسٹارٹ کر دی اور ان کی گاڑی کے اسٹارٹ ہوتے ہی ایک اور گاڑی اسٹارٹ ہوئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

حنا بشریٰ



الماس بیگم کی ذات کی بنیاد فخر و غرور کی عمارت پہ کھڑی تھی۔ اس فخر و غرور کو تقویت دینے والی بہت سی چیزیں تھیں۔ ظاہری حسن...... وہ خاندان کی سب سے خوب صورت عورت تھیں۔ خوش لباسی بجنا سنورنا تو اوائل عمری سے وہ خوب اہتمام سے کرتی ہی تھیں۔

اب اس عمر میں جو ساٹھ کے ہندسے کی طرف رواں دواں تھا۔ خوش پوشاکی کا اہتمام پہلے سے زیادہ باریک بینی، دلچسپی سے کیا جانے لگا تھا۔ وہ خوش خوراک تو سدا سے تھیں۔ اچھی کوکنگ میں بھی ماہر تھیں۔

گھر بھی ملازموں کی مدد سے خوب چمکا دمکا کر

Junaid-Ansar

رکھا تھا۔ ان اوصاف وکیالات کی وجہ سے مجازی خدا کے دل پہ ان کی حکومت تھی اور اولاد مٹھی میں اور اس سب پہ جس چیز نے سونے پہ سہاگہ کیا تھا وہ تھی الماس بیگم کی تعلیم۔ انہوں نے ایل ایل بی اس زمانے میں کیا تھا جب ان کے خاندان کی کم عمر لڑکیاں میٹرک اور ایف اے کر کے سسرال روانہ کردی جاتی تھیں۔

الماس بیگم کی ڈگری صرف بتانے کے لیے نہیں تھی۔ بلکہ اس شعبے میں اپنی قابلیت کے جھنڈے گاڑ کر خود کو خواتین وکلا کی فہرست میں سب سے نمایاں کرر کھا تھا۔

اور یہ سب کچھ ان کے دل میں فخر وغرور کی صورت میں جمع ہوا تو نتیجہ حقارت وتحقیر کی شکل میں نکلا۔ خود پسندی نے احساس تفاخر کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا تو دوسروں کو خود سے کم تر سمجھنا اور پائے حقارت پر رکھنا الماس بیگم کی عادت ثانیہ بن گئی تھی۔

☆☆☆

"بھئی عزیز کے لیے تو مجھے ایم بی بی ایس لڑکی چاہیے!" سب سے چھوٹے اور چہیتے بیٹے کے لیے الماس بیگم کے یہ ارمان تھے۔ الماس بیگم کی چار اولادیں تھیں تین بیٹے اور ایک بیٹی، عزیز کے علاوہ سب شادی شدہ تھے۔ ان سب کی شادیاں الماس بیگم نے اپنی مرضی وپسند سے کروائی تھیں۔

ایک بیٹے کے لیے لیکچرار لڑکی ڈھونڈی تھی تو۔

دوسرے کے لیے سرکاری بینک میں افسر بہو۔

داماد کے معاملے میں بھی الماس بیگم کا معیار اونچا ہی رہا۔ آرمی کے کیپٹن کے نام قرعہ نکلا تھا۔ وہ الگ بات تھی کہ اس معیار اور تلاش میں الماس بیگم کے تینوں بچوں کی عمریں اچھی خاصی ہوگئی تھیں۔

لیکن معیار کے سامنے الماس بیگم کو کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ اب چھوٹے چہیتے کے لیے بھی لڑکی کی تلاش میں یہی معیار آڑے آگیا تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ انہیں صرف اور صرف ایم بی بی ایس ڈاکٹر لڑکی درکار تھی۔ بہت سے جاننے والوں نے اچھی شکل وصورت والی وکیل لڑکیاں بھی دکھائیں۔ مگر کوئی بھی الماس بیگم کی سمجھ میں نہ آئی تھیں۔

"گھر میں ایک ہی وکیل ہم خود کافی ہیں!"

یہ سوچ بھی فخر وخود پسندی پر مبنی تھی کہ اپنے شعبے میں انہیں اپنے سے بڑھ کر کوئی بھی منظور نہ تھی کہ بہو بھی وکیل آجاتی۔ اور اگر ایسا ہوتو پھر مقابلہ "ٹکر" کا رہتا تھا۔ اختلاف رائے کا بازار بھی خوب گرم رہتا تھا۔ جبکہ الماس بیگم کو اپنے سامنے بحث وتکرار تو دور کی بات، معمولی سی "ہوں"، "ہاں" بھی برداشت سے باہر تھی ایم بی بی ایس ڈاکٹر بہو کی تلاش میں الماس بیگم کے لاڈلے لخت جگر کی عمر بڑھتی ہی جارہی تھی۔

"کوئی مسئلہ نہیں...... لڑکوں کی عمر کون دیکھتا ہے؟"

الماس بیگم کی سوچ کی سوئی اس پہ آکر رک گئی تھی۔

☆☆☆

پورے ڈیڑھ سال اپنے معیار کی عینک لگائے الماس بیگم ایم بی بی ایس لڑکی کی تلاش میں رہیں۔ مگر کوئی لڑکی بھی پوری نہ اتر سکی۔ اس عرصے میں خاندان کی قابل ترین لڑکی ماہا کے "فزیوتھراپسٹ" بننے کی خبر نے دھوم مچا کر پورے خاندان کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ ماہا الماس بیگم کے مرحوم بھائی کی بیٹی تھی۔

اپنی اکڑ اور متکبرانہ فطرت کی وجہ سے الماس بیگم کی بھابھی سے کبھی نہ بنی تھی۔ بھائی کی زندگی میں منہ دیکھے کی سلام دعا ہو جاتی تھی۔ مگر بھائی کے دنیا سے جانے کے بعد تو الماس بیگم نے کبھی بھول کر بھی بھابھی اور بھتیجی کو منہ نہ لگایا تھا۔

ماہا کی فزیوتھراپی کی ڈگری مکمل ہوچکی تھی اور اب وہ کسی پرائیویٹ ہاسپٹل میں اچھی تنخواہ پر نوکری کر رہی تھی۔ جبکہ ماہا کی بہت سی سہیلیاں ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھیں جو نوکری کے حصول کے لیے جوتیاں چٹخا رہی تھیں۔

یہ خبر الماس بیگم کے کانوں تک بھی پہنچی تھی اور

کچھ لوگوں نے تو باقاعدہ مشورہ دیا تھا کہ عزیز کے لیے ماہا جیسی لڑکی "گوہرِ نایاب" ہوگی۔ اس کے علاوہ ماہا بہت سی خوبیوں کی مالک تھی۔ اس بات کا پورا خاندان معترف تھا۔

"فزیوتھراپسٹ" ماہا کے ذکر پر الماس بیگم کے چہرے پر حقارت بھری مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"مطلب کہ مالشیہ"

فزیوتھراپسٹ جو کے مالش کے ذریعے بغیر دواؤں کے مریض کا علاج کرتے ہیں۔ جس میں درد والے اعضاء کو یا وہ اعضاء جو کسی چوٹ یا حادثے کی وجہ سے سن ہو جائیں۔ انہیں گرمائش کے ساتھ مالش کر کے متحرک کر کے گویا ان میں جان پیدا کی جاتی ہے۔ اور ان کی حرکت کو بحال کیا جاتا ہے یہ فزیوتھراپسٹ کا کام تھا۔ جبکہ الماس بیگم کے مطابق "فزیوتھراپسٹ کو ڈاکٹر کہنے کی بجائے "مالشیہ" کہا جانا چاہیے تھا۔

بلند آواز میں قہقہہ لگاتے ہوئے سگی پھوپھو نے بھتیجی کی اتنی محنت سے حاصل کی گئی ڈگری کو مزاح اور طنز کا نشانہ بناتے ہوئے حقیر ہونے کا احساس دلایا تھا۔ الماس بیگم کو اپنے لاڈلے کے لیے صرف ایم بی بی ایس ڈاکٹر بہو چاہیے تھی۔ ماہا ان کے نزدیک ڈاکٹر نہیں تھی۔ کیونکہ ان کی سوچ کے مطابق ایم بی بی ایس کے علاوہ باقاعدہ میڈیکل سے تعلق رکھنے والے کسی بھی شعبے میں اسپشلائزیشن، کرنے والوں کا رتبہ نہ تو ایم بی بی ایس ڈاکٹر کا ہوتا ہے اور نہ ہی ڈاکٹر کہلائے جاتے ہیں۔

"اپنی خوشی کے لیے نام کیساتھ بھلے ڈاکٹر لگالے رہے گی تو مالشیہ ہی نا!" الماس بیگم کی حقارت حیران کن تھی۔

"بھئی مجھے نہیں کرنی اپنے عزیز کی شادی ایسی لڑکی جس نے "مالش والش" کرنے کی ڈگری لے رکھی ہو!" الماس بیگم کی باتیں ماہا کی امی کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھیں۔ جن کو سن کر وہ بے پناہ رنجیدہ ہوئی تھیں۔ "چھوڑیں امی، پھوپھو کی باتیں دل پہ نہ لیں۔!" مثبت سوچ کی مالک ماہا نے ماں کے دل کو دلاسا دینے کی کوشش کی تھی۔ نند نے ہمیشہ اپنی بھاوج کا دل جلایا تھا۔

آج اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ تبدیلی آتی بھی کیوں؟؟؟ الماس بیگم نے ہر انسان کو کم تر اور حقیر جو سمجھا تھا۔

☆☆☆

"پھپھو! درد میں کچھ کمی آئی؟" پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے ماہا فزیوتھراپی کے مختلف طریقوں کے ذریعے الماس بیگم کی دائیں ٹانگ کی مالش کر رہی تھی مالش کے بعد اب مساج کی باری تھی۔ تاکہ ٹانگ اور پاؤں جو سن ہو کر اپنی حرکت کھو بیٹھے تھے انہیں مختلف ورزشوں کے ذریعے متحرک کیا جائے۔

"ہاں بیٹا!" الماس بیگم کی آواز میں نقاہت تھی۔ مگر لہجہ بتا رہا تھا کہ چوٹ ان کے جسم پر نہیں بلکہ سیدھی ان کے فخر و تکبر پر لگی تھی۔

چند ماہ قبل الماس بیگم کورٹ سے واپسی پر روڈ کے دوسری طرف کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اس دوران، ایک تیز رفتار بائیک سوار اس بری طرح سے ان سے ٹکرایا کہ الماس بیگم کی ٹانگ اور پاؤں پہ سخت چوٹ آئی تھی۔ روزانہ وہ اپنی گاڑی پارکنگ میں کھڑی کرتی تھیں مگر اس روز پارکنگ میں جگہ نہ تھی تو مجبوراً روڈ کے دوسری طرف کھڑی کرنی پڑی تھی۔

"حادثے بھی بہانہ بنتے ہیں۔ انسان کے کس بل نکالنے کے لیے!"

"پہلے سے بہت آرام ہے ماہا۔"

ایک ماہ قبل ماہا بہو بن کر الماس بیگم کے گھر آ گئی تھی اور اس کی وجہ عزیز کے دل کو ماہا کی موہنی سی صورت بھا گئی تھی اس نے اپنی پسند کا ماں کے سامنے کئی بار اظہار کیا مگر الماس بیگم تنفر سے انکار کر دیتی تھیں۔

"اب کیا زمانے کو بتاؤں گی کہ سب سے لاڈلے بیٹے کی شادی ایک "مالش" کرنے والی سے کر دی ہے!" الماس بیگم کی نفرتیں اور حقارتیں بڑھتی جا رہی تھیں۔

"انسان کا بڑا بول کب اللہ کی پکڑ میں آجائے۔ پتا نہیں چلتا۔!"

بہت تلاش کے بعد بھی الماس بیگم من پسند ایم بی بی ایس ڈاکٹر بہو نہ ڈھونڈ پائیں تو قرعہ ماہا کے نام نکل آیا تھا۔

الماس بیگم کو جو حادثہ پیش آیا تھا۔ اس کا علاج وہ مہنگے سے مہنگے ڈاکٹر سے کروا کر چکی تھیں مگر آرام نہ آیا تھا۔ ان چار ماہ میں پوری بھر ادویات پھانک چکی تھیں مگر شفا نہیں مل رہی تھی۔

مرض بڑھتا جا رہا تھا۔ الماس بیگم بستر پر پڑ گئی تھیں۔ ان کی ٹانگ اور پاؤں نے حرکت کرنا چھوڑ دی تھی "ارے الماس! آپ کی تو اپنی بھتیجی فزیو تھراپسٹ ہے آپ کو علاج کے لیے بھٹکنے کی کیا ضرورت ہے؟"

جب بہت سی ادویات بے اثر رہیں۔ تو الماس بیگم کی کولیگز نے یہ مشورہ دیا تھا۔

"بہت شفا رکھی ہے اللہ نے اس بچی کے ہاتھ میں!" بہت سی خواتین وکلاء علاج کے لیے ماہا کے پاس جا چکی تھیں اور اب ان کی یہ رائے تھی۔

الماس بیگم کی برداشت ختم ہو چکی تھی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ درد کی وجہ سے رات بھر کراہتی جاگتی رہتی تھیں۔ بہوویں اور ملازم بھی اب عاجز آچکے تھے۔ الماس بیگم کا سارا طنطنہ کمزور پڑنے لگا تھا۔ دل ہی دل میں ارادہ کر لیا تھا "مالش" کرنے والی بھتیجی کے پاس جانے کا۔

اور پھر جب آرام ملنے لگا تو ان کو احساس ہو گیا تھا کہ اس سے بہتر بہو ان کو کوئی اور نہیں مل سکتی۔ اور پھر ماہا نے یہ ثابت کر کے دکھایا تھا۔

"ارے بھابھی، بہت اچھا کیا آپ نے جو ماہا کو فزیو تھراپسٹ کی تعلیم دلوائی!"

پورے آٹھ ماہ کے بعد الماس بیگم چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تھیں اور وہ بھی بنا سہارے کے۔

الماس بیگم اپنی بیماری کے ہاتھوں مایوس ہو چلی تھیں مگر ماہا کے ہاتھ میں جو [illegible] تھا۔ [illegible] نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔ ورنہ الماس بیگم چلنا [illegible] ہلا بھی نہیں سکتی تھیں۔

ماہا کی امی ان کی خیریت پوچھنے آئی تھیں تو الماس بیگم نے بہو کی تعریفوں کے انبار لگا دیے تھے۔

"میں تو سمجھ رہی تھی کہ عمر بھر کی معذوری ہو گئی ہے!" الماس بیگم بڑی خوش دلی عاجزی کے ساتھ اپنی بھاوج کے سامنے جذبات کا اظہار کر رہی تھیں وہ بھاوج جو انہیں کبھی ایک آنکھ نہ بھائی تھی صرف اس لیے کہ بھائی نے ان کا انتخاب اپنی پسند سے کیا تھا۔ جبکہ الماس بیگم کو ہر معاملے میں اپنی مرضی چلانے کی عادت تھی، بھابھی بھی اپنی پسند کی لانا چاہتی تھیں جو ان کے ساتھ پڑھتی تھی۔ بس اسی بات کو لے کر الماس بیگم نے بھابھی کے ساتھ نفرت آمیز رویہ رکھا تھا۔

الماس بیگم کی نفرت اور حقارت سراسر ناحق تھی جو اللہ دیکھ رہا تھا۔ قدرت نے ان کے منفی جذبات پر ایسی کاری ضرب لگائی جو سیدھی ان کے دماغ پہ لگی تو ہوش ٹھکانے آگئے تھے۔

ماہا نے جس محنت اور جانفشانی سے پھوپھو کا علاج کیا تھا۔ تو چند ماہ میں ہی بہتری آنے لگی تھی۔ جو کام مہنگی ادویات نہ کر سکیں وہ ماہا کی مالش، مساج اور ورزشوں نے کر دیا تھا۔

اب تو محفلوں میں بڑے فخر سے الماس بیگم بتاتی تھیں کہ میری سب سے چھوٹی بہو فزیو تھراپسٹ ہے اور اس کے ہاتھ میں اللہ نے بہت شفا رکھی ہے۔

"ماشاء اللہ بڑی قابل اور ذہین ڈاکٹر ہے۔ تکلیف کو جڑ سے سمجھ لیتی ہے۔"

الماس بیگم کا منہ نہیں سوکھتا تھا بہو کی تعریف کرتے۔ بلکہ بہت سے ملنے جلنے والوں کو مشورہ دینے لگی تھیں کہ "ساری دوائیں وغیرہ چھوڑو میری بہو کے پاس آؤ۔"

ان کی باتیں سن کر ماہا کی امی کی آنکھیں تشکر اور خوشی سے نم ہو جاتی تھیں کہ جتنی محنت سے انہوں نے بیٹی کو شوہر کی موت کے بعد پڑھایا لکھایا تھا آج وہ نا صرف معاشرے میں معتبر تھی بلکہ اپنی قابلیت کی وجہ سے سسرال میں بھی الماس بیگم کی سب سے چہیتی بہو ہونے کی سند حاصل کر لی تھی۔

سمیرا حمید



تنہا دلہن

ناولٹ

سردیوں کی اس بھوت پریت رات میں حویلی کے سناٹے میں اس وقت ہل چل ہوئی جب نئی دلہن معہ چند قریبی رشتے داروں کے حویلی آئی۔ خالہ بی نے استقبالیہ رسمیں کیں۔ کنیز کو بھیج کر اسے بلوایا لیکن اس کی آمد ندارد۔ ناچار انہوں نے دستیاب خواتین کی ہمراہی میں دلہن کو سسرال میں خوش آمدید کہا۔ شادی کان پور میں بڑے بھیا کے گھر سے ہو چکی تھی، آج رات دلہن آبائی حویلی تشریف لا رہی تھیں۔ اس کا میکہ کان پور میں تھا۔ رشتے دار وہیں شریک ہوئے تھے اور اب دلہن نے سسرال گھر کی راہ لی تھی۔ شادی بھی کیا نکاح ہوا تھا۔ ابا میاں اور وہ حویلی ہی رہے تھے۔ ابا میاں کی طبیعت کا تقاضا تھا، اس کے مزاج کا۔ دونوں کو ساتھ لے جانے کا چارہ کیا گیا لیکن ناکامی ہوئی۔ آپا نے خط لکھ لکھ کر سمجھایا، منایا لیکن اس نے چمگادڑوں کا مسکن چھوڑنا گوارا نہ کیا۔

وہ اس بھوت پریت حویلی کی بدروح بن چکی تھی۔ ایک بھوت مردان خانے میں رہتا تھا، بھائی صاحب اور ایک زنان خانے میں، جہاں آرا بیگم۔ ان دو میں سے ایک کی دلہن گھر آ گئی جاتی تھی۔ مدت ہوئی بھائی صاحب بیوی کی جدائی کا غم سینے سے لگائے جینے کا بہانہ کرتے تھے۔ پہلی بچی کی پیدائش پر بیگم صاحبہ رحلت فرما گئیں۔ محبوب بیوی اور پہلوٹی کی اولاد دونوں ایک ساتھ داغ مفارقت دے گئیں۔ عمر ہی کیا تھی بھائی صاحب کی کہ زندگی کو جوگ کی چوکھٹ پر چھوڑنا پڑا۔ کیا عمر ہو گی جہاں آرا کی دلہن بنی گھونگھٹ تلے دھتکار دی گئی۔ بھائی بہن کے دکھ حویلی کے درودیوار سے لپٹے تھے۔ ایک کو موت کا غم، دوسری کو ذلت کا۔ اماں کا لگایا باغ اجڑ چکا تھا۔ نئی کونپلوں کی آبیاری کون کرتا۔ پھر یکا یک کان پور سے بڑے بھیا کا پیغام آیا۔

”خط ملتے ہی آؤ۔ تمہاری ضرورت ہے، دیر نہ کرنا......“ یہ پہلی گاڑی سے وہاں جا پہنچے کہ جانے کیا افتاد آ پڑی۔

”تمہاری گرہستی کا انتظام کیا ہے، انکار نہ کرنا، شریف لوگ ہیں، تمہاری بھابھی صاحبہ کہتی ہیں، لڑکی ہیرا ہے، ہم تو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے۔ بہت ہوا اکلاپا۔ تمام کرو یہ کتھا بڑا بھائی ہوں تمہارا! آج سے پہلے کبھی نہیں کہا اب میری تحقیر نہ کرنا۔“

نہ جانے بھائی صاحب ہی تنہائی سے گھبرا چکے تھے یا لڑکی کی قسمت زور آور تھی کہ نکاح انجام پا گیا۔ خدا جانے کان پور میں ایسی کون سی ہوا چلی تھی جو اماں کی زندگی میں حویلی میں نہیں چل سکی تھی۔ کہانی کا یہ راز افشا نہ ہو سکا۔ اب ان کی دلہن حویلی کی کشادہ دہلیز پر کھڑی اتنی بڑی حویلی کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس حیرت سے ظاہر تھا کہ چھوٹے گھر سے ہے، بڑے گھر آ کر سراسیمہ ہے۔ لیکن بھوت تو بڑے گھروں، حویلیوں، بنگلوں میں ہوتے ہیں، چھوٹے گھر کم سے کم بھوتوں سے محفوظ تو رہتے ہیں۔ وہاں انسانوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہوتی، بھوت اپنا بوریا بستر کہاں لگائیں گے۔ زنان خانے اور مردان خانے میں روگ اوڑھ لینے کی عیاشی بھی حویلی والوں کو میسر تھی، چھوٹے گھروں میں یہ عیاشی کہاں میسر ہوتی ہے۔

بھوتوں کا بستر حویلی کی اوپری منزل پر لگا ہے۔

لمبے دالان اور راہداریوں میں، بل کھاتی سیڑھیوں میں، اجاڑ بے آباد کمروں میں، اور اس گودام میں جس میں اماں حویلی کا بے کار سامان رکھا کرتی تھیں۔ وہ اس گودام نما کمرے کے بستر پر پڑی تھی۔ پلنگ کے آگے پیچھے یہ بڑے بڑے صندوق پڑے ہیں۔ مرمت لائق میز کرسیاں تھیں جو آج ٹھیک ہوتی ہیں، کل ہوتی ہیں کرتے کرتے یہیں متمکن رہ گئیں۔ چھت تک بلند لکڑی کی الماریاں، جن میں گرمی سردی کئی طرح کا سامان سلیقہ بند رکھا تھا۔ اماں کے ہاتھ سے ہی رکھا گیا تھا، آج بھی ویسے کا ویسا تھا۔ جس چیز کا نام نہ لیں وہ بھی یہاں داستان کا حصہ بنی پڑی ہے۔ کوئلے کے ڈھیر میں وہ ہیرا لڑکی خود کو راکھ کر رہی ہے۔ انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے تھے۔ ذرا سی غفلت کی دیر ہوتی، کوئی چنگاری اڑتی اور سامان سمیت اسے جلا کر راکھ کر دیتی۔ رات ہی رات قصہ تمام ہو جاتا۔ وہ یہی چاہتی تھی...... راکھ ہو جانا...... دنیا سے اپنا نشان مٹا دینا۔

رات کی خنکی بڑھ چکی تھی۔ اتنی دھند تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہیں دیتا تھا۔ بڑے کمروں میں انگیٹھیاں دہک رہی تھیں۔ خالہ بی کا کمال تھا ورنہ سارا گھر سرد خانہ بنا رہتا تھا۔ وہ لحاف میں دبکی ''بزم عصمت'' پڑھنے کے بعد آخری صفحات کے اشتہار پڑھ رہی تھی۔ رنگ گورا کرنے کی ترکیب، زنانہ دواخانہ کی شان دار اور قابل فخر خدمات، واحدی صاحب کا منجن اکسیر دنداں، میاں بیوی کا جھگڑا دور کرنے کا تعویذ، حسن اور صحت کا راز، دانتوں کی صفائی، ڈینٹل کریم۔

نیچے اچھا خاصا شور ہنگامہ تھا۔ اسے کوفت ہوئی، وہ جھنجلائی۔ اشتہاروں پر توجہ مرکوز رکھنے کی سعی کی۔

''کاظل کائٹ بالوں کو ملائم بناتا ہے، قیمت ایک روپیہ۔ آنکھوں کی خوب صورت دو سلائیاں،



سوتی دفعہ ڈال لیجیے، چند دنوں میں آنکھ کے سب روگ دور۔ قیمت فی تولہ صرف ایک روپیہ۔ بھدر صابن، اس کی خوبیوں کے مقابلے میں اس کی قیمت معمولی ہے، صرف نو روپے۔ قیمت پر نہ جائیے بڑے گنوں کی چیز ہے۔"

بڑے گنوں کی چیز ...... بڑے گنوں کی چیز ...... آخری الفاظ اس کے دماغ میں چمگادڑ بنے پھڑپھڑاتے رہے۔

نچلی منزل کا ہنگامہ بڑھ گیا۔ اسے خوف تھا کہ انسانوں کے ڈر سے اس منزل کے بھوت بھاگ نہ جائیں۔ اپنا بوریا بستر لپیٹ کر اسے تنہا نہ چھوڑ جائیں۔ وہ کتنی اکیلی پڑ جائے گی۔ آج اسے کھانے کی طشتری نہیں ملی تھی۔ وہ گھنٹیاں بجاتی رہی لیکن سنوائی نہیں ہوئی۔ گھر کی خادمائیں دلہن کی آمد کی تیاریوں میں لگی تھیں۔ نئی آنے والی کے لیے وہ پرانی کو بھول گئیں۔ اسے غصہ آیا لیکن وہی بات کہ غصے میں وہ بات نہیں کیا کرتی تھی۔ ناراضی جتنی شدید ہوتی خاموشی اتنی آہن۔ تمنا ہوئی کہ کوئی بھاری چیز اٹھا کر نیچے اچھال دے لیکن بے زاری سے لحاف میں گھس کر رسالہ پڑھنے لگی۔

شادی میں زیادہ رشتے دار شامل نہیں تھے۔ خالہ بی کو خاص بلوایا گیا تھا، انہیں اماں کی جگہ شامل کیا تھا۔ کوئی شادی شادمانی ان کے بغیر بجتی نہیں تھی۔ ان کے بغیر تقریبات کی سانس اکھڑنے لگتی تھی۔ اسے دوبارہ پیغام بھجوایا گیا کہ آکر دلہن سے ملاقات کرو، کچھ دیر بیٹھو، رات کے کھانے کی تیاری ہے آؤ مل کر کھائیں۔ لیکن وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔ پیغام لانے والی کو سختی سے گھورا۔

"تیسری بار تم آئی تو اچھا نہیں ہوگا ...... کہہ دو سو چکی ہوں۔"

منہ بناتی کنیز چلی گئی۔ کچھ ہی دیر میں اسے دالان میں ہل چل محسوس ہوئی۔ دروازے پر دباؤ ہوا اور وہ آہستگی سے کھلنے لگا۔ اس نے شمع دان ہاتھ میں تھام لیا کہ دے کر کنیز کو مارے گی۔ آنکھ پھوڑ ڈالے گی۔ منحوس اس کی جان نہیں چھوڑتی۔

"اے اے جہاں آرا......"

غرارہ سنبھالتیں خالہ بی دروازے سے ایک قدم اندر ہوئیں۔ اس پر پہلی نظر پڑتے ہی دل تھام لیا۔

"ہمیں مارو گی۔" صدمے سے دہل کر پوچھا۔

وہ اسی انداز میں بیٹھی رہی، شمع دان ہاتھ میں رہا۔ شمع کی لو جلتی رہی۔

"نئی دلہن آئی ہے، بھاوج ہے تمہاری۔ تمہیں لحاظ مروت نہیں کہ آکر آداب ہی کہہ جاؤ۔"

"نئی دلہن ہو یا پرانی ...... میرے بلانے پر آئی ہے۔ اس بڑھاپے میں شادی کی سوجھی۔" اس نے بے مروتی سے کہا۔

"آداب جہاں آرا......"

چوڑیاں کھنکیں اور ایک جھجکی ہوئی آواز سنائی دی۔ خالہ بی کی اوٹ میں کھڑی تھی، جہاں آرا دیکھ نہیں سکی۔ اب جو نظر پڑی تو دیکھتی رہ گئی۔ وہ بڑی آپا کی لڑکی کے برابر ہو گی، جس کی کچھ دن نہیں جاتے شادی ہوئی تھی۔ وہ بھائی صاحب سے کیا، جہاں آرا سے بھی چھوٹی تھی۔ کام دار پشواز میں تھی۔ بائیں آنکھ ابرو سمیت سیاہ تھی۔ کچھ داغ کنپٹی سے کان کی لو تک بھی تھے۔ پھر بھی کتنی حسین تھی وہ۔

"جرمنی کی حیرت انگیز ایجاد، چہرہ بدلنے کی مشین۔"

خوب صورت اور جوان چہرہ دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے۔ لیکن اکثر اوقات یہ دولت بے احتیاطی سے بہت جلد ضائع ہو جاتی ہے۔ جرمنی نے حال ہی میں ایک عجیب و غریب مشین ایجاد کر کے دنیا پر احسان کیا ہے۔ اس مشین کو استعمال کرنے سے بڑھاپے، رونق اور مرجھایا ہوا چہرہ دنوں میں شباب کی تازگی، سرخی اور رعنائی حاصل کر لیتا ہے۔ جھریاں اور لکیریں نابود ہو جاتی ہیں۔ زردی اور داغ غائب ہو جاتے ہیں۔ جلد میں دوران خون تیز ہو کر سب ناہمواریاں رفع ہو جاتی ہیں اور سوکھا چہرہ حیرت انگیز سرعت کے ساتھ شگفتہ رعب دار اور بارونق ہو

جاتا ہے۔ قیمت صرف پانچ روپے، عصمت کا حوالہ دینے سے پیکنگ مفت۔"

عصمت کا اشتہار لفظ بہ لفظ اس کے دماغ میں چکرانے لگا۔ جیسے ریڈیو پر نشر ہو رہا ہو۔

"چہرہ بدلنے کی مشین، چہرہ بدلنے کی مشین۔"

"بٹیا خود چل کر تمہارے پاس آئی ہے۔"

"یہ اڑ بھی لیتی ہے؟" بے ساختہ اس کی زبان سے پھسل گیا۔ دلہن زیر لب مسکرا دی۔

"سوکھا چہرہ حیرت انگیز سرعت کے ساتھ شگفتہ رعب دار اور بارونق ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں عورتوں کی مسکراہٹ کے ساتھ لبوں پر جنبش ہونا حسن خیال کیا جاتا ہے۔ یہ کتنا حسین مسکراتی ہے۔" الفاظ چکرانے لگے۔ ریڈیو پر نشر ہوتے رہے۔

خالہ بی کی پیشانی پر رگیں تن گئیں۔

"دلہن یہ تمہاری نند ہے جہاں آرا..... تمہاری ساس صاحبہ ان پر جان چھڑکتی تھیں، چھوٹی تھی اور لاڈلی بھی، اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا کر کھلاتی تھی۔ یہ بھی ان کے بغیر دم نہیں بھرتی تھی۔ یہ نام کی ہی جہاں آرا نہیں، تمہاری ساس صاحبہ کا جہاں تھی۔ ہمیں بھی کم الفت نہیں لیکن یہ ہم سے لحاظ مروت نہیں رکھتیں۔ دیکھو بڑھاپے کا عذاب گودوں کے کھلائے شمع دان کے نشان پر رکھتے ہیں۔"

اس نے بے اختیار ہاتھ میں پکڑے شمع دان کی طرف دیکھا اور اسے واپس رکھ دیا۔ نئی دلہن کے چہرے پر چاند روشن ہو گیا۔

"حویلی میں کھیلتی کودتی پھرتی تھی، کس جان کی لاڈلی نہیں تھی یہ......" لاڈلی کے چہرے پر تناؤ بڑھ گیا۔

"بٹیا جہاں آرا! دلہن تمہاری بھاوج ہیں، عمر میں تم سے چھوٹی ہے لیکن رشتے میں بڑی ہیں۔ رشتے کے لحاظ سے عزت دینا، اپنی ماں کی تربیت کا زمانہ بھول نہ جانا۔ عمر کی سہولت سے سہیلیاں بن کر رہنا، کوئی دن نہیں جاتا کہ حویلی کی رونق واپس آجائے گی۔ اٹھو جہاں آرا! ہنسی خوشی کا دن رنج سے

گزارنے سے کیا ہوگا۔"
دلہن کی کلائی کی چوڑیاں کھنکیں۔ اس کی ہتھیلیوں پر مہندی کھلی تھی۔ کتنی حسین مہندی تھی۔
"کچھ بولو جہاں آرا! دلہن سے بیٹھ جانے کے لیے ہی کہہ دو۔ ہم کچھ کہہ دیں تو منہ بگاڑ لیتی ہو۔" اس نے کسی قدر ناپسندیدگی سے آنے والی کو دیکھا۔
"کیوں جی؟ تم نے آتے ہی میری زندگی تنگ کرنا شروع کر دی۔" دلہن بوکھلا گئی۔ چاند ستارہ آنکھیں عرق برق ہوئیں۔
"آئے ہائے جہاں آرا! کیا خوب سلام دعا کرتی ہو اپنی بھاوج سے۔ ایک ہی گھر میں رہنا ہے کچھ ادب لحاظ رکھو۔ اتنی کتابیں پڑھتی ہو کیا سیکھتی ہو۔"
"بدتمیزی سیکھتی ہوں۔" جہاں آرا بڑبڑائی۔
دلہن نے خفیف ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ کام دار دوپٹے کا بوجھ شانوں پر بڑھ گیا۔ ہاتھ سے کام دار گھونگھٹ سنبھالنا چاہا اور پھر سے گودام چوڑیوں کی جھنکار سے گونج اٹھا۔ بڑے صندوقوں میں بھرے بھوتوں میں کھد بد ہوئی۔ کمرے میں بھونچال آیا۔
"جب برے دن آتے ہیں جسم کے روئیں بھی دشمن ہو جاتے ہیں۔" خالہ بی نے جل کر کہا۔
"بجا فرمائی ہیں۔" جہاں آرا چڑنے لگی۔
"اپنا نصیب عرض کر رہی ہوں۔"
نئی دلہن کمرے میں دو بدو کی حالت میں مجرموں کی طرح کھڑی تھی۔ وہ اس سے ملنے آئی تھی۔ اور اس نے اپنے لحاف سے نکل کر اس کی تسلیمات کا جواب دینا گوارا نہیں کیا تھا۔ اس کے مہندی لگے ہاتھوں میں لرزہ تھا۔ وہ گھبرا چکی تھی۔ بوکھلا کر ذرا سا پیچھے کھسک گئی، خالہ بی کو متوجہ کرنا چاہا کہ جہاں آرا کو پریشان کرنا ٹھیک نہیں، آیئے لوٹ چلیں۔
"دلہن اکیلی نیچے جا رہی ہیں...... جایئے ان کے ساتھ...... سیڑھیوں کی طرف بھوت ہیں، نئی دلہنوں پر عاشق ہو جاتے ہیں۔"

خالہ بی بات سمجھتیں، اس سے پہلے اس نے شمع دان کی طرف منہ کر کے پھونک مار دی۔ بھوت کمرے میں، اندھیرے کمرے میں دونوں کی نظریں مل کر رہ گئیں۔ دلہن کا خیال تھا وہ اس کی سہیلی بن کر رہے گی۔ لیکن سنا ہے انسانوں اور بھوتوں میں دوستی نہیں ہوا کرتی۔ نئی دلہن اور پرانے بھوت میں کیوں کر ہوگی؟

☆☆☆

اگلے دن اسے ناشتے کے لیے بلایا گیا لیکن وہی کہ وہ نہیں گئی۔ اپنا ناشتہ وہ دالان میں بیٹھ کر کر چکی تھی۔ اسے گھر میں اپنی موجودگی کے نشان چھوڑنے کی تمنا نہ رہی تھی۔ بلکہ وہ دنیا سے ہی اٹھ جانا چاہتی تھی۔
"دلہن بیگم کہتی ہیں گھڑی بھر ہمارے پاس آجایئے۔" آنے والی نے دلہن کے انداز کی نقل کرتے ہوئے کہا۔ اس نے جواب میں بے زاری سے دیکھا۔ آنے والی جواب کا انتظار کرتی رہی پھر لوٹ گئی۔
"دلہن کہتی ہیں اگر برا نہ لگے تو وہ آجائیں۔" وہ پھر آئی۔ وہ ایک ضروری خط لکھ رہی تھی۔ سر اٹھا کر دیکھا۔ "بہت برا لگے گا۔ یہ زحمت نہ کریں۔" چھم چھم کرتی ملازمہ لوٹ گئی۔
"دلہن دردِ سر بنے گی۔" وہ بڑبڑائی۔ خط کو مہر بند کرنے لگی تو دیکھا کہ وہ مدیرہ صاحبہ کی جگہ ایک جگہ دلہن صاحبہ لکھ دیا تھا۔
"اف......" اس نے خط ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔
صبح کی ڈاک سے خط کا جانا ضروری تھا، اس مہینے کے شمارے میں شامل ہونا ہے اور وہ دیر کر چکی ہے۔ ناحق خط ٹکڑے کیا، اسی پر تصحیح کر دیتی۔ وہ نئے سرے سے خط لکھنے لگی۔ اس کا پلنگ صندوقوں کے نرغے میں بچھا تھا لیکن لکھنے کی میز بڑی کھڑکی کے سامنے رکھی تھی۔ اسی کھڑکی کے باہر طویل دالان کا سلسلہ تھا۔ اسی کھڑکی سے حویلی کا احاطہ دکھائی دیتا تھا۔

اسے اپنے قریب کھنک محسوس ہوئی، سر اٹھایا تو دلہن صاحبہ کچھ ڈری ہوئی میز کے کنارے کھڑی تھی۔ انداز میں جھجک تھی۔ اس کے سر اٹھاتے ہی وہ ڈر کر پیچھے کھسک گئی۔ وہ اتنا ڈرتی ہے تو اتنی ہمت کس لیے کرتی ہے۔ وہ اپنا دوسرا خط خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سر جھکا کر لکھتی رہی۔ دلہن نے ہتھیلیاں مسلیں، پھر چوڑیاں کھنکیں۔ اس کی مہندی کی خوشبو جا بجا معطر ہوئی۔ وہ کسی لحاظ مروت کے انتظار میں تھی، جو میسر نہ آیا۔ کچھ نہ بن پڑا تو میز پر بکھرے خط کے ٹکڑے چن لیے۔

"دلہن صاحبہ......" ٹکڑے کو پڑھ کر ہنس دی۔

لکھتے لکھتے اس نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ دلہن کی آنکھ پیدائش سے سیاہ ہوگی۔ اس سیاہی میں بھی بلا خیز چمک تھی۔ اس کی پلکیں لانبی تھیں آنکھیں جیسے ابھی بھی بچپنے میں ہوں۔

"آپ اپنی سہیلیوں سے میرا ذکر کر رہی ہیں؟ مجھے دلہن صاحبہ لکھا ہے۔"

"تم کہاں کی دلہن صاحبہ! بھتنی صاحبہ ہو۔"

"آپ کو بھوت پسند ہیں۔ کاش میں بھوت ہوتی جہاں دل چاہتا جایا کرتی۔" اس نے بچوں کی طرح کہا۔

"میں خود بھوت ہوں۔"

"کیسے بنیں مجھے بھی بتا دیں۔"

"جیسے میں بنی خدا نہ کرے کوئی بنے۔" اس نے اداسی سے سوچا۔

"بتایئے میرا ذکر کس سے کر رہی ہیں۔" اپنے ذکر پر وہ کتنی خوش تھی۔

"مدیرہ کو خط لکھا تھا، غلطی سے دلہن صاحبہ لکھ دیا۔"

"کتنے دلفریب انداز سے غلطی ہوئی۔ دلہن صاحبہ آپ کا انداز تخاطب نفیس ہے۔"

وہ بدستور خط لکھتی رہی۔ خط مکمل کیا، اسے پڑھا۔ مہر بند کیا، پتا لکھ کر قلم کو میز پر رکھا ہی تھا کہ اس نے میز پر سے خط اچک لیا۔

"میں ابھی کنیز کو دے کر آتی ہوں صبح کی ڈاک جانے والی ہوگی۔" وہ جھٹ خط لے کر باہر نکل گئی۔

وہ نیم حیرت سے اسے کھلی کھڑکی کے سامنے سے بھاگتے ہوئے دیکھتی رہ گئی۔

"میرا خط......" تیزی سے اٹھ کر اس کے پیچھے لپکی۔ لمبے دالان میں دلہن نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

"ملازم ڈاک کر آئے گا۔" وہ ایک ہی رات میں کتنا کچھ جان گئی تھی۔

"تمہیں اس سے کیا غرض......" وہ کتنا غصہ کرنا چاہتی تھی۔

"آپ نے اس میں دلہن صاحبہ لکھا ہے نا...... میرا ذکر کیا ہے۔ میری غرض......" اس نے خط لہرایا۔

اس کا دل چاہا کہ اپنی پیشانی پر زور سے ہاتھ مارے۔ اس عمر میں بھائی صاحب کو دلہن ننھی بھی ملی اور دیوانی بھی۔ کیا ضرورت تھی اس عمر میں دردسر لینے کی۔

"واپس کرو مجھے درست کرنی ہے۔"

"نہیں...... آپ ٹکڑے کر ڈالیں گی۔" ایک ہی رات میں وہ اسے بھی جان گئی تھی۔ اس کی سوجھ بوجھ بلا خیز تھی۔ لہرا کر وہ بھاگ گئی۔ اس کا جھلمل دوپٹہ دالان میں ستارے چھوڑ گیا۔ تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔ اس نے جھانک کر نیچے دیکھا تو احاطے میں کھڑی خط کنیز کے سپرد کر رہی تھی۔ اسے ہدایت دے رہی تھی۔

"دلہن صاحبہ......" زیرلب بڑبڑا کر منہ بنایا۔ اسے اس دلہن کے وجود سے وحشت ہو رہی تھی۔ اسے ہر دلہن سے ہوتی تھی۔ جب سے وہ دلہن بن کر اجڑی تھی اسے ہر دلہن کو دیکھ کر اپنا اجڑنا یاد آجاتا تھا۔

☆☆☆

کتنی آباد تھی حویلی، وہ اجڑ کر آئی، قیامت ساتھ لائی۔ حویلی کا سناٹا اس کی سسکیوں سے شروع ہوا تھا۔ بڑے بھیا کے بعد آپا تھیں پھر منجھلے بھیا اور

پھر چھوٹے بھائی صاحب۔ وہ ابا میاں کی آخری اولاد تھی۔ آپا کم عمری میں بیاہ کر رخصت ہو گئیں، بڑے اور چھوٹے بھیا دوسرے شہر جا بسے، وہ اور منجھلے بھیا حویلی میں رہ گئے۔

حیدر آباد میں ابا میاں کے دوست رہتے تھے۔ ان کی طرف سے تحائف آتے تھے، خط آتے، تقریبات میں خواتین شرکت کرتیں۔ سب کتنا اچھا تھا۔ گھر کے افراد شریف تھے، خواتین سراپا محبت تھیں کہ تشویش کی گنجائش نہ رہی۔ نسبت ٹھہر گئی۔ وہ دہلی سے بیاہ کر حیدر آباد رخصت ہو گئی۔ سفر میں اس نے خواتین کی دبی دبی سرگوشیاں سنی تھیں۔ سسرال میں پہلی اور آخری رات اس نے جاگ کر گزاری تھی۔ شرم سے کسی نے کمرے میں جھانک کر نہیں دیکھا تھا۔

رات گزر گئی۔ صبح در آئی اس صبح وہ کمرے میں آیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر بے زاری سے کہا۔

”سب سمجھ ہی چکی ہو گی۔ واپس چلی جاؤ۔ لوٹ کر نہ آنا......“

گانے والی کے ساتھ محبت کی اجازت تھی لیکن نکاح کی نہیں۔ جس کے ساتھ نکاح کی اجازت تھی ان کے ساتھ محبت نہیں بنتی تھی۔ وہ پلنگ سے اتر کر کھڑی ہوئی تو سنگھار میز کے آئینے پر نظر ٹھہر گئی۔ وہ کتنی بدصورت لگ رہی تھی۔ بالکل بھوت۔ کتنی خوف ناک تھی وہ۔ ماں کی لاڈلی تھی نصیب کی نہیں۔ شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی گھر واپسی کی شہرت بھی عام ہوئی۔

اس نے اپنے باپ اور خاندان کو سبق سکھا دیا تھا۔ اپنی نئی نویلی دلہن کو لوٹ جانے کا عندیہ دے دیا تھا۔ جہاں آرا کو اس دن معلوم ہوا کہ قبول ہے کہنے کا اختیار دونوں کے پاس تھا، لیکن اسے قبول نہ کرنے کا اختیار صرف اس کے شوہر کے پاس تھا۔ جو جرات ماں باپ پر نہیں چلی تھی وہ شادی کے بعد نئی دلہن پر چل گئی تھی۔ اسے کمرے میں تنہا چھوڑ کر، اس کا گھونگھٹ گرا چھوڑ کر، ایک رات باہر گزار کر، اس نے خاندان کی ناک کٹوا دی تھی۔ ایک دن کی دلہن کو منہ دکھائی میں ذلت کا تحفہ دے کر اپنی محبت جیت لی تھی۔

☆☆☆

نئی دلہن اپنے سنگ نئے موسم لائی تھی۔

خالہ بی کا مختصر قیام کچھ طویل ہو چکا تھا۔ وہ دلہن دلہن کرتے نہ تھکتی تھیں۔ دلہن کو رعب سے تخت پر بیٹھنا سکھایا جا رہا ہے۔ کنیز سے کیسے بات ہو گی سمجھایا جا رہا ہے۔ دھوبی کا حساب کیسے ہوگا، مالی سے کیا کیا کام لینا ہے، برتن کب قلعی ہوں گے، قلعی گر کی مشاقی کی جانچ کیسے ہو گی، بزاز کے بھیجے کپڑے کی پرکھ کیسے کرنی ہے، کس کام میں کیسے کیڑے نکالنے ہیں، تنک کر بات کرنی ہے، مزاج برہم رکھنا ہے، نرمی شیوہ رہے لیکن کسی کی مجال نہ ہو کہ ادب لحاظ کا دامن چھوڑ دے۔ اتنی بڑی حویلی ہے، بادشاہت کے لیے بارہ آنکھیں، چھ کان چاہیے۔

”جانے دو صاحب! ہمیں دیوانہ نہ سمجھو، سب سمجھ ہے۔“ کسی بات پر خالہ بی نے ہاتھ لہرا کر نقل اتاری۔ نئی دلہن مسکراہٹ دباتی سر ہلاتی رہی۔

”سبزی گوشت کے حساب میں مامائیں ڈنڈی ماریں گی، تم بازار جا کر معلومات لینے سے رہیں، کیا کرو گی؟“

”روز کا حساب روز لکھوں گی، کسی دن کسی کو بھیجوں گی، کسی دن کسی کو، ان کی آپس کی ملی بھگت پر نظر رکھوں گی۔ شک ہونے پر سخت جانچ پڑتال کروں گی۔“ سخت جانچ پڑتال کہتے ہوئے دلہن نے اپنا پورا دم لگا دیا کہ وہ سخت گیر دکھائی دے۔

”یہ باتیں سمجھانے کے لیے ہیں، انہیں ذہن میں رکھنا۔ یہ سب جہاں آرا کے بچپن سے حویلی میں ہیں، ان پر اعتماد رکھنا۔ تمہارا کام چوکنا رہنا ہے۔ داروغہ کتنا ہی چوکس ہو، مالک کو آنکھیں ایسی کھلی رکھنی چاہیے۔ کبھی دونوں آنکھیں بند کر کے نہ سونا۔“

دلہن سٹپٹا کر خالہ کی طرف دیکھنے لگی۔

”ایک آنکھ سے کیسے سوتے ہیں؟“

"اے دلہن! نیند میں بھی غافل نہ رہنا۔ کسی چیز کا ان سے پوچھو وہ تمہیں پہلے سے معلوم ہونی چاہیے۔ اپنی لاعلمی ان پر ظاہر نہ کرنا۔ گھر کی ہر چیز پر اپنی نظر رکھو۔ تمہاری ڈبیہ سے سوئی دھاگہ غائب ہو۔ کیا مجال کہ تمہاری پیشانی سے لٹ چھو جائیں۔ حسن سلوک رکھو لیکن ان سے ہنسی ٹھٹھول کرنے نہ بیٹھ جانا کہ یہ تمہاری بات کو درخوراعتنا نہ سمجھیں۔ تم مالکن ہو گھر کی۔ تو تڑاخ بیبیوں کو زیب نہیں، ڈانٹ ڈپٹ کرو، ست کہو لیکن تہذیب کا دامن نہ چھوڑنا۔ چھوکریوں کی طرح تو تکرار میں غلطاں نہ ہو جانا۔"

لفظ چھوکری پر اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ سر ہلا دیا کہ آپ بجا فرماتی ہیں۔ یہ سر بے تکان خالہ کی باتوں پر حرکت پذیر تھا۔ اوپر دالان میں اپنی لمبی کرسی پر بیٹھی جہاں آرا نیچے نئی دلہن کی درگت بنتے دیکھ رہی تھی۔ دلہن کتنا ہنستی تھی۔ دلہن کتنا حیران ہوتی تھی۔ کبھی اپنی لانبی پلکوں سے یک ٹک خالہ کی طرف دیکھتی، کبھی انہی آنکھوں سے چاند ستارہ افشاں چھوڑتی۔ لوگوں کے دودھ کے دانت ہوتے ہیں، اس کی دودھ کی آنکھیں تھیں۔ کوئی بھی ان آنکھوں میں جھانک کر اپنا بچپن دیکھ سکتا تھا۔

تخت پر بیٹھی دلہن سروتے سے خالہ بی کی چھالیاں بنا رہی تھی۔ خالہ بی اس کی کتری چھالیاں میں، مین میخ نکال رہی تھیں۔ اسے سروتا پکڑنا نہیں آتا تھا، کئی بار اس کا ہاتھ سیدھا کر چکی تھیں۔

"دلہن میرے بعد گھر کو برباد نہ کر لینا....."

"اللہ نہ کرے خالہ بی! آپ کو کچھ ہو۔" دہل کر کہا۔ دل کی طرف ہاتھ رکھ کر کہا۔

"میں اپنے گھر جانے کی بات کہہ رہی ہوں قبرستان نہیں۔ ہر بہو ساس کو مرا ہوا دیکھنا چاہتی ہے۔ تم سے یہ امید نہ تھی۔"

اوپر اس کی ہنسی بے ساختہ بے قابو ہوئی تھی۔ خالہ بی طیش سے پان دان کی اٹھا پٹخ کرنے لگیں۔ نئی دلہن شرمندہ شرمندہ سر جھکا کر رہ گئی۔ اس کی ہنسی چھوٹی تو سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ سرخ اینٹوں کے جال سے اس کی نظر اپنی سہیلی کی نظر سے جا ملی۔ وہی بچپنے کی آنکھیں، جن میں تبسم بھرا تھا۔ بلاخیز سکون سے بھری آنکھیں۔ افشاں چھوڑتیں نظریں۔

☆☆☆

وہ گھر آئی تو اماں بستر سے جا لگی اور پھر جنازے کی صورت ہی اٹھی۔ اس کی شادی میں جتنا ہنگامہ رہا تھا کہ گھر کی آخری شادی ہے واپسی پر اتنا ہی سناٹا پھیل گیا۔ اس کا کیا قصور تھا۔ محبت کوئی کرے اس کا سود کوئی بھرے۔ اتنی سی لڑکی کے سر پر اس نے اپنی محبت کی بازی جیت لی۔ محبت کا زعم تھا تو اپنے سر پر جیتا۔ اپنی جنگ میں قربانی اور کی کیوں دی؟ وہ اپنا بھرم ہار گئی، وہ اپنی محبت جیت گیا۔ ماں کی تیمارداری میں اس نے جان لگا دی لیکن ان کی خاموشی نہیں ٹوٹی۔ اماں اس کی شکل دیکھتیں اور ان کا بخار بڑھتا جاتا۔ فرنگی ڈاکٹر کی فرنگی دوائیں سوائے سونے سلانے کے کچھ نہ کر سکیں۔ درد بڑھتا گیا، جان قطرہ قطرہ نکلتی رہی۔

پھر وہ قطرہ قطرہ بستر سے قبر میں جا پہنچیں۔

پہلے وہ کونے ڈھونڈ ڈھونڈ کر چھپتی تھی پھر ایک کونے سے جا لگی۔ اوپر منزل کے بھوت بنگلے میں جا ٹھکانہ کیا۔ نیچے کمرے سجے بنے رہ گئے، لیکن لپے خادماؤں کی آوازوں سے وحشت ہوتی۔ مالی کی قینچی کی کٹ کٹ اس کی جان جلاتی۔ دھوبی کپڑوں کی کُتی کرتا تو اس کے سر پر ہتھوڑے پڑتے۔

ڈاکیا، ڈاک لایا......ڈاکیا۔

کس کے خط آتے ہیں اب۔ کس پیغام کی چاہت تھی اس بھوت حویلی کو۔ شادی سے پہلے وہ ہر رسالے کی سالانہ خریدار تھی۔ وہی رسالے لا رہا تھا۔ جن کا ڈھیر لگ چکا تھا اور اس نے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ پرانے ملازم حویلی کا انتظام دیکھنے لگے۔ زنان خانے میں اماں کے زمانے سے خادمائیں تھیں، زنان خانے کا سارا انتظام ان کے ہاتھوں میں آ گیا۔ پھر ان کی لڑکی کنیز بھی آ گئی۔ سیاہ کرتی، سفید

کرتی وہ کمرے سے نہ نکلتی۔ تین وقت کھانا مردانے میں پہنچا دیا جاتا، تین وقت کھانا اس کے کمرے میں آ جاتا۔ ورنہ وہ گھنٹی بجاتی اپنا کام کروالیتی۔ اس کے علاوہ وہ اوپر کسی کو آنے نہ دیتی تھی۔ ابا میاں بھی اسے بلوا کر حال احوال پوچھ لیتے، ورنہ کئی دن گزر جاتے وہ کسی کی شکل نہ دیکھتی۔

"تم فضل میاں کے یہاں جایا کرتی تھی، اب کیا ہوا؟ میاں نے پیغام بھجوایا ہے نئی کتابیں آئی ہیں بتاتے ہیں روسی کتابوں کا ترجمہ ہے بٹیا پسند کرلی ہے آ کر دیکھ جائے۔"

"مجھے دلچسپی نہیں رہی۔"

"چل کر دیکھ آؤ...... ورق گردانی کرو۔ دلچسپ ہوں تو اٹھالاؤ۔" وہ خاموش رہی۔

"سنیما میں نئی فلم کی شہرت ہے اشتہار پڑھا تھا اچھی لگی، کنیز کے ساتھ جا کر دیکھ آؤ۔"

کبھی وہ سنیما جایا کرتی تھی اب اس خیال سے ہی وحشت ہوتی تھی کہ باہر نکلے گی اور کئی مردوں کی آوازیں کانوں میں پڑیں گی۔

"تمہاری آپا تمہیں یاد کرتی ہیں۔ فرسٹ کلاس کی ٹکٹ کروادوں۔"

"ابھی طبیعت نہیں۔" وہ کوفت سے جواب دیتی۔

ابا میاں اپنی سی کوشش کر کے خاموشی سے چلے جاتے۔ کیا کرتے، کیا کہتے، ساری تدبیریں ناکام رہیں۔ اماں کی زندگی میں حویلی کی رونق بام عروج پر تھی۔ اب وہیں پور پور سکوت تھا۔ کوئی دن نہیں جاتا تھا کہ گاڑی کی آمد کے لیے شور نہ اٹھتا۔ کبھی کسی رشتے دار کی سواری اتر رہی ہے، کبھی کسی کا خاندان آ رہا ہے۔ اماں کے بعد ان رشتے داروں نے آنے کی روایت قائم رکھی لیکن خالی حویلی میں وہ بولائے پھرتے تھے۔ سب یہاں سے ایسا بھاگے کہ پلٹ کر دوبارہ نہیں آئے۔ اور اب یہ دلہن تخت پر بیٹھی ہنسی دباتی تھی۔ اتنے بھوتوں میں دلہن کو لگتا تھا کہ وہ انسانوں کی طرح جی جائے گی۔ وہ سارے بھوت بھگا دے گی اور حویلی کو انسانوں سے آباد کردے گی۔

☆☆☆

"ہمارے جانے کے دن قریب آئے جاتے ہیں جہاں آرا!" خالہ بی کمرے میں آئیں۔

"خدا نہ کرے آپ کو کچھ ہو خالہ بی! آپ کا سایہ سدا سلامت رہے۔" وہ شرارت کرگئی۔ خالہ بی کا منہ اتر گیا۔

"ٹکٹ کروادی ہے تمہارے بھیانے۔ میرے منو کا تار آیا تھا کہہ رہا ہے اماں واپس آؤ دل نہیں لگتا، گھر جانے کی بات کر رہی ہوں۔ دونوں نند بھاوج مجھے قبر میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ سب اٹھ چکے دنیا سے ہمارا بھی کوئی دن جاتا ہے تسلی رکھو زیادہ جینے کی تمنا نہیں۔ موت کو پہلو میں لیے آہیں بھرتے ہیں۔ بڑھاپے کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے، اپنوں کو یاد کرتے آنسو پونچھتے صبح شام ہوں، کبھی اماں پر روئیں کبھی ابا میاں پر۔ بتاؤ کیا زندگی ہوئی ہماری، عید بقرعید چھل چھل آنسو بہائیں۔ کیا کریں گے جی کر۔ بڑے بزرگ سر پر نہیں۔ پل پل بڑے ماموں جان کی یاد تڑپاتی ہے کیسے ہمارے ناز اٹھاتے تھے۔ کس کس کو یاد نہ کریں۔ جی اٹھ گیا جینے سے، سانسوں کی گنتی ہے۔"

اس کی لکھنے کی میز سے کرسی گھسیٹ کر وہ بیٹھ گئیں۔ آنسو بہانے لگیں۔ جہاں آرا شرمندہ ہوئی ناحق مذاق کیا۔

"بتائے دے رہی ہوں اپنی بھاوج سے ہنس بول لیا کرو تربیت یافتہ بچی ہے۔ دل کی اچھی ہے تم یہاں اوپر ٹنگی رہتی ہو وہ نیچے اکیلی بوکھلائی پھرتی ہے۔ ہنسو بولو یہ دن ہیں تمہارے پھر تو گھٹنے ٹیکیں گے۔ جب تک کمر سیدھی ہے بہار کے دن ہیں ایک بار یہ ہڈی جھکی تب یاد کروگی۔ بات بڑھے گی اور بے لطفی ہوگی پھر مجھ سے شکایت کروگی۔ ان زخموں کی امداد کا شیوہ کیوں رکھتی ہو جنہیں تمہیں کھرچ ڈالنا چاہیے۔ بٹیا! دل کو غم سے نہ جوڑو...... دل کو سمجھاؤ چلو تمہارا بیاہ کر۔" اب وہ دوسری طرف آ گئیں۔

"سب روانگی ہے آپ کی......"

خالہ سمجھ گئیں کہ وہ بات ٹال گئی۔ "کل صبح کی۔" آہستگی سے کہا۔ اس کی میز پر رکھی چیزوں کا جائزہ لینے لگیں۔

"پھر کب آئیں گی؟"

"تم آؤ بھاوج سنگ ۔سیر سپاٹا کرو۔ تمہارا ننھیال ہے وہاں ملو سب سے......"

"میں خط لکھ دوں گی۔"

"تم نے لکھا اور ہم نے پڑھا، سب سمجھتی ہوں۔ جہاں آرا! مجھ بڑھیا کی ایک بات مانو گھر میں تم دو عورتیں سکھ دکھ سے رہو۔ کچھ تم کہو کچھ وہ کہے۔ دل کو لگی ہے بچی! ایک وقت کا کھانا ہی مل کر کھا لیا کرو، کیا بیماروں کی طرح طشتریاں منگواتی ہو۔ برتن بھجوا دیتی ہو۔ گھنٹیاں بجاتی ہو، گھر میں ہو یا فرنگی کارخانے میں اردلی کو گھنٹی بجا بجا کر بلاتی ہو۔" اس نے پلنگ کے کنارے رکھی گھنٹی کی طرف دیکھا۔ پھر اس پر ہاتھ مارا۔

"ایسے نہ کہیں خالہ بی! اچھی آواز ہے اس کی۔"

"بلبل تو تم ہو۔ تمہاری ہنسی سننے کو کان ترس گئے۔ جہاں آرا! زندگی کو ایسے ویران نہ کرو۔ یہ کیا زندگی ہوئی؟ کمرا دیکھا ہے جیسے خانہ بدوش رہتے ہوں۔ کوئلے کے گودام میں پڑی ہو۔ ناز و نعم میں پلی بڑھی ہو ایسی زندگی کب گزاری تم نے۔"

خالہ بڑے صندوقوں اور پرانی کتابوں کی طرف گھوم کر کہنے لگیں۔

"سب نایاب کتابیں ہیں۔" انہیں برا لگا۔

"نایاب تو بھیا تم ہو۔ کوئی آئینہ کیوں نہیں رکھتی یہاں؟ دیکھو کیسے جوانی ڈھلی جا رہی ہے۔ ہار سنگھار کرو۔ یہ عمر رسیدہ رنگ پہننے لگی ہو۔ جب سے دیکھ رہے ہیں اس بدرنگ کرتے پاجامے میں ہو۔ ایسے کرتے تو گاندھی جی کے کرم چاری نہیں پہنتے۔ کیسا پہناوا ہے یہ؟ کس بزاز سے کپڑے لیتی ہو، اس کی چھٹی کر کے جاؤں گی۔ کہاں ہیں تمہارے چنے ہوئے دوپٹے۔ یہ مرا ہوا ململ اوڑھے پھرتی ہو۔ کہاں گئیں تمہاری اماں کی منگوائی کشمیری شالیں۔ کوئی کہیں جائے اور وہ تمہارے لیے خاص سوغات نہ منگوائے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اپنی ماں کے ناز و نعم کو ہی یاد کرو، مرنے والوں کی محبت کا کچھ لحاظ رکھو۔"

بڑی مشقت سے اٹھ کر کھڑی ہوتی خالہ بی صندوقوں کی طرف بڑھ گئیں۔ جھک کر ایک کو کھول لیا۔

"دیکھو! اپنی ماں کے کپڑے سنبھالے ہوئے ہو، تمہاری ماں اس حال میں تمہیں دیکھ لیتی تو دل تھام کر رہ جاتی۔ کوئی دن نہیں جاتا تھا کہ وہ تمہارے دوپٹوں پر گوٹا کناری نہ لگواتی۔ پھول ٹانکے بنواتی۔ نئے سے نئے نمونے جمع کرتی کہ بٹیا کو بنا کر دوں گی۔ خورشید کی شادی میں تمہیں کھڑا دوپٹہ بنوا کر دیا، ساری شادی میں دھوم تھی تمہاری ...... کیا شان تھی تمہاری ...... تمہاری ماں تمہاری بلائیں لیتے نہ تھکتی تھی۔ ہر نظر تمہاری طرف اٹھتی تھی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑا لیتی تھی، کیا باریک ترپائی کرواتی تھی کہ دکھائی نہیں پڑتی تھی۔ کیسی نازکت اور نفاست سے بڑا کیا تمہیں۔

نواب زادی نہیں ہو لیکن کوئی عذر نہ چھوڑا۔ منہار کا آئے دن کا آنا جانا تھا، ہم رنگ چوڑیاں کلائی میں بھروا دیتی تھی۔ خاص راجستھان سے پازیبیں منگوائی تھیں کہتی تھی بٹیا چھن چھن کرتی بھاگی دوڑی پھرتی ہے تو دل کو سکون ملتا ہے۔ کیا مجال جو کبھی تمہارے کانوں کو سونے چاندی سے خالی چھوڑا ہو۔ لاؤ کدھر ہیں وہ سب...... کہاں گیا سب۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی، ایک صندوق کے کنارے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ خالہ بی نے دوسرے صندوق کا ڈھکن الٹ دیا۔ اندر جھانکنے لگیں۔ پھر سرد آہ بھر کر اس کی طرف گھوم گئیں۔

"سمجھ لو تم بیوہ ہو گئیں۔ ٹرین کے نیچے آ کر چلا گیا وہ کم بخت۔"

"بیوگی کا دکھ ہلکا تھا بے عزتی کا بھاری تھا۔"

آنسوؤں کا گولا اس کے حلق میں پھنس گیا۔

"اتنی بڑی قربانی نہ دو جہاں آرا! میرے دل کے ٹکڑے۔ ہمیں معاف کر دو ہم سے دیکھ ریکھ میں کوتاہی ہوئی۔ آخری وقت تک تمہاری ماں یہی کہتی رہی کہ میری لاڈلی کے ساتھ ظلم ہوا۔ میری جہاں آرا کو تنہا نہ چھوڑنا۔ میں اپنی بہن کو کیا منہ دکھاؤں گی۔"

خالہ بی بولتی رہیں اور ایک گہرا آنسو اس کی آنکھ میں آ کر ٹھہر گیا۔

"میری جہاں آرا کو تنہا نہ چھوڑنا۔"

اماں جانتی تھیں جب وہ دکھی ہوتی ہے یا کسی سے ناراض ہو جاتی ہے تو دنیا سے چھپ جاتی ہے۔ اباں بھی کچھ برا کہہ دیتی تھیں تو خفگی سے وہ گم ہو جاتی تھی۔ ساری حویلی کھنگال لی جاتی تھی وہ نہیں ملتی تھی۔ اماں جانتی تھیں وہ کسی ایسے کونے میں جا چھپے گی جہاں سے کسی کو نہیں ملے گی۔ اس کے سسرال والے کئی بار معاملات ٹھیک کرنے آئے لیکن ہر بار ایک ہی بات کہتے تھے۔

"وہ اس کا گھر ہے، وہاں رہے، کوئی دن نہیں جاتا کہ شوہر کا دل پلٹ جائے......"

اماں نے سنا تو نقاہت سے بستر سے اٹھ بیٹھنے کی کوشش کی۔ سختی سے اپنا ہاتھ تکرار میں لہراتی رہیں۔ انہوں نے ابا میاں کی ایک نہیں سنی۔

"میری لاڈلی کی زندگی برباد کر کے اب اسے انتظار کی سولی پر لٹکانے کی سزا دینا چاہتے ہیں۔ میں اپنی بچی کی خودداری کی اور تحقیر نہ ہونے دوں گی۔ گانے والی کے مقابلے میں میرے چاند کو گہنا دیا۔ ان سے کہہ دیں دوبارہ حویلی نہ آئیں۔"

اماں نے اس کے لیے صرف ایک فیصلہ کیا تھا۔ اس ایک فیصلے کے لیے وہ اماں کی شکر گزار تھی۔

☆☆☆

خالہ بی کیا گئیں سارا ہنگامہ ساتھ لے گئیں۔ حویلی کی چہک پہک واپس سکتے میں ڈھل گئی۔ دو دن نئی دلہن گھبرائی بوکھلائی رہی۔ ایسا لگتا تھا دیواروں سے سر ٹکرانے کی نوبت درپیش رہی۔ اتنی بڑی حویلی اس کے انتظام میں دے دی گئی۔ انتظام اس پر بھاری نہیں ہوگا البتہ سناٹا اسے چاک کرتا ہوگا۔

کئی دن اس سناٹے کے سپرد رہے، پھر وہ اپنے قدموں پر جمنے لگی۔ روشن گلابی سردیوں کے دن تھے۔ صبح دم ہی تخت پر بیٹھ کر حساب لکھنے بیٹھ جاتی گی۔ سبزی گوشت کی چھان پھٹک کرتی۔ خادمائیں مامائیں دوڑی پھرتی تھیں۔ پھر گھر میں نئے پھولوں کی آبیاری کا کام شروع ہوا۔ اماں کے لگائے باغ کی صفائی ہوئی۔ مٹی نرم کی گئی۔ گملوں پر روغن ہوا، نقش بنے۔ مالی آیا تھا، پھول پودوں کا ڈھیر لایا۔ اس کا چھوٹا لڑکا اوپر نیچے بھاگتا پھرتا تھا۔ جس طرف نظر جاتی تھی پھولوں کی بہار دکھائی دیتی تھی۔ پھر وہ اوپر آئی دالان میں گملے رکھوائے۔ وہ کمرے سے نکلی تو فضا کو بدلا ہوا پایا۔ جیسے حویلی کی باساند بھی اسی عہد کے انتظار میں تھی۔ جھٹ کھلی کھڑکیوں سے اڑن چھو ہوئی۔ جس جگہ اس کی لمبی کرسی رکھی تھی وہاں رنگ رنگ کے پھول رکھے تھے۔ اس نے ایک گملے کو پاؤں کی ضرب سے گرا دیا اور نیچے کی طرف سر گرا کر چلا کر کنیز کو آواز دی۔

"مجھے ڈانٹ لیجیے لیکن ملازموں کے سامنے یہ سب مت کیجیے۔ یہ ہمارا آپ کا مذاق اڑائیں گے۔ سبکی ہوگی۔ ناراضی جانے دیجیے پھول ہی تو ہیں۔" کنیز کی بجائے وہ اوپر آئی۔ لجاجت سے کہا۔

"تمہیں خالہ بی نے بتایا نہیں کہ تم یہاں مداخلت نہیں کرو گی۔ مجھے تنگ کیا تو میں یہ حویلی چھوڑ دوں گی۔"

"تنگ کیوں کروں گی محبت کرتی ہوں آپ سے۔ آپ کیوں چھوڑیں گی حویلی میں چھوڑوں گی۔" وہی اس کا معصومانہ انداز۔

"محبت کرتی ہوں آپ سے......" جہاں آرا اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

"یہ اوپر والی منزل ہی کیوں ساری حویلی آپ کی ہے۔ آپ میری ہیں میں آپ کی ہوں۔ آپ

جائیں گی تو آپ سنگ چلوں گی۔ آپ کو اکیلی نہیں جانے دوں گی۔ میرا مفہوم حویلی کی آرائش تھا۔ سوچا آپ کی طبیعت پر اچھا اثر پڑے گا، پھولوں کو دیکھ کر خوش ہوں گی۔ مجھے معاف کر دیں، دو دن یہ پھول یہاں رہنے دیں میں خود انہیں اٹھالوں گی۔"

"مجھے معاف کر دیں۔ مجھے معاف کر دیں۔"

کسی ایک نے بھی اس سے معافی نہیں مانگی تھی۔ اس کی زندگی برباد کر دی اور کسی نے معافی تک نہ چاہی۔

پھول پودے دو دن رکھے رہے، تیسرے دن وہ آئی، نئی ہدایات دی، انہیں اٹھوا کر دوسری طرف رکھوا دیا۔ اس کی لمبی کرسی والی جگہ خالی کر دی لیکن لمبا دالان ان سے مہکتا رہا۔ تین وقت کا کھانا مردان خانے میں جاتا تھا، اس میں سے ایک وقت کا کھانا باغ میں کھایا جانے لگا۔ میز سجایا جاتا، کرسیاں لگتیں، ابا میاں اور بھائی صاحب آتے، اور کھانا تناول فرماتے۔ بھائی صاحب کے پہناوے میں فرق آچکا تھا۔ ہنستے بولتے تھے، اچھے لگتے تھے۔ چہرے پر چمک لوٹ آئی تھی۔ اب صبح کا اخبار وہ یہیں کرسی پر بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ کبھی اخبار سے سر نکال کر نئی دلہن کو حویلی کے انتظامات سنبھالتے ہوئے دیکھتے تھے۔ پھر واپس اخبار کے پیچھے چھپ جاتے تھے۔

نئی دلہن کی آواز میں کھنک تھی، حویلی اس کھنک سے کھنکتی تھی۔

بھوت پریت حویلی نے کتنی جلدی دلہن کی طرف داری کرنا شروع کر دی تھی۔ شاید وہ بھی بھوتوں کا مسکن بنے رہ کر تھک گئی تھی۔ مدت ہوئی اماں کے ہاتھ کے لگائے یاسمین کے پودے تباہ ہو چکے تھے۔ اپنی زندگی میں وہ پھول پودوں کے ساتھ مصروف رہتی تھیں۔ وہ اوپری منزل سے اس اجڑے باغ کو دیکھ کر رہ جاتی تھی۔ صرف وہی نہیں بہت کچھ اجڑ گیا تھا۔ شاید بھائی صاحب نے بتایا ہوگا کہ اماں کو یاسمین کے پھول پسند تھے۔ اب ہر کیاری میں سفید ننھے پھولوں کے جگنو جگمگ کر رہے تھے۔

ایک دن ناشتے طشتری کے ساتھ یاسمین کے پھولوں کا ڈھیر بھی آیا۔ وہ پلنگ کے پیچھے الماری سے کچھ ضروری چیزیں ڈھونڈ رہی تھی۔ کمرا مہکا تو چونک کر پلٹی۔ اماں کے وجود میں ان پھولوں کی خوشبو رچ بس چکی تھی۔ ممتا کی مہک اور یاسمین کے خوشبو میں فرق جاتا رہا تھا۔ ناشتے کے ساتھ پھولوں کا ڈھیر دیکھ کر اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ دل میں رہنے والے دنیا سے چلے جائیں تب بھی ان کی خوشبو کہیں نہیں جاتی۔ کسی نہ کسی چیز سے اپنی موجودگی کا احساس دلا دیتی ہے۔ جانے والے اپنے نشان چھوڑ جاتے ہیں۔

اسے غصہ آیا۔ نئی دلہن سے تنفر محسوس ہوا۔ وہ اسے زچ کر رہی ہے۔ اسے تکلیف پہنچا رہی ہے۔ کنیز طشتری رکھ کر جا چکی تھی۔ اس نے لپک کر پھولوں کی قاب اٹھائی اور اسے کمرے سے باہر رکھ دیا۔ کچھ دیر گزری وہ واپس ان پھولوں کو اندر لے آئی۔ اپنے لکھنے پڑھنے کی میز پر رکھ دیا۔ اب روز ناشتے کے ساتھ یہ پھول آتے، روز اس کا کمرا ان پھولوں سے مہکتا۔

ایک دن ابا میاں اس کے پاس آئے۔

"آؤ ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ......"

"میں کھا چکی......"

"آکر بیٹھ جاؤ......"

"کچھ حدت محسوس ہو رہی ہے...... نقاہت ہے......"

ابا میاں سر ہلا کر چلے گئے۔ ان کے دوست کا بیٹا تھا۔

اماں بار بار کہتی تھیں۔ "میری لاڈلی ہے، دیکھ بھال لیں۔ کہتے تھے دوست کی شرافت پر حرف نہیں۔ کیا بیٹا کیا باپ۔"

ایک بار گمنام خط موصول ہوا۔ لڑکا کسی گانے والی کے پیچھے ہے، لکھا تھا۔ ابا میاں نے خط پھاڑ ڈالا کہ کوئی حاسد دشمن ہے، برسوں کا رشتہ ختم کروانا چاہتا ہے۔ الٹا دوست کو خط لکھ دیا کہ تمہارے قریب کوئی

حاسد ہے، ہماری دوستی میں بال لانا چاہتا ہے۔ ابا میاں جانتے تھے وہ ان سے ناراض ہے۔ اتنے سالوں میں بھی وہ اس کی ناراضی ختم نہیں کر سکے تھے۔ اس کا دکھ ختم ہوتا تو ناراضی رخصت ہوتی۔

☆☆☆

گھر کے کچھ کمروں میں رنگ و روغن کا کام شروع تھا۔ سامان احاطے میں رکھا تھا۔ اس نے جھانک کر نیچے دیکھا تو دھڑ دھڑ سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آئی۔

''اسے کیا کرتی ہو.....'' وہ کتنے غصے میں تھی۔ سامان کی طرف اشارہ کیا۔

''جہاں آرا آپ...... آیئے۔''

''اماں کے سامان کے ساتھ کیا کرتی ہو۔ کیوں چھپکلی کی طرح ہر دیوار پر کود پھاند رہی ہو۔ کیا کر رہی ہو۔'' وہ شرمندہ ہوگئی۔

''دیمک لگی ہے۔ دیکھیں ان کی درستی ہو رہی ہے۔''

''درستی یا مرمت؟'' بے ساختگی میں اس نے تصحیح کی۔

''مرمت اور درستی دونوں...... دیکھیں یہ خراب ہو رہا ہے۔'' اس نے ہاتھ سے خرابی کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے جھک کر دیکھا، دیمک لگ چکی تھی۔ سامان خراب ہو رہا تھا۔

''بڑی آپا کو خط لکھا ہے کہ گھر آیئے، انہی کے لیے کمرے تیار کروا رہی ہوں۔ کہہ رہی تھیں سب آئیں گے۔''

وہ اسے اطلاع دے رہی تھی کہ آپا آ رہی ہیں، حویلی کی مرمت کروائی جا رہی ہے، سامان کی درستی ہو رہی ہے۔ آپا اماں بی سے کم نہ تھیں، ایک نیا دردِ سر۔ اس نے ناپسندیدگی سے دلہن کی طرف دیکھا۔

''تم اپنے میاں کے ساتھ آپا کے یہاں کیوں نہیں چلی جاتیں۔''

''آپ چلیں گی ساتھ؟''

''مجھ سے تمہارا کیا یارانہ...... جاؤ میاں سنگ۔''

''میں نے سوچا کہ آپ کی بہن ہیں۔ آپ کا دل لگے گا۔''

''میرے دل کی فکر میں کیوں ہلکان ہو۔ تم نے میرا جینا حرام کیا اس کا کیا؟''

اس کی معصوم آنکھوں میں درد کی لہر گھوم گئی۔ وہ جہاں آرا کا جینا حرام کرے گی۔ وہ تو اس سے محبت کرتی ہے۔ اس طنز نے اس کا معصومانہ اعتماد چھین لیا۔ اس کی پلکیں لرزنے لگیں۔

''مجھ سے غلطی ہوئی مجھے معاف کر دیں جہاں آرا! خفا نہ ہوں۔'' وہ کتنی جلدی معافی مانگ لیتی تھی۔

''آپ کی خوشی کے لیے کیا تھا۔ آپ کی دل جوئی۔''

''میرا دل...... یہ دل...... اس کی دل جوئی نہ ہو سکے گی اب۔''

اس کے سر میں چٹاخ پٹاخ ہوئی۔ وہ واپس سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ دالان کی لمبی کرسی پر ڈھے گئی۔ یہ آپا ہی تھیں جنہیں اس کے اتنے اونچے خاندان میں رشتے پر حسد تھا۔ بار بار جتاتی تھیں کہ ابا میاں نے انہیں تو نچلوں میں بیاہ دیا، جہاں ساس نے مدتوں ناک میں دم کر کے رکھا۔ سکون سے جینے نہ دیا۔ عید تہوار پر ڈھنگ کے لباس کے لیے ترسایا۔ اپنی لاڈلی کے لیے اتنا اونچا خاندان ڈھونڈ نکالا۔

مرمت ہوئی۔ چونا سفیدی تمام ہوئی۔ دروازے لاکھ کی آمیزش سے چمکنے لگے۔ دیمک کی درستی قرار پائی۔ سامان ٹھکانے سے جوڑ دیا گیا۔ احاطے کی سرخ اینٹیں جی اٹھیں۔ مالی کی آمد بڑھ گئی، گھاس کی خاص کٹائی ہونے لگی۔ ایسا لگتا گھاس کا قالین بچھا دیا گیا ہوں۔ اس کا چھوٹا لڑکا قینچی لیے کٹ کٹ کرتا پھرتا۔ نہ جانے اس نے کیا ترکیب کی کہ آپا کی آمد معطل ہوئی۔

''آپ نے ڈاک بھیجنی ہے۔ لایئے دیجیے۔''

وہ اس کے کمرے میں آ جاتی ہاتھ میں خطوط کا

پلندہ پکڑا ہوتا۔ وہ حیرت سے اس کے ہاتھ کے پلندے کی طرف دیکھتی۔

"میرے خطوں کو ہاتھ نہ لگانا...... " خط اس کی پہنچ سے دور کر دیتی۔ تنبیہہ کرتی۔

"ضد نہ کریں۔ خط لائیے۔" وہ ہاتھ بڑھا کر خطوط اٹھا لیتی اور بھاگ جاتی۔

"میری تحریر دیکھیں کیسی ہے۔" ایک دن اپنا خط دکھا کر پوچھنے لگی۔

"میں تمہاری استانی ہوں؟"

"دیکھ کر بتا دیں...... استانی کیوں ہوں گی سہیلی ہیں نا...... " خط اس کے سامنے کیا۔ اتنا طویل خط تھا، پوری داستان لکھی تھی۔

"آداب خالہ بی! آپ کی طبیعت ناسازی کی اطلاع ملی، پریشانی سے دل بیٹھ گیا، آپ پرہیز میں غفلت نہ کیجئے، اگر ڈاکٹر پان چھوڑنے کے لیے کہتے ہیں تو دو چار دن کر لیجئے جان سے بڑھ کر کیا ہے۔ حلق میں زخم ہیں آرام رہے گا، اتنی ضد نہ کیجئے، بزرگوں کا سایہ......"

اس نے پہلی چند سطریں پڑھیں اور اس کا دل چاہا کہ وہ اس ننھی دلہن کے سر پر کتاب دے مارے۔

"یہ اتنا لمبا خط تم نے خالہ بی کو لکھا ہے؟"

وہ شرما گئی۔

"انہوں نے کہا تھا مکمل احوال لکھ کر بھیجا کرنا، ہم بوڑھوں کے پاس اور ہوتا ہے کیا ہے، سلام دعا کر کے سب کھسک جاتے ہیں۔ گھڑی بھر پاس نہیں بیٹھتے۔ کچھ تم ہی دکھ سکھ کہہ لینا۔ وعدہ لے کر گئی تھیں۔"

"اتنا طویل وعدہ نبھایا ہے تم نے، کتنے مہینوں میں یہ خط مکمل کیا ہے؟" اس نے کئی صفحات پر مشتمل خط کو اپنے سامنے پھیلا لیا۔

"بڑھاپے میں جوان لوگوں کی توجہ بہت بڑا سہارا ہوتی ہے۔" وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔

یعنی اس کے ہاتھ میں جو خطوں کا پلندہ تھا وہ بھی ایسے ہی ہوں گے۔ وہ سب کے دل رکھتی ہوگی۔ طویل داستانیں لکھتی ہوگی۔

"یہ خط چھوٹی کو لکھا ہے، پڑھائی میں توجہ نہیں دیتی، بھیل کو دکر وا لیں محترمہ سے۔ یہ منجھلے بھائی کو، وکیل بن رہا ہے، ابا بتا رہے تھے سنیما جانے لگا ہے۔ دوستوں کی بہت سنتا ہے۔ یہ بوا کی لڑکی کے لیے، اس کی اس برس شادی ہے۔ یہ ماموں جان کی بیمار پرسی کا خط، ریٹائرڈ ہوئے ہیں، ممانی بتا رہی تھیں چڑچڑے ہو گئے ہیں کہتے ہیں میں بے کار ہو گیا۔ میں نے لکھا ہے ماموں جان! بے کاری کا آپ نے کیسے سوچ لیا۔ خاندان کی کوئی شادی ایسی نہیں گزری جو آپ کی نگرانی میں خوش انجام نہ رہی ہو۔ سب آپ کی طرف دیکھتے ہیں کہ آپ ہوں گے تب ہی شادی کے انتظامات خوش اسلوبی سے طے پائیں گے۔ چچی حج پر جا رہی ہیں، مجھے پیار اور دعائیں لکھ کر بھیجی تھیں۔ میں نے کہا حجاز پاک جا کر ہمارے لیے خاص دعا کیجئے گا، ہمیں بھی حاضری کی سعادت نصیب ہو۔ اور یہ ہمسائے کی لڑکی ہے مجھ سے اردو پڑھنے آتی تھی اب ماشاءاللہ انٹرنس کر رہی ہے، علی گڑھ جا رہی ہے۔ کہتی ایسا لگتا ہے میں انگلستان جا رہی ہوں۔ ایسی خوشی ہوئی مجھے......"

وہ کتنا بولتی تھی۔ وہ یک ٹک اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے سر کو خم دے کر دروازے کی طرف اشارہ کیا کہ تشریف لے جائیں محترمہ! کیوں میرا سر کھاتی ہیں۔ وہ میز سے خط اٹھا کر چل دی۔ برا نہیں مانتی تھی۔ جانے کس مٹی کی بنی تھی۔ آئے دن خطوط کے پلندے لکھتی، اور ڈھیر خطوط وصول پاتی۔ تخت پر بیٹھ کر پڑھتی، ہنستی، پھر فوراً جواب لکھنے بیٹھ جاتی۔ اس کی ڈاک آتی تو اس کے کمرے میں دینے آتی تھی۔ بلکہ وہ اس کے کمرے میں آنے کا، اس سے بات کرنے کا کوئی عذر نہیں چھوڑتی تھی۔

اس کے رسالے الٹ پلٹ کر کے دیکھتی، کتابوں کی ورق گردانی کرتی۔ کوئی شعر پڑھ کر سناتی۔ کسی سطر پر کھلکھلا دیتی۔ جہاں آرا جواب دیتی نہ دیتی، وہ بات کیے جاتی۔ کچھ نہ کچھ آ کر کہہ جاتی۔

شروع میں وہ چڑ جاتی تھی، پھر اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ کبھی کسی بات کا جواب دے دیتی تھی، کبھی وہ اکیلی بولتی رہتی تھی، اور وہ کان بند کر لیتی تھی۔

"جہاں آرا! رنگ ساز آیا تھا......" ایک دن کمرے میں آ کر بتانے لگی۔ وہ نا سمجھی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"قریب ہی کسی گھر میں کام کر رہا تھا، ان کے یہاں مرگ ہو گئی۔ کام درمیان میں رہ گیا، کہتا ہے محلول سامان سب بگڑ جائے گا۔ ضرورت مند آدمی ہے، کسی شادی میں شرکت کے لیے دوسرے شہر جانا ہے، خرچ کے لیے پریشان ہے۔ درخواست کر رہا تھا کہ اگر حویلی کا یہ حصہ کروا لیں۔ آپ کا کمرا دالان ......"

"نہیں......" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"غریب آدمی ہے۔"

"امداد کر دو......"

"کما کر کھانے والے امداد نہیں لیتے جہاں آرا! اچھا نہیں لگے گا۔ اس کی عزت نفس کو زک پہنچے گی۔"

"میرے سر سوار ہونا اچھا لگتا ہے۔" وہ چڑ گئی۔

"ایک بار سوچ لیجیے۔ آپ کے سامان کو کچھ نہیں ہوگا، کتابیں میں اٹھا کر رکھوں گی۔ اگر کوئی نقصان ہو تو میرا سر آپ کی سزا......"

"تمہارے سر کا میں کیا کروں گی۔"

"دل بہلا لیجیے گا۔ کھیل لیجیے گا۔ میرا سر آپ کو اچھی اچھی باتیں سنائے گا۔" وہ شرارت سے ہنسی۔

"جب سے تم آئی ہو میرے سر کا درد بڑھ گیا ہے۔"

"آپ بتاتی ہی نہیں...... لائیے میں دبا دوں۔" وہ فوراً آگے بڑھی۔ اس نے سر پیچھے گھما لیا۔

"دبانے دیجیے درد چلا جائے گا۔"

"درد ایسے نہیں جاتے۔" اس نے کہہ دیا۔

"چلے جاتے ہیں جہاں آرا! بنجر زمینوں پر بھی تو پھول پودے نکل آتے ہیں۔"

"ہر بارش بنجر کو سیراب نہیں کرتی۔"

"ہر بارش نہیں کرتی لیکن کوئی ایک بارش ضرور کر دیتی ہے۔ زمین کے ہر ٹکڑے کے نصیب میں بہار لکھ دی گئی ہے۔"

لمبی مدت سے خزاں جینے والے بہار سے نا امید ہو جاتے ہیں۔

خالہ بی نے کہا ہو گا کہ اس کا کمرا بھوت بنگلہ بنا ہے جا کر سمیٹو۔ اسے غصہ تھا کہ دونوں مل کر اس پر دباؤ ڈال رہی ہیں۔

"جہاں آرا! میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں آپ سے جھوٹ بول کر آپ کی بے عزتی نہیں کر سکتی۔ آپ صرف سچ کے لائق ہیں۔ میں یہ چاہتی تھی کہ سارے گھر میں رنگ و روغن ہو چکا ہے تو یہاں بھی ہو لیکن آپ کی خفگی کے خیال سے آپ کو پریشان نہیں کیا۔ میری کسی بات سے آپ کو رنج پہنچے مجھے یہ گوارا نہیں ہے۔ مجبور رنگ ساز آیا اپنی عرض پیش کی تو میں نے سوچا کہ میں اپنی جہاں آرا کو سمجھا کر دیکھتی ہوں وہ ضرور سمجھ جائیں گی۔"

"اپنی جہاں آرا......" اس نے اتنی پریت سے کہا کہ وہ اس کی لمبی پلکوں والی بچوں جیسی آنکھوں کو دیکھ کر رہ گئی۔

"آپ صرف سچ کے لائق ہیں۔"

اس بھوت کمرے سے کئی بھوت نکل بھاگے۔

جب سے گھر میں نئی دلہن آئی تھی بھوتوں کی اس کے ساتھ بن نہیں رہی تھی۔ ان کا بوریا بستر سمیٹ دیا گیا۔ ایک جھوٹ نے اس کی زندگی تباہ کر دی تھی، وہ کہتی تھی وہ صرف سچ کے لائق ہے۔

"چونے سفیدی کی ہی تو بات ہے اس میں کیا پانی پت کا محاذ کھولنا۔ کرنے دیجیے، آپ نیچے اماں بی کے کمرے میں آ جائیے۔"

"نہیں......" اس نے سختی سے منع کر دیا۔

☆☆☆

وہ اماں بی کے کمرے میں آ گئی۔ اس کا کمرا

دالان، اوپر کی ساری منزل کی تکان اتر گئی۔ طوفان کے آثار معدوم ہو گئے۔ ہر چیز پر نیا رنگ چڑھ گیا۔ دھول مٹی، دکھ، سسکیاں، آنسو، شکایتیں، ناراضی، سب کو اتار پھینکا گیا۔ کھڑکیوں کی چوکھٹیں چمکنے لگیں، دروازے مانو نئے ہو گئے۔ کونے کونے کی صفائی ہو گئی۔ ہر کمرے کو کھول کر ایک ایک چیز کو دھوپ لگوائی گئی۔ ہر شے کی درستی کی کوشش رہی۔ اور پھر ہر چیز ٹھیک واپس اس کی جگہ پر رکھ دی گئی۔

رات کے کھانے کے لیے وہ اماں کے کمرے سے نکل کر باہر آ گئی۔ اس کے لیے کرسی لگی تھی، وہ جا کر بیٹھ گئی چار نوالے کھا کر لوٹ آئی۔ اسی رات اماں کے بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ صبح کسی وقت آنکھ لگی۔ دیر سے جگی۔ کمرے میں جا بجا یاسمین کے پھولوں کا ڈھیر رکھا تھا۔ سارا کمرا مہک رہا تھا۔ کھڑکیوں سے روشنی چھن چھن آتی تھی۔ دھیمی آوازوں کا ہنگامہ تھا۔ زندگی کی رونق پر بہار کا غلاف تھا۔ ایسا لگا وہ ڈراؤنے خواب سے بیدار ہوئی ہے۔ ہر چیز پہلے جیسی ہو گئی۔ ابھی اماں کی آواز آئے گی۔ وہ دروازہ کھول کر اسے جگائیں گی۔

کمرے کا دروازہ بے آواز کھلا، نئی دلہن کی جھلک دکھائی دی۔

”آپ جاگ گئیں۔“ وہ بڑھ کر آگے ہوئی۔ جھک کر پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

”میں گھبرا گئی کہ بخار نہ ہو۔“

اس کا پیشانی پر رکھا ہاتھ اور اماں کا بستر، اسے نئی زندگی میں پرانا احساس دے گیا۔ جہاں آرا کی خفا نظر، دلہن کی چاہت بھری نظر سے جا ملی۔

”میں ناشتے کا کہتی ہوں......“

”مجھے نہیں کرنا۔“ منہ پھلا لیا۔ اٹھ کر بیٹھ گئی، بال سمیٹنے لگی۔

”تھوڑا سا کر لیجیے۔“

”کہہ دیا نہیں کرنا...... نہیں کرنا۔“

”تھوڑا سا کرنا پڑے گا، میں آپ کے انتظار میں بھوکی بیٹھی ہوں۔“ خالہ بی اسے اچھا رعب سکھا گئی تھیں۔ ناشتے کی تپائی بھی وہ خود ہی لائی تھی۔

”میں تمہارے ساتھ نہیں کروں گی۔“ وہ دونوں کا ناشتہ لائی تھی۔

”جو حکم......“

وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ دالان کے تخت پر بیٹھ کر کھانے لگی۔ وہ کھلے دروازے سے اسے ناشتہ کرتے دیکھتی رہی۔ دن چڑھ آیا تھا اور وہ اس کے انتظار میں بھوکی بیٹھی تھی۔

ناشتے کے بعد وہ باہر نکلی۔ دلہن تخت پر بیٹھی منہار کی لائی چیزیں دیکھ رہی تھی۔ گھر کی ساری خادمائیں آس پاس براجمان تھیں۔ منہار پورا مینا بازار کھول کر بیٹھا تھا۔ کنیز چوڑیاں لے چکی تھی اور اپنی ماں کو اپنی چیزیں دکھا رہی تھی۔

”اپنا سامان سنبھال لیجیے۔“ سلیقے سے ان سے عرض کی۔ ان کے دانت اندر نہیں ہوتے تھے۔ اس نے انہیں ان کی من پسند چیزیں لے کر دی ہوں گی۔

”جہاں آرا! آ جائیے۔“ اس پر نظر پڑتے ہی اصرار سے کہا۔

”مجھے دلچسپی نہیں۔“ وہ واپس کمرے میں جانے لگی۔

”دو گھڑی آ جائیے۔ مجھے مشورہ درکار ہے۔ بتا دیں کیا کیا لوں۔“

”میرے مشورے کی کیا حیثیت۔“ وہ اماں سے ایسے ہی کہا کرتی تھی۔

دلہن محبت سے مسکرا دی۔ ”آزما لیجیے۔“ وہ جا کر تخت کے کنارے بیٹھ گئی۔

”یہ کاجل دیکھیں نیا آیا ہے۔ فرنگن کو بیچ کر آ رہا ہوں وہ اس پر ایسا نثار ہوئیں کہ پورے تین لیے ہیں۔“

”فرنگی عورتیں کب سے کاجل لگانے لگیں۔“ جہاں آرا ہنس ہی تو دی۔

”جب سے ہندوستان آ کر ہمارے مسالے کھانے لگیں۔“ اس نے دانت نکالے۔

”تمہیں بنگلے میں گھسنے کس نے دیا۔“

''رزق کمانے کی جرات ہے! ہم ہر جگہ گھس جاتے ہیں۔ ان کی چھوٹی لڑکی چوڑیاں پہن کر خوشی سے کھیل کود کرنے لگی۔ مجھے ملکہ وکٹوریہ کا سکہ دے رہی تھیں میں بولا، اس کا کیا کروں گا ہنسنے لگیں۔ بتا رہی تھیں بچی بیمار تھی، تمہاری چیزیں دیکھ کر کھل اٹھی یہ لو بخشش۔''

اسے فرنگی کی لڑکی اور اماں کی لڑکی کی کہانی ایک جیسی لگی۔ لڑکی بیمار تھی، لڑکی کھل اٹھی۔ دلہن نے رنگ رنگ کی چوڑیاں لی تھیں۔ جیسے وہ خطوں کے پلندے لکھتی تھی ویسے ہی چوڑیوں کا بھی کچھ کرنا ہوگا۔ آپا کی لڑکیوں کو بھیجے گی، خالہ بی کی نواسیوں کو۔ اپنی چھوٹی بہن کو۔ خدا معلوم کس کس کو۔

منہار نے ایک چھوٹا سا آئینہ دکھایا۔ اس نے بادل ناخواستہ آئینہ تھام لیا۔ اسے اپنی طرف گھمایا تو حویلی کی لاڈلی جہاں آرا کو بیمار پایا۔ بدصورت جہاں آرا۔ بھوت جہاں آرا۔ اس نے جلدی سے اسے پلٹ دیا۔ آئینے کی پشت پر فرنگی عورت کی تصویر چھپی تھی۔ آئینے میں دیکھ کر اپنے بال سنوار رہی تھی۔

''یہ کیا ہے......'' وہ منہار سے پوچھنے لگی۔ وہ نا سمجھی سے تخت پر بیٹھی بی بی کی طرف دیکھنے لگا۔ دلہن نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دبا ڈالا۔

''معصوم آدمی ہے وہ کیا جانے یہ کیا ہے۔ جانے دیں۔''

وہ دلہن کے اشارے پر چپ ہوگئی۔ اب وہ بے چارہ کیا جانے کہ ہندوستان کی دو عورتوں کو تو عزت نصیب ہے لیکن فرنگی عورت کو بے حیا سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان کی خاتون پردے میں تھی، ناری گھونگھٹ میں، بچی فرنگی عورت اسے بے پردہ کرنا آسان تھا۔ کسی رسالے سے تصویر اتار کر چھاپ دی۔ اس فرنگن کو معلوم بھی نہیں ہوگا کہ وہ ہندوستان کے سرخی پوڈر کے ڈبوں پر چھپ کر گھر گھر پہنچ چکی ہے۔ شریف بیبیوں اور پوتر دیویوں کے درمیان وہ اکیلی بے شرم مانی جاتی ہے اس لیے اس کی تصویر اٹھا کر کہیں بھی چھاپ دی جاتی ہے۔

''اپنا ہاتھ ادھر لائیے۔'' وہ اس کے ہاتھ کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ وہ سختی سے اس کی طرف دیکھنے لگی اور پھر اٹھنے لگی کہ اس نے اس کی کلائی تھام لی۔

''یہ والی پہنا دیجئے، ہم دونوں کی ایک جیسی ہو جائیں گی۔ مجھے بہت شوق تھا کہ میری بہن بھی ہو اور دونوں ہم رنگ چوڑیاں پہنیں۔''

جہاں آرا کی کلائی دلہن کے ہاتھ میں تھی، وہ محبت سے کہہ رہی تھی۔ باغ کی طرف کنیز کھڑی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی جہاں آرا کیا کرے گی۔ جہاں آرا ہاتھ کھینچنے سے باز رہی۔ دونوں کی کلائیوں میں ہم رنگ چوڑیاں بہار دکھانے لگیں۔ دلہن نے جہاں آرا کی کلائی کے ساتھ اپنی کلائی جوڑ چھنک کر کہا۔

''کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔''

☆☆☆

وہ جہاں آرا کے پاس عجلت میں آئی تھی۔ جہاں آرا اپنی لکھنے کی میز پر بیٹھی کانٹ چھانٹ کر رہی تھی۔

''جہاں آرا......'' اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ حویلی کے سارے بھوت شاید نکل بھاگے تھے لیکن دلہن کا بھوت چھوڑ گئے تھے۔ ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتی تھی۔

''آج رات کسی عقیقے کی تقریب میں جانا ہے۔'' وہ کتنا گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ دراز سے قلم نکال کر ترتیب سے میز پر رکھنے لگی۔

''کہہ گئے ہیں اپنی تیاری دیکھ لینا۔ پہلے کبھی ایسے نہیں کہا۔ شام ڈھل آئی ہے، کوئی وقت نہیں جاتا مجھے پیغام بھجوا دیں گے۔ مجھے کچھ بھائی نہیں دے رہا میری مدد کر دیں۔''

''کیسی مدد......''

''کیسی تیاری دیکھوں؟ کیا کروں؟'' جہاں آرا کو اس کی پریشانی پر ہنسی آ گئی۔ بھائی صاحب اسے پہلی بار کہیں لے جا رہے تھے۔ ضرور کوئی خاص

جہ ہوگی۔
"بھائی صاحب نے فنکشن کا کہا؟"
"ہاں ... فنکشن منگوائی ہے۔ کہہ گئے ہیں۔"
"تم نواب واجد سلطان کے یہاں لے جا رہی ہو ان کے کسی پوتے کے عقیقے کی تقریب ہو گی۔ وہاں نواب بیگمات ہوں گی۔ بھائی صاحب کو خاص دلہن رانی کے لیے کہا ہوگا۔ بج سنور کر جانا ورنہ بیگمات تمہیں معاف نہیں کریں گی۔" اس نے اسے اور ڈرا دیا۔
"کیسے.....؟"
"دلہن ہو اپنی بہترین پوشاک پہن لو۔"
"کون سی......"
"چاند سے ابھی زمین پر اتری ہو۔ بجنا سنورنا نہیں جانتیں؟"
"جہاں آرا! آپ جانتی ہیں میں چھوٹے گھر سے ہوں، میں کبھی فنکشن میں نہیں بیٹھی، ہمارے کوئی نواب رشتے دار نہیں ہیں۔ کبھی کسی نواب بیگم سے ملاقات نہیں ہوئی۔ مجھے اپنی چنداں پروا نہیں لیکن ان کی سبکی نہ ہو۔ میرے ساتھ چلیں میری مدد کریں۔ مجھے لباس زیورات کا بتادیں۔"
وہ بادل ناخواستہ اس کے ساتھ نیچے آئی۔ اس نے کام دار لباس بستر پر پھیلا دیے تھے۔ جہاں آرا نے دیکھے تو اسے بالکل پسند نہیں آئے۔ اماں اس کا پہننا اوڑھنا ایسا کر گئی تھیں کہ اس کی ناک پر عام چیز نہیں ٹھہرتی تھی۔ دلہن کبھی پشواز اپنے ساتھ لگاتی تھی کبھی غرارے کی طرف ہاتھ بڑھاتی تھی، کبھی کرتے پاجامے کی طرف دیکھتی تھی۔ بے چاری رو دینے کو ہی تو تھی۔
وہ اماں کے کمرے میں آئی۔ سنگھار میز کی دراز سے چابی نکالی اور جہاں آرا کو لے کر اوپر آ گئی۔ لمبی راہداری پار کر کے دوسری طرف کے بڑے کمرے میں نکل گئی۔ یہاں اس کے جہیز کا کچھ سامان رکھا تھا۔ بڑے صندوق بھی تھے۔ یہ سب اس کی شادی سے پہلے کا سامان تھا۔ اماں کے ہاتھ سے بنی ایک ایک چیز ان صندوقوں میں تہہ بند تھی۔ اس نے ایک بڑے صندوق کو کھولا۔ ململ کے کپڑے میں اس کا کام دار کرتا اور کھڑا دوپٹہ سلیقے سے تہ کیے رکھے تھے۔ وہی دوپٹہ جس کی دھوم تھی۔ اماں ایک ایک کپڑے کو سفید ململ میں تہ لگوا کر رکھواتی تھیں۔ ان کی بنی کی چیزیں خراب نہ ہوں۔ اس نے کھڑا دوپٹہ اٹھالیا تو جیسے کئی گرم سانسیں اس کے سینے میں طوفان برپا کر گئیں۔ اسے پہناوے کو پہننے کے دن بے فکری کے دن تھے۔ وہ اٹھلائی پھرتی تھی۔ وہ خوشی اور بے خودی کے دن تھے۔
اسی لیے وہ ان کمروں میں نہیں آتی تھی۔ ماضی تکلیف دہ تھا۔ اس نے ہمت کر کے دوسرا ضروری سامان نکال کر دلہن کے ہاتھ پر رکھا اور صندوق بند کر دیا۔
"یہ پہن لو......" اس کی آواز میں نمی تھی۔
"یہ کیا ہے......" وہ دیکھ رہی تھی کہ جہاں آرا کی آنکھیں نم ہیں۔
"کرتا پاجامہ اور کھڑا دوپٹہ......نواب بیگمات پہنے ہوئے ہوں گی تم بھی پہن لو۔"
"میں نے کبھی کھڑا دوپٹہ نہیں لیا۔ میرے ساتھ آیئے میری مدد کر دیجیے۔" وہ پھر رو دینے کو ہو گئی۔
"تمہیں ساری دنیا کے کام آتے ہیں یہ کام نہیں سیکھا۔"
"نہیں......میرا یقین کیجیے نہیں۔" صاف گوئی سے بتایا۔
وہ اسے اماں بی کے کمرے میں لے آئی۔ کھڑے دوپٹے کو سلیقے سے بنایا، جمایا۔ اسے آئینے کے سامنے بٹھا کر اس کے بال گوندھے۔ مناسب زیور الگ کر کے دیے جو اس نے پہن لیے۔ تیاری مکمل ہوئی تو دلہن حیران خود کو دیکھتی رہ گئی۔ شاید اس نے آج جانا تھا کہ اچھا پہناوا حسن کو چار چاند لگا دیتا ہے۔
"آپ صرف خط ہی خوب صورت نہیں

لکھتیں۔'' وہ جانے لگی تو اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
''آپ کتنی اچھی ہیں جہاں آرا!'' دیر تک اس کا ہاتھ سہلاتی رہی۔
''کمر سیدھی رکھنا، تسلیمات میں تہذیب رکھنا، بیگمات نازک مزاج ہوتی ہیں، ایک بار تمہیں ناپسند کیا تو دوبارہ کبھی ان کی ناک پر نہیں چڑھ سکوگی۔ بہتر ہے کم بولنا، خاموشی انسان کی عزت رکھ لیتی ہے۔ تکرار سے اجتناب کرنا۔ تمہاری مسکراہٹ اچھی ہے اسی سے کام لینا، پہلی بار جا رہی ہو، تمہیں منہ دکھائی دیں گے قرینے سے قبول کرنا۔''
وہ توجہ سے سنتی رہی۔ خوشی سے سر ہلاتی رہی کہ جہاں آرا اس سے مخاطب ہے۔ اسے نصیحت کر رہی ہے۔ شام گہری ہوتے ہی اسے پیغام بھیجا گیا۔ وہ فٹن میں بیٹھ کر چلی گئی۔ وہ پہلی بار فٹن میں بیٹھی تھی، پہلی بار کھڑے دوپٹے میں سجی سنوری تھی، پہلی بار کسی نواب کے گھر کی تقریب میں شریک ہو رہی تھی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی لیکن اس میں یہ خوبی قابلِ ستائش تھی کہ بڑے بڑے سے لمحے کا خیر مقدم کرنا جانتی تھی۔

☆☆☆

رات کے اندھیرے میں ابھی صبح کی روشنی گھلی ہی تھی کہ وہ اس کے کمرے کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا وہ کود کر اندر آ گئی۔ اس کی لکھنے کی میز پر اپنی چیزیں پھیلا دیں۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر چہکنے لگی۔
''دیکھیں مجھے کتنی سلامیاں ملی ہیں۔ سب کہتے تھے حویلی کی نئی دلہن بہت خوب صورت ہے۔ مجھے خاص طور پر تخت پر بٹھایا۔ سب مجھ سے باتیں کرتی تھیں ہنستی تھیں، حالِ احوال پوچھتی رہیں۔ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئیں جہاں آرا۔''
وہ اس کا پہنا ہوا لباس سلیقے سے تہ لگا کر واپس کرنے آئی تھی۔
''نواب بیگم نے میری بلائیں لیں۔ دیکھیں مجھے منہ دکھائی میں اتنا کچھ دیا ہے۔'' اپنی سلامیاں دکھانے لگی۔ وہ انہیں پسند آ گئی تھی۔

''یہ تم رکھ لو...... تمہارا ہے۔'' بے پناہ خوشی کے احساس سے اس کا چہرہ پھر کھل اٹھا۔
''آپ مجھے تحفہ دے رہی ہیں اتنا پیارا میری کتنی تمنا تھی۔''
''یہ تم پر بہت اچھا لگ رہا تھا۔'' [illegible]
''یہ آپ پر مجھ سے زیادہ اچھا لگتا ہوگا۔''
''جاؤ اور اب میرا سر نہ کھاؤ۔ مجھے تنگ نہ کیا کرو دلہن!''
''میں تنگ نہیں کروں گی۔ باقی سب کروں گی۔'' ایڑی کے بل گھوم کر وہ کہہ گئی۔ بچوں کی طرح اچھلتی ہوئی دالان میں بھاگنے لگی۔ وہ اس کے لیے ایک یادگار رات تھی۔ اماں کی زندگی میں اگر یہ نئی دلہن آ جاتی تو شاید وہ چار دن جی جاتیں۔ شاید وہ انہیں سنبھال لیتی کہ ان کے دکھ پی جاتی۔ نئی دلہن کتنا کچھ کر لیتی۔ وہ گھر میں آنے والی ایسی روح تھی، جس کی آمد سے گھر میں پھیلی اماوس کی رات، صبح اجالے میں بدل رہی تھی۔

☆☆☆

گرمیوں کی طویل دوپہریں ڈھل جاتیں ٹھنڈی شامیں نکھر آتیں۔ پھول پودوں کے پاس کرسیاں لگا دی جاتیں۔ بھائی صاحب اخبار سے چن چن کر جانے کیا کچھ پڑھ کر سناتے رہتے کہ دلہن کے قہقہے اسے اوپر تک سنائی دیتے تھے۔ ایک بار اسے کشمیر کی سیاحت کے لیے لے گئے تھے۔ بھائی صاحب خود پندرہ برس سے کشمیر نہیں گئے تھے۔ وہ کشمیر سے کیا ہو کر آئی مانو انگلستان گھوم آئی ہو۔ اور جو اس کے سامان سے خاندان بھر کے لیے تحائف برآمد ہوئے، کیا عمرو عیار کی زنبیل سے برآمد ہوتے ہوں گے۔ جہاں آرا کے لیے کیا کچھ نہیں لائی تھی۔
''انہیں لے جاؤ میرے کام کی چیزیں نہیں ہیں یہ۔'' اس نے بے اعتنائی سے کہا۔
''رکھ لیجیے محبت سے لائی ہوں۔''
''تمہارا میرا محبت کا ناطہ کب سے ہے؟''
''جب سے میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا

ہے۔ آپ نے شمع دان ہاتھ میں تھام رکھا تھا، اگر خالہ بی سے پہلے میں کمرے میں آ جاتی تو آپ مجھے دے مارتیں۔ میری آنکھ پر پیدائشی نشان ہے، پھر پیشانی پر بھی بن جاتا۔ جہاں آرا کی طرف سے ملنے والی منہ دکھائی۔'' وہ ہنستے ہنستے بتا رہی تھی۔

''تم ہر بات سے اپنی مرضی کا مطلب نکال لیتی ہو۔''

اس نے سر ہلا دیا۔ ''ہر بات سے اچھا مطلب نکال لیتی ہوں۔''

''تم اس حویلی کی سب سے بری چیز ہو۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔

''لیکن آپ اس حویلی کی سب سے شان دار انسان ہیں۔ میری چھوٹی بہنوں کو کتنی تمنا ہے آپ سے ملنے کی۔''

''میری برائیاں لکھتی ہوگی۔''

''جس دن اچھائیاں ختم ہو گئیں اس دن سے لکھوں گی۔'' آنکھیں مٹکائیں۔

حویلی کی ہر شے بدل گئی تھی، نئی دلہن کی ساتھ نئے رنگوں میں بدل گئی تھی لیکن ایک جہاں آرا تھی جو اوپری منزل سے نیچے نہیں آئی تھی۔ گھنٹی بجا کر کھانا منگواتی، بغیر کھائے واپس بھجوا دیتی، دنوں کسی کو کمرے میں گھسنے نہ دیتی۔ جی میں آتا تو کنیز سے چار باتیں کر لیتی، نہ کرتی تو دنوں نہ کرتی۔ گرم موسم اختتام پذیر ہوا تو اوپری منزل کے بھوت واپس آنے لگے۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلنے میں نہیں آتا تھا۔ ابا میاں بتا رہے تھے جب موسم بدلتے تو بیماری کی شدت بڑھ جاتی تھی۔

... کون سی بیماری؟

یہی دل و دماغ کے بھوت۔ یہ ناچنے کودنے لگتے ہیں۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتیں۔ ایسا لگتا کوئی دیوانی لڑکی ہے، کسی کو بھی نوچ کھائے گی۔ کئی دن گزر جاتے تھے اس کی شکل دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ کمرے میں جانے کی کوشش کرتی تو خفا ہوتی۔ چلا اٹھتی۔ ابا میاں نے کہا زیادہ تنگ نہ کرو، بیمار پڑ جائے گی۔ یہ اس کی ماں کی رحلت کے دن ہیں، اسے غم منانے دو۔

''وہ کب تک ایسے رہیں گی۔'' دلہن افسردہ ہو جاتی۔

''وہ کسی کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اپنے نصیب کو بھی۔'' ابا میاں ٹھنڈی سانس بھر کر کہہ دیتے۔

لیکن اس نے اپنی کوشش نہیں چھوڑی تھی۔ کھانا لے کر جاتی، کمرا کھلوانے کی سعی کرتی۔ اس کا چھوٹا بھائی اسے ساتھ لے جانے آیا تھا، ماموں زاد بہن کی شادی تھی۔ وہ کئی بار جہاں آرا کے پاس آئی کہ اسے بتا سکے کہ وہ اپنے میکے جا رہی ہے، کرتے کرتے رخصت کا وقت ہو گیا۔ شانوں پر چادر پھیلائے سر پر دوپٹہ جمائے وہ آخری کوشش میں جہاں آرا سے ملنے آئی۔ دروازہ بند تھا، کتنی دیر تک کھڑی آوازیں دیتی رہی۔ ناچار کنیز کی مدد سے روشن دان سے جھانک کر دیکھا کہ ایسی بھی کیا ناراضی۔ وہ بستر پر سو رہی تھی۔ دن ڈھل چکا تھا یہ وقت نہیں تھا سونے کا۔ اس کا دل پریشان ہوا۔ جلدی سے ملازم بلوا کر دروازہ کھلوایا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ لپک کر بستر تک گئی، جہاں آرا کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ وہ تیز بخار میں جل رہی تھی۔

''جہاں آرا اٹھیے...... جہاں آرا!''

وہ رو رہی دی۔ حویلی میں بھاگ دوڑ ہوئی۔ کنیز آ رہی ہے، پانی لا رہی ہے، اس کی پٹیاں ہو رہی ہیں۔ فرنگی ڈاکٹر بلوایا، اسے زبردستی دوا دی۔ سرہانے بیٹھی سر دبا رہی ہے۔ بار بار بخار کی جانچ ہو رہی ہے۔ ابا میاں آئے کرسی پر بیٹھے رہے۔

''چلو آپا! گاڑی کا وقت نکلا جا رہا ہے۔'' بھائی کئی بار کہہ چکا تھا۔

''تم لوٹ جاؤ۔ اماں سے کہنا میں جہاں آرا کے ساتھ آؤں گی۔ ماموں کو خط لکھ کر معذرت کر لوں گی۔''

تیز بخار کی غنودگی میں سرہانے بیٹھے دلہن کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کرتے ہوئے جہاں آرا نے یہ

جملہ سنا۔ وہ کیسے جانتی تھی کہ جہاں آرا زندہ رہے گی۔ اس کے ساتھ جائے گی۔ وہ اتنا یقین کیوں رکھتی تھی کہ اس تیز بخار سے وہ رحلت نہیں فرما جائے گی۔
کتنے ہی دن اس کی بیماری میں بیت گئے۔
ایک رات وہ پسینے میں بھیگ گئی۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی تو پلنگ کے کنارے پڑی دلہن اس کی طرف لپکی۔ پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ کلائی کو تھام لیا۔
''بخار کا زور ٹوٹ گیا...... بخار جاتا رہا۔'' اس کی آواز میں خوشی کی لرزش تھی۔
جہاں آرا نے خود پر جھکی لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ کتنی پریشان تھی۔ وہ کتنی خوش تھی۔
''دیکھو جہاں آرا! تم نے ہم پر ظلم کیا، دوبارہ ایسا نہ کرنا!''
اس کی ہتھیلی کو اٹھا کر اس نے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس کی ماں بار بار اس کی پیشانی اور ہاتھ چومتی تھی۔ یہ کیسی لڑکی تھی اس کی بھاوج تھی، اس کی سہیلی بننا چاہتی تھی اور اس کی ماں جیسی ممتا رکھتی تھی۔
نئی دلہن کتنی عجیب تھی۔

☆☆☆

اس کا بخار ٹوٹا وہ اسے نیچے اماں کے کمرے میں لے آئی۔ پھر دلہن نے اسے دوبارہ واپس نہیں جانے دیا۔ وہ اس کا منہ ہاتھ دھلواتی، اس کے بال بناتی۔ اس کی کمزوری بڑھ گئی تھی، صبح فجر کے بعد اسے باغ میں چہل قدمی کرواتی۔ اس کے کانوں میں یاسمین کے پھول پرو دیتی۔ اسے اپنے ہاتھ سے کھلاتی۔ محبت کرنے والا دل سارا جہاں بدل دیتا ہے۔ جیسے دل توڑنے والا ہر خواب توڑ دیتا ہے، محبت دینے والا ہر خواب واپس جوڑ دیتا ہے۔
اماں کے سنگھار میز پر گرا کر دشیشے کا پردہ ہٹا دیا گیا۔ جہاں آرا اس آئینے کے سامنے بیٹھ کر بال سنوارتی۔ ایک دن وہ اس کے سارے صندوق نیچے اٹھوا لائی۔ کپڑوں کو دھوپ لگوائی، اس کے چنے ہوئے دوپٹے نکالے۔ بزاز بلوایا نئے رنگ لیے، درزی بلوا کر اپنی نگرانی میں کپڑے سلوائے۔ دلہن کے ساتھ جا کر فلم دیکھی۔ بھائی کو خالی ہاتھ بھیجا تھا کہ جاؤ ہم جہاں آرا کے ساتھ آئیں گے۔ جہاں آرا اس کے ساتھ میکے گئی۔ چار سال کی مدت میں یہ اس کا پہلا سفر تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ چھوٹے گھر سے ہے، لیکن وہ یہ بتانا بھول گئی کہ وہ بڑے لوگوں میں سے ہے۔
اس کی لکھنے کی میز اماں کے کمرے میں آ گئی۔ وہ میز پر لکھتی پڑھتی اور دلہن کو حویلی میں چلتے پھرتے ہوئے دیکھتی۔ دونوں مل کر رسالے پڑھتیں، کہانیوں پر تبصرے کرتیں، شاعری کہتی سنتیں۔ وہ جہاں آرا کے لکھے خط پڑھتی، اس کا سر کھاتی، اعتراض اٹھاتی۔ عصمت کے رسالے الٹتی پلٹتی، نیا سے نیا نکتہ نکالتی۔
''رسالے پر لکھا ہے۔ شریف ہندوستانی بیبیوں کے لیے۔ لفظ شریف لکھنے کی ایسی کیا مجبوری تھی؟''
جہاں آرا بڑے دل سے ہنسی تھی۔ ''اچھا سوال ہے...... اور کچھ؟''
''پہلے شریف ہونا ہوگا پھر پڑھنا ہوگا علم میں تفریق نہیں ہونی چاہیے۔ علم کے لیے شرافت کی پابندی ہوگی تو بے شریف کیسے علم یافتہ ہوگا۔ شریف بی بیاں...... اتنا خوف کس چیز کا ہے۔ شرافت پر اتنا زور کس لیے؟''
''کیونکہ خواتین کے رسالوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ سطر اس لیے لکھی ہے کہ جب گھروں میں یہ رسالے جائیں تو انہیں معلوم ہو کہ یہ رسالہ شریف ہے۔ اس کا مواد شریف ہے۔ اس میں ایسی ویسی کوئی چیز نہیں ہے جو پڑھنے والیوں کو بھٹکا دے۔ اسے اچھی خواتین پڑھتی ہیں ان کی تربیت مقصود ہے۔''
''ایسی ویسی چیز کیا ہوتی ہے جہاں آرا؟''
''جس سے بے حیائی پھیلے...... بے شرمی عام ہو......''
''دیکھیں کیسی عجیب بات ہے ہمیں جہالت

سے حیا نہیں آتی لیکن وہ لڑکی بے حیا کہلاتی ہے جو رسالے پڑھ لے۔" اس نے حیران ہو کر اپنی بھاوج کی طرف دیکھا جس کا نام گوہر بی بی تھا لیکن ابا میاں اسے گوہر آرا کہتے تھے۔

"ان رسالوں میں لکھنے والی خواتین اپنے نام کے ساتھ نہیں لکھ سکتیں۔ لکھا ہے، ہمشیرہ خلیل احمد صاحبہ، بیگم اے خان صاحب، دختر حفاظت علی صاحب، والدہ سلطان رئیس، بیگم مرزا دلی۔"

جہاں آرا نے متاثر ہو کر گوہر کی طرف دیکھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں۔"

"لکھنے والیوں کو اپنے ناموں کے ساتھ لکھنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ اتنا اختیار انہیں ملنا چاہیے۔"

"ایسے معاشرے میں جہاں خواتین کے رسالے پڑھنے کو آزاد خیالی یا بے حیائی سمجھا جائے گا وہاں ہم اس چیز کا تصور کیسے کر سکتے ہیں کہ خواتین کے نام زبان زد عام ہوں۔" اس نے تلخی سے جواب دیا۔

"آپ یہ سوال رسالے میں کیوں نہیں لکھ بھیجتیں؟"

☆☆☆

اس نے اپنا اور گوہر کا مکالمہ "عصمت" میں لکھ کر بھیج دیا تھا۔ جو اگلے ہی شمارے میں پرتپاک انداز سے شائع کر دیا گیا تھا۔ مدیرہ نے اس کے نام آنے والے خطوط اسے بھجوا دیے تھے۔ خطوں کا ڈھیر آیا تھا۔ دونوں مل کر ایک ایک خط پڑھتی اور تبصرے کرتی رہیں۔ کسی خط پر بے ساختہ ہنس دیتی، کسی پر سوچ میں پڑ جاتیں۔ کئی لڑکیوں نے خود پر لگی پابندیوں کی بات کی تھی، اور اصرار کیا تھا کہ جہاں آرا اس پر بھی آواز اٹھائے۔ ان خطوط میں ایک صاحب ہمایوں کا خط بھی تھا۔

لکھا تھا:

"آپ کے لکھے مکالمے نے معاشرے کی تلخ حقیقت کی بھرپور نقاب کشائی کی ہے۔ کیا خوب۔ اگر ہمارے گھروں میں ایسے موضوعات زیر بحث لائے جائیں تو کوئی دن نہیں جاتا کہ خواتین اپنی علمی برتری اور ذہنی کاوشوں سے بہتر مقام نہ پالیں۔ میں اس معاملے پر پہلے بھی غور کر چکا تھا۔ کئی بار احباب کے ساتھ اسے زیر بحث لا چکا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ جیسی خواتین اپنی انقلابی سوچ سے معاشرے میں جائز تبدیلیوں کے لیے کوشاں ہیں۔ ہماری خواتین کی شناخت زمانوں سے زوجہ، ہمشیرہ، دختر اور بیگم کی قید میں ہے۔ اگر علمی یا ادبی کاوش ان کی اپنی ہے تو اس پر نام بھی ان کا اپنا ہونا چاہیے۔ انہیں یہ جائز اختیار ضرور دیا جانا چاہیے۔ میں آپ کی اس تحریری کاوش جو ایک تحریک کی صورت اختیار کر جائے گی کو دل سے سراہتا ہوں۔"

خط میں خط و کتابت کے لیے مکمل پتا درج تھا، بلکہ اصرار کیا گیا تھا کہ اس موضوع پر مزید تحریریں لکھی جائیں۔

"انہیں بھی خط کا جواب دیں۔" گوہر نے ہمایوں کے خط کی طرف اشارہ کیا۔

"میں کسی مرد کے ساتھ خط و کتابت نہیں کروں گی۔"

"آپ سب خط لکھنے والوں کو جواب دے رہی ہیں انہیں بھی دیں۔ انہیں بھی قاری سمجھیں۔ ہو سکتا ہے ان خطوط میں ان کی کسی عزیزہ یا ہمشیرہ کا خط ہو۔ انہیں جواب ملے گا اور ان صاحب کو نہیں ملے گا تو انہیں برا لگے گا۔ دوسروں کے دل دکھانے سے اجتناب کریں۔"

"مجھے کیوں فکر ہو گی کسی کا دل دکھنے سے۔" وہ چڑ گئی۔

"ہمارے دل کاٹ ڈالیں اور ہم اف نہ کریں۔"

"کسی کی سزا کسی کو، ناحق ہے انہیں بھی ایک قاری سمجھ کر جواب دیں۔"

"تم کیوں سب کے دل رکھنا چاہتی ہو؟"

"دل توڑنے کی چیز تو نہیں جہاں آرا!"

"یہی بات کہی تھی بھائی صاحب سے جو وہ شادی کے لیے مان گئے۔" وہ جاننا چاہتی تھی۔

وہ شرما گئی۔ "آپ بات بدل رہی ہیں۔"

"جواب دو...... جلدی جلدی۔"

"مجھ سے ملاقات کی تھی۔ کہنے لگے میں اپنی مرحومہ بیوی سے محبت کرتا ہوں، رہ لیں گی ایسے انسان کے ساتھ؟ میں نے کہا، محبت ترک کرنے کی شے نہیں۔ کیا ضروری ہے کہ موت کے ساتھ محبت کو بھی مرحوم کر دیا جائے۔ جینے والوں کے ساتھ کیے گئے محبت کے وعدوں کا تقاضا ہے کہ یہ وعدے ان کے جانے کے بعد بھی نبھائے جائیں۔ محبت زندہ دلوں کا شیوہ ہے اسے زندہ رکھنے میں برائی کیسی۔"

وہ اس کے جواب پر حیران رہ گئی۔ "اگر وہ تم سے محبت نہ کریں۔"

"وفا کریں گے۔"

وہ لاجواب ہوگئی۔ تو یہ تھا کہانی کا وہ حصہ جس کی وجہ سے بھائی صاحب مان گئے تھے۔

"آپ نے مجھے باتوں سے بھٹکا دیا۔ آپ انہیں خط کا جواب لکھیں...... جلدی جلدی۔"

"میں نہیں لکھوں گی بات ختم۔" نہ کی تکرار جاری رہی۔

☆☆☆

گوہر نے سارا متن تیار کر لیا تھا کہ ان صاحب کو کیسا خط لکھا جائے گا۔ جہاں آرا کا منہ پھولا رہا۔

"تم کیا چاہتی ہو......"

"انہیں بھی خط کا جواب دیں۔ میں یہ ظلم نہیں ہونے دوں گی۔"

ناچار اس نے ان صاحب کو خط کا جواب لکھ مارا۔ اب یہ ایسی غلطی ہوئی کہ اسے آنے والے کئی دن تک بھگتنی پڑی۔ ہر خط میں ایسی بحث چھڑ جاتی تھی کہ اسے چڑ کر جواب لکھنا ہی پڑتا۔ ورنہ صحیح کے لیے۔ مکالے پر مکالے ہوتے چلے گئے۔ ایک خط جاتا دوسرا آتا، دوسرا موصول ہوتا تیسرا ارسال ہو جاتا۔ وہ ہر خط پر چڑ کر گوہر کی طرف دیکھتی وہ آنکھیں مٹکا دیتی۔

"صاحب علم انسان ہیں، دیکھیں کتنی پیاری باتیں لکھتے ہیں۔" وہ خط لہرا کر شرارت سے مسکرائی۔

خاتون مشرق، حریم اور عصمت میں خواتین کی تعلیم و تربیت پر ہندوستان بھر سے نامور ادیبوں کی تحریریں شائع ہو رہی تھیں، ان صاحب کی تحریروں کو نمایاں جگہ دی جاتی تھی۔ ان کی کئی تحریروں کی دھوم تھی۔ ان دونوں نے بھی سر جوڑ کر پڑھی تھیں۔

"روشن خیال صاحب ہیں کیا عمدہ نکتے اٹھاتے ہیں۔" جہاں آرا بھی متاثر ہوئی تھی لیکن ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"بن رہے ہیں صاحب! دیکھنا ان کے گھر کی خواتین ان پڑھ ہوں گی۔"

"ان کی ہمشیرہ آپ کو خط لکھتی ہیں۔"

"وہ اپنی جرات سے پڑھی لکھی ہوگی۔"

"ایسی بھی بات نہیں، بہن کو اعتماد دیا ہے تب ہی وہ اتنی آزادی سے خط و کتابت کرتی ہے۔ بتایئے ایسی آزادی سب کو کہاں میسر ہے۔"

وہ صاحب دہلی آ رہے تھے، کسی ادبی مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا۔ ہمشیرہ بھی تشریف لا رہی تھیں۔ ہمشیرہ طاہرہ بی بی نے خط لکھ کر اجازت طلب کی تھی کہ کیا وہ ان سے ملنے آ سکتی ہے۔ گوہر نے جھٹ جوابی خط لکھ دیا کہ ضرور آیئے، اپنے بھائی صاحب کو بھی لایئے، ہمیں میزبان جانیں، دہلی میں ہمارے یہاں قیام کیجیے۔

جہاں آرا اپنی بھاوج کو دیکھتی رہ گئی۔

"ہر کسی کو گھر نہیں بلا لیتے جہاں آرا!"

"ہر کسی پر گھر کے دروازے بند بھی نہیں کر دیتے۔ ان کی ہمشیرہ کیسی اچھی خاتون ہیں، ہم دونوں کو ان سے مل کر خوشی ہوگی۔"

"تمہیں سب اچھے لگتے ہیں۔"

"آپ سے زیادہ کوئی نہیں۔" شوخی سے کہا۔

☆☆☆

گوہر نے ابا میاں کو بتا دیا۔ انہوں نے مردان

خانے میں انتظام کروالیا۔ بھائی صاحب کو تیار کرلیا۔ وہ خود جا کر اسٹیشن سے انہیں لے کر آئے۔ ہمشیرہ کا ان کے ساتھ قیام رہا، بھائی صاحب مردانے میں براجمان ہوئے۔ کیا پڑھی لکھی تھی طاہرہ بی بی، سلجھی ہوئی روشن خیال۔ بھائی کتابیں لا کر دیتے ہیں، بھائی ادبی کانفرنسوں میں ساتھ لے جاتے ہیں، بھائی صاحب انٹرنس کے لیے علی گڑھ بھیج رہے ہیں۔ بھائی صاحب سارے خاندان کی مخالفت مول لے رہے ہیں۔ بھائی صاحب خواتین کی ہر تحریک میں ان کا نام درج کروادیتے ہیں۔ بھائی صاحب چاہتے ہیں وہ فرنگی عورتوں کی طرح سائیکل چلائیں۔ اپنی سواری رکھیں۔

جہاں آرا کے بھائی صاحب بھی خاصے خوش تھے، ان صاحب ہمایوں کے ساتھ مشاعرے میں گئے۔ ادیبوں کے ساتھ بحث مباحثے کا سلسلہ چلا۔ سنا تھا مردان خانے میں رت جگا رہا۔ دونوں کی خوب بنی رہی۔ بیگم صاحبہ نے اصرار کیا تھا کہ مہمانوں کا خیال رکھنا ہے، انہیں اجنبیت محسوس نہ ہو۔ بیگم کی فرمائش پر اتنے دل سے عمل کیا کہ تین دن کی دوستی تین سال کی دوستی پر بھاری رہی۔

ایک دن یہ دونوں چھت پر تھیں۔ طاہرہ بی بی دہلی میں ایک دوسری سہیلی سے ملنے گئی تھیں۔ ہمایوں مردان خانے کے احاطے میں کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ سفید کرتے پاجامے میں تھے۔

''شریف انسان ہیں...... نفیس بھی ہیں۔''

''ان کی پیشانی پر لکھا ہے یا پشت پر؟'' اس نے جل کر پوچھا۔

وہ ہنس دی۔ ''دیکھ لیجئے گا۔ چال ڈھال سب بتادیتی ہے۔ طاہرہ کتنی تعریف کرتی ہے۔''

''بہن ہے تعریف ہی کرے گی۔''

''برے مردوں کی بہنیں بھی تعریف نہیں کرتیں جہاں آرا!''

شریف انسان نے دو شریف بیبیوں کو چھت سے اپنا معائنہ کرتے ہوئے پایا تو سر کو ذرا سا پیچھے گھما کر انہیں ڈرا دیا۔ دونوں بدک کر پیچھے ہوئیں۔ شریف انسان زیر لب ہنس دیا۔ پھر ایک دن سیاہ شیروانی میں دکھائی دیے۔ اچھا لکھتے تھے، اچھا بنتے بھی تھے۔ بھائی صاحب بتا رہے تھے بولتے بھی کمال ہیں۔

اپنے شہر واپس پہنچے ہی تھے کہ بھائی صاحب کو لکھنو کے بڑے مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ بھجوادیا۔ بھائی صاحب دس دن لکھنو رہ کر آئے۔ تین مہینے بعد وہ صاحب پھر دہلی نازل ہوگئے۔ پھر وہی رت جگے، پھر وہی ادبی محفلیں۔ اپنے شہر واپس گئے تو بڑی بہن کی شادی کا دعوت نامہ ارسال کردیا۔ جب تک ان سے ہاں نہیں کہلوالی، دونوں بہن بھائی کے اصرار بھرے خط آتے رہے۔

☆☆☆

شادی والے گھر میں وہ دلہن بھابھی کے نام سے مشہور ہوگئی۔ طاہرہ بی بی انہیں لیے لیے سب سے ملواتی۔ ان کے ناز نخرے اٹھاتی۔ جہاں آرا بہت اصرار کے بعد آئی تھی۔ گوہر اس کے بغیر آنا نہیں چاہتی تھی، اسے پیچھے اکیلا چھوڑنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ لکھنو کی شادی ان کے لیے نئی نہیں تھی، یہاں ان کے کئی رشتے دار آباد تھے۔ ان سے بھی ملاقات کا سلسلہ رہا۔

وہ واپس حویلی پہنچے ہی تھے کہ ہمایوں کی طرف سے بھیجے خطوط اس کے منتظر تھے۔ ایک میں جہاں آرا کی آمد کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ دوسرے میں اپنی شخصیت کا تفصیلی تعارف کروایا گیا تھا اور تیسرے میں شادی کا پیغام تھا۔ وہ اتنے طویل خطوط تھے کہ جہاں آرا کو پڑھتے پڑھتے شام ہو گئی۔

''آپ کو خط لکھنے کا مقصد مختصراً بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ بات گھر کے بڑوں تک پہنچنے سے پہلے صرف آپ تک پہنچے۔ آپ کو مکمل اختیار دیا جائے کہ آپ اپنی سوجھ بوجھ اور پسند ناپسند سے فیصلہ کریں۔ آپ پر خاندانی یا

سماجی دباؤ نہ ڈالا جائے۔ آپ کے پاس آپ کی زندگی کا کلی اختیار ہونا چاہیے۔"

گوہر نے خط پڑھے تو اس کا چہرہ چمکنے لگا۔

"انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ ہاں اقرار کے لیے آپ وقت لینا چاہیں تو ضرور لیں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"سچ بتانا...... اسی لیے مجھے وہاں شادی پر لے کر گئی تھیں۔"

"نہیں...... لیکن میں اس لیے ضرور گئی تھی کہ ان کا رہن سہن اور خاندان کا جائزہ لے سکوں۔"

"تم کیسے جانتی تھیں وہ مجھ میں دلچسپی رکھتے ہیں؟"

"ان کے ہر خط سے جان گئی تھی۔" گوہر نے دلفریب تبسم کے ساتھ کہا۔

"وہ بحث ومباحثے سے بھرے ہوئے خط؟" اس نے شوخی سے سر ہلا دیا۔

"وہ ہر خط میں ایسی بات ضرور لکھ دیتے تھے کہ آپ بھڑک کر یا چڑ کر انہیں جواب دینے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ شاید وہ ایک عرصے سے عصمت میں آپ کے خطوط اور تحریریں پڑھ رہے تھے۔ وہ آپ سے متاثر تھے۔ شاید وہ آپ کا مزاج بھی سمجھ چکے تھے۔ انہیں جیسے ہی موقع ملا جھٹ آپ کو خط لکھ دیا۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے۔" جہاں آرا حیران ہوئی۔

"ایسا بہت کچھ ہے جو ابھی آپ کو دکھائی نہیں دے گا۔"

"کچھ بھی ہے، میں ان سے یا کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔ اوپر کی منزل ابھی سلامت ہے، مجھے مجبور نہ کرنا کہ میں وہاں بھاگ جاؤں۔"

"بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے جہاں آرا! میں نے کہا نا کہ اقرار کے لیے وقت لو، سوچو سمجھو پرکھو۔ چاہو تو ملاقات کرلو۔"

"کیا شادی ہی غموں کا علاج ہے؟" اس کے چہرے پر سائے لہرا گئے۔ وہ پرانی جہاں آرا دکھائی دینے لگی۔

"میرا خیال ہے شادی ایک ایسے باغ کی مانند ہے، جس کے کسی نہ کسی حصے میں کڑی دھوپ کا بسیرا رہتا ہے۔ کہیں بیل اجڑ گئی، کہیں درخت کو دیمک لگ گئی۔ کہیں کھاد کی ضرورت درپیش رہی، کیڑے پڑ گئے۔ طوفان آیا اور باغ ہی اجڑ گیا۔ لیکن باغ آخر باغ ہے۔"

"تمہاری بات اچھی لگی۔ شادی دھوپ سایہ ہے۔ غم اور خوشی ہے۔ لیکن یہ تو زندگی کا حال ہے۔"

"ساتھی کے ساتھ زندگی کے غم بانٹ لیے جاتے ہیں۔"

"ساتھی سے ملنے والے غم؟"

"کچھ غم میری اس آنکھ کے سیاہ داغ کی طرح ہوتے ہیں، ان کی کوئی دوا نہیں ہوتی، لیکن ان کے ساتھ زندگی گزاری جاسکتی ہے۔ ہنسا جاسکتا ہے، نئی خوشیوں کا اہتمام کیا جاسکتا ہے۔"

"اسی لیے تم نے بھائی صاحب سے شادی کی...... عمر جانتی ہو ان کی کیا ہے؟"

"عمر کا کیا ہے جہاں آرا! میں سمجھتی ہوں معاشرتی پیمانے پر ہم سب کے ساتھ کوئی نہ کوئی نقص منسلک ہے۔ ہمیں اس نقص کے ساتھ ہی فیصلے کرنے ہیں۔ میرے اس داغ کی وجہ سے خاندان سے کسی نے میرا رشتہ نہیں لیا۔ میری ہم عمر لڑکیوں کی نسبتیں ٹھہر گئیں۔ خاندان کی ایک خاتون نے کہہ دیا "بے چاری گوہر رہ گئی۔" مجھے سن کر برا نہیں لگا۔ کبھی دکھ بھی نہیں ہوا کیونکہ میں اس نشان کو لے کر پیدا ہوئی تھی۔ لوگوں کو یہ نقص لگتا ہوگا لیکن مجھے یہ عزیز رہا۔ یہ میرے ساتھ ہنسا کھیلا ہے، یہ میری ذات کا حصہ ہے۔

اس حویلی کے مقابلے میں، میں چھوٹے گھر سے ہوں۔ معمولی حیثیت ہوں۔ اپنی زندگی میں کبھی فنکشن میں نہیں بیٹھی۔ تخت پر بیٹھ کر حکم بھی نہیں

ہمارے گھر مامائیں نہیں تھیں۔ مالی اور ایجنٹ نہیں آتے تھے۔ منہار سے کھلے ہاتھ سے چوڑیاں بھی نہیں خریدیں۔ ہر نعمت اپنے ساتھ کچھ زحمتیں لاتی ہے۔ کچھ زحمتیں بھی نعمت ہوتی ہیں۔ میں چھوٹے گھر کی لڑکی اپنے میکے میں بڑے گھر کی بہو مشہور ہوگئی۔ دیکھیں! کیسا محل جیسا گھر ہے لڑکی کا۔ آپ کے بھائی نیک طبیعت انسان ہیں۔ میرا خیال رکھتے ہیں۔ بتائیے پھر میں ان کی کنپٹیوں کی سفیدی پر ہی کیوں جلتی کڑھتی رہوں؟"

"تم زندگی سے خوش کن پہلو نکالنا جانتی ہو۔"

"جہاں آرا! زندگی میں خوش کن پہلوؤں کی تلاش ضروری ہے۔"

"اگر تمہاری شادی نہ ہوتی۔"

"نہ ہوتی میں ایسے ہی سب کو خط لکھتی۔ نمونے بناتی، چوڑیاں پہنتی، پھولوں کی آبیاری کرتی۔ سونا میسر نہ ہوتا چاندی پہنتی۔ ورنہ پھول پروتی بالوں میں سجا لیتی۔ میں نے خوشیوں کا انحصار شادی پر نہیں رکھا تھا، کسی چیز پر نہیں رکھا تھا۔ میں نے خوش رہنا سیکھ لیا تھا جہاں آرا!"

ہاں اسی لیے اس کی آنکھوں میں بچپنے کی جھلک تھی۔ بے فکری کی۔ خوشی کی۔ ترنگ کی۔

"جو غم ہیں ان کا کیا کیا جائے۔" اس کی ہتھیلیوں پر ماضی کا پسینہ جھلک آیا۔

"غموں سے کون بچا رہ سکا ہے ہمارے چاہتے نہ چاہتے ہمیں مل جاتے ہیں۔ لیکن انسان کا کام خوشیوں کا انتظام ہونا چاہیے۔ بڑے ماموں جان کہتے ہیں جیسے انسان شادی بیاہ کی تقریبات کے لیے قسم قسم کا سامان جمع کرتا ہے، عزیزوں کو بلاتا ہے، پھر شامیانے لگتا ہے، ایسے ہی جہاں سے جو چیز ملے اسے جمع کر کے خوشیوں کے شامیانے لگا لینے چاہیے۔ اپنے ماضی اور اوپر کی منزل سے نکل آئیں جہاں آرا!"

"مجھے ناقدری کا خوف ہے گوہر!"

"پہلے آپ اپنی قدر تو کیجیے۔ دنیا کے آئینے میں خود کو دیکھنا چھوڑ دیجیے۔ اپنی نظروں میں معتبر ہو جائیے۔"

☆☆☆

معتبری کا زمانہ آ گیا۔
اقرار کا موسم ٹھہر گیا۔

وہ خط لکھتی، خط بھیجتی۔ خط پڑھتی، ہنستی، تکرار کرتی، اعتراض اٹھاتی۔ کچھ سوال پوچھے جاتے، کچھ جواب دیے جاتے۔ کچھ اشعار بھی آنے لگے۔ خطوں کا ترنم بدلنے لگا۔ وہ مسکرا دیتی۔ گنگنا جاتی۔

پھر اس کی نسبت ٹھہر گئی۔ اور موسم بھی بدل گیا۔ وہی موسم آ گیا جس میں نئی دلہن حویلی آئی تھی۔ آپا آئیں، بڑے چھوٹے بھائی صاحب آئے۔ دلہن اپنی جہاں آرا کی شادی کے کسی انتظام میں پیچھے نہ رہی۔ غفلت نہ کی۔ تیاری میں کوئی عذر نہ چھوڑا۔ ہر طرف اس کی نظر تھی۔ ہر مہمان کے پاس کھڑی تھی، ہر جی سے ہنستی بولتی تھی۔ مہمان آتے، سامان رکھوایا جاتا، کھانے کا انتظام دیکھا جاتا۔ خالہ بی اپنا خاندان لائیں۔ ایک ایک بہو کو دلہن سے ملوانے لگیں کہ یہ ہے وہ بچی جو تجھے خط لکھتی ہے۔

جہاں آرا گوٹا کناری چنے دوپٹے میں اماں کے کمرے سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ کتنی حسین تھی۔ کتنا پیارا مسکراتی تھیں۔ وہ کمرے سے نکل کر چلتی ہوئی اس کے قریب جا کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ دلہن گھوم کر اس کی طرف سیدھی ہوئی۔

"کچھ چاہیے جہاں آرا؟" اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب تھیں۔ دونوں بازو پھیلا کر اس نے اسے اپنے سینے کے ساتھ لگا کر محبت سے بھینچ لیا۔

"جو چاہیے تھا وہ بن مانگے مل گیا۔ تم...... میں نہیں جانتی تھی کہ اس اجاڑ حویلی میں نئی دلہن آئے گی تو اسے اتنا روشن کر دے گی۔ نئی دلہن تم کتنی اچھی ہو۔"

☆☆

سائرہ رضا

محبت کہانی زندگی کہانی

"آپ بس سیدھی سیدھی کہانی لکھیے نا۔"

"سیدھی...... سیدھی۔" میں نے بھنویں سکوڑ کر اس کی صورت دیکھی۔ "یہ سیدھی سیدھی کہانی کیسی ہوتی ہے۔ رومانٹک ہوتی ہے، ٹریجک ہوتی ہے، کامیڈی...... تھرل۔ یہ سیدھی کہانی کیسی ہوگی۔"

"اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟" وہ بے بسی سے ہاتھ ملنے لگی۔

"جیسے سمجھا سکتی ہو...... ویسے سمجھاؤ۔ شاید میں کوئی نتیجہ اخذ کر سکوں۔" میں نے اس کی ہمت بندھائی۔

"میرے پاس تو اتنے جملے نہیں، مثالیں بھی نہیں مگر میں نے اب تک جو بھی کہانی پڑھی وہاں یا تو بہت دولت ہوتی ہے کہ بس محبت ہی کرنی باقی ہوتی ہے یا اتنی غربت کہ بس نفرت رہ جاتی ہے۔ محبت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ لکھنے والے کے پاس درمیان کیوں نہیں ہوتا۔ خوشی ہوگی تو بے حد، دکھ ہوں گے تو توبہ، خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ مظلوم یا ظالم...... جبکہ ہر انسان کسی نہ کسی موقع پر مظلوم بھی ہوتا ہے اور ظالم بھی اور......"

"ارے......!" میں بڑے غور سے اسے سن رہی تھی، چونک کر اسے ٹوک گئی۔

"اتنی خوب صورت بات، واہ! تم سے امید نہیں تھی۔" وہ بری طرح جھینپ گئی۔ مگر اگلے ہی پل اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔

"لوگ ہمیشہ یہ ہی سوچتے ہیں کہ کوئی بھی اچھی بات کسی اونچی جگہ ہی سے آئے گی، پڑھے لکھے اعلا بندے کی جانب سے۔ اللہ نے سب کو ذہن و دل دیا ہے۔ دنیا دیکھنے کے لیے آنکھیں، عقل کی بات تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔"

وہ دکھ کی نئی سڑک پر چڑھ گئی۔

"بس کرو۔ اب گہرے فلسفے اور دنیا کی بے ثباتی کے دکھڑے رونے نہ بیٹھنا۔ سیدھے سیدھے...... سیدھی کہانی لکھنے کا فارمولا بتاؤ۔ اب تک تو میں کسی کی بھی ہدایات کے بغیر یوں ہی اندھا دھند لکھے جا رہی تھی، اب ایک رہنما ملا ہے تو۔" میں نے شرارت سے اسے دیکھا۔

"نہیں، آپ بہت اچھا لکھتی ہیں۔" وہ حسب عادت عقیدت ـــ سے دہری ہوگئی۔

"میری مدح سرائی بعد میں کرنا، پہلے اپنی بات مکمل کرو۔ اتنا تو میں سمجھ گئی، مجھے مڈل کلاس پر لکھنا ہے، اب آگے بولو۔"

"خالی مڈل کلاس نہیں۔" وہ دوبارہ متحرک ہو گئی۔ "ہر چیز درمیانی ہو اعتدال میں۔ نہ غربت، نہ امارت، مگر خوشی ہو۔ صبر شکر ہو، ہر شے نارمل ہو۔ آپ ہیروئن کا حسن ایسا بتاتے ہیں جیسے حور ہو۔ میں تو روز صبح گھر سے نکلتی ہوں۔ روزانہ اتنی لڑکیوں سے ملتی ہوں۔ خدا کی قسم! سب اچھی ہوتی ہیں، کسی کی آنکھیں اچھی ہیں، تو کسی کے بال، مگر جیسی تشبیہات کہانیوں میں ملتی ہیں، ویسی تو کبھی نظر نہ آئیں۔"

"ٹی وی میں ملتی ہیں نا ہر صبح ایک سے ایک چہرہ سجا بنا۔" میں نے اسے چھیڑا۔

"میں نے تو سالوں سے صبح کے وقت ٹی وی دیکھا ہی نہیں...... مگر وہ جو سب صبح صبح آتی ہیں بلکہ سارا دن، رات تک، وہ لڑکیاں تھوڑا ہی ہوتی ہیں۔

پلاسٹک کی گڑیاں ہوتی ہیں۔ نہ کھل کر ہنستی ہیں، نہ روتی ہیں۔ بجی بنی شوکیس کے اندر، اصلی لڑکیاں ایسی تھوڑی ہوتی ہیں؟"

"پھر کیا اصلی لڑکی شفا جیسی ہوتی ہے؟"

"ہاں بالکل شفا جیسی ہوتی ہے۔ تھوڑی موٹی، تھوڑی کالی، تھوڑی پریشان، تھوڑی خوش، محنت کرتی ہوئی اور مسکراتی ہوئی۔"

"یہ تو ہے۔" میں نے فوراً تائید کی۔ "ہیروئن نہ کالی ہو، نہ گوری، نہ لمبی، نہ موٹی۔ چھوٹی پھر بھی اچھی لگتی ہے جیسے کہ تم۔"

"ہونہہ!" وہ جھینپی۔

"نہ دولت مند ہو، نہ بہت فقیر...... محنت کرتی ہو اور تھوڑے، بہت پر خوش رہتی ہو جیسے کہ تم۔"

اس بار وہ قطعاً نہ شرمائی، بلکہ خود اعتمادی سے سر اثبات میں ہلایا۔ "بالکل!"

"اور ہیرو؟ ہیرو پر بھی کچھ شرائط لاگو ہوتی ہیں کہ نہیں؟"

"اللہ! ہیرو کا تو نام ہی مت لیں۔ اسے تو پتا نہیں کیا بنا کر پیش کیا جاتا ہے، مکمل جامع، جیسے میتھس کے نمبر، دس بٹا دس۔" اس کی ہنسی میں میری



ہنسی بھی شامل ہوگئی۔

"اونچا، لمبا، گورا، رحم دل، پڑھا لکھا، دولت مند تو نہ پوچھیں۔ اتنے دیوتا تو پورے یونان میں نہ ہوں گے جتنے اب تک آپ لوگ متعارف کروا چکی ہیں۔" وہ خفگی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"ہیرو کو تو عام انسان ہونا چاہیے۔ عام روڈ پر کھڑا ہونے والا شخص۔ سانولا، لمبا، بس کا ڈنڈا پکڑ کر سفر کرنے والا یا پھر چھت پر بیٹھا ہوا، محنت کرتا ہوا، غصہ بھی کرتا ہو، ہنستا بھی ہو اور آپ لوگ، اف......! عام سا انسان کیوں نہیں پیش کرتیں۔"

"لوگ ماریں گے۔ پڑھنے والیاں کہیں گی، ایسے تو گلی گلی ملتے ہیں اور ہمیں بھی ایسے ہی ملتے ہیں، کم از کم ہیروئن کو تو ایسا نہ ملے، کوئی تو بامراد رہے۔" میں نے انسانی فطرت کی خوش گمانی سے آگاہ کیا۔

"دبلا پتلا، کالا لمبا، بہت کم آمدنی، مگر خوب محنت کرنے والا ہیرو کیوں نہیں ہوسکتا؟" اس کے چہرے پر غم اور ناامیدی پھیل گئی۔

"ہوسکتا ہے، کیوں نہیں ہوسکتا۔" میں نے فوراً تسلی دی۔ "کالا، لمبا، دبلا، محنتی۔" میں نے اس کی بتائی خوبیاں دہرائیں۔ "جیسے...... جیسے شفاعت۔"

"اللہ!" میرے کہنے پر اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ "آپ نے اس کا نام کیوں لیا؟"

"تو کیا نہیں لینا چاہیے تھا۔ دیکھو! عام سی لڑکی، مگر خاص لگتی ہو، جیسے شفا......" "عام سا لڑکا، کالا سا، لمبا، بہت محنتی، جیسے شفاعت...... کہانی تو بنتی ہے یار! اب خوامخواہ منہ لٹکا کر کیوں بیٹھی ہو، تمہارے بتائے خاکے سے جو شبیہ ابھرتی ہے، وہ تو یہی ہے۔" میں نے شانے اچکا کر بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔

"آپ بھی نا بس......" وہ اپنے پرس کی ڈوری کندھے پر جماتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ "بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہیں، خوامخواہ۔"

"بی بی! پر کا کوا بنانا اور دریا کو کوزے میں بند کرنا ہم لکھنے والوں کے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اللہ کا ودیعت کردہ ہے یہ ہنر، الحمدللہ!"

مگر شفا اور شفاعت عام سی زندگی کے عام سے کردار...... ان کرداروں کو لے کر جو کہانی لکھی جائے گی۔ اسے محبت کہانی کہا جائے گا، ایک دم خاص کہانی، سمجھیں۔

☆☆☆

میرا شفا سے تعارف ایک دردناک چیخ سے ہوا۔ میں اپنے ٹیرس پر براجمان قلم کو کاغذ پر نچا رہی تھی، جب تصور بھنگڑا رقص کرتا ہوا قلم چونکا اور اس کے بے ڈھنگے قدم نے کاغذ پر لکیر کھینچ دی۔

میں نے نیچے جھانکا تو ایک لڑکی زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھی تھی اور اس کے پیر سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ جوتی لتھڑ گئی تھی اور کچی مٹی پر سرخی کی نمی بڑھتی جا رہی تھی۔

میں سر پر دوپٹا کھسکتی، دھڑ دھڑ سیڑھیاں اتری۔ شام کے سات بجے اس جانب کوئی نہیں تھا۔ کانچ شاید گوشت کے اندر تک دھنس گیا تھا۔ پہلی زوردار چیخ کے بعد وہ دبی دبی سسکیاں بھر رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو اور پورا جسم پسینے پسینے تھا۔ میرے لیے یہ دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔ مگر ایسے لمحے میں ہمت نہ جانے کہاں سے آجاتی ہے۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور ایک جھٹکے سے لمبا کانچ باہر کھینچ لیا۔ اس نے چیخ کو روکنے کے لیے منہ پر ہاتھ جما لیا تھا۔ خون بہنے کی رفتار بڑھ گئی، مگر اب خطرہ نہیں تھا۔ میں اس کے لاکھ منع کرنے پر بھی سہارا دیے اندر لے آئی تھی۔

"ابھی میرا بیٹا آئے گا تو تمہیں بائیک پر چھوڑ دے گا۔ ایسے کیسے جاؤ گی؟" وہ متامل ہوئی۔

"اچھا رکشا لا دے گا۔" میں نے حل پیش کیا۔ "اگر ہمت ہو تو اوپر آجاؤ، میں چائے بنا کر دیتی ہوں، مانی بس آتا ہوگا۔"

وہ سر ہلاتی ریلنگ کا سہارا لیے اوپر آگئی۔ میں نے زخم دھو کر اچھی طرح سے پٹی باندھ دی۔ اس نے کرسی پر ٹکتے ہوئے میری ہدایت پر اپنا اسکارف اتار دیا اور گاؤن کے بٹن کھول دیے۔

میں چائے بناتے ہوئے اس کا گہرا جائزہ لے رہی تھی۔

وہ نہ تو گندمی تھی، نہ سانولی۔ جسم بھرا بھرا سا۔ مناسب چوٹی پشت پر گری تھی۔ آنسوؤں سے بھری

آنکھوں میں کچھ تھا، جو متوجہ کرتا تھا۔ حزن، سوچ، ٹھہراؤ۔ مٹی پر گر جانے کے باعث سیاہ گاؤن بالکل مٹی میں تھا اور اپنی رنگت بدل چکا تھا۔ وہ وائل کے مسٹرڈ سیاہ سوٹ میں اپنی حیثیت کا تعین کروا رہی تھی۔

میرا قیاس تھوڑی دیر بعد درست ثابت ہوا، وہ کسی گارمنٹس فیکٹری میں کام کرتی تھی۔

مجھے اندازہ ہوا، وہ بھوکی بھی ہوگی۔ میں نے زوی اور ثانی کے لیے بنائے سینڈوچز بھی ٹرے میں رکھ دیے۔ ساتھ ہی کباب اور چائے بھی۔ پھر ایک پلیٹ میں سیب بھی رکھ دیے۔

اچانک اس کی چیخ کی آواز پر میں حواس باختہ باہر نکلی۔ اس کے ہاتھ میں ہفت روزہ میگزین اور میرا لکھا ہوا کاغذ تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پوری کھلی تھیں اور تھرتھراتے لبوں سے فقرہ ٹوٹ ٹوٹ کر نکلا۔

''آپ......'' اس نے اپنے دونوں ہاتھ لہرائے، میگزین اور کاغذ۔ ''آپ ...... آپ سحر راغب ہیں۔ یہ والی سحر راغب؟''

ظاہر ہے، مجھے جواب اثبات میں دینا تھا۔

''ہاں!'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر جرم کا اقرار کیا۔''م...... مجھے یقین نہیں آرہا۔'' وہ بے یقینی کی انتہاؤں پر تھی۔

''تو یقین دلانے کے لیے اب کیا کروں؟'' میں مسکرائی۔

''کک، کچھ نہیں، مجھے یقین آ گیا۔'' اس نے بمشکل اپنا ہکلاہٹ پر قابو پایا۔

''وہ میگزین کے اندر یہ کاغذ تھا، میں نے بس یوں ہی رکھتے ر... پڑھ لیا تو...... آپ اگلی قسط لکھ رہی ہیں نا۔'' اس نے کچھ شرمندگی سے وجہ بتائی۔

''اٹس اوکے...... تم اسے رکھو اور یہ کھاؤ، بھوک کا ٹائم ہے اور کمزوری بھی ہو رہی ہوگی نا۔''

''میں سب کو بتاؤں گی گھر میں، میرے زخم پر مرہم آپ نے لگایا۔''

''تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے اوباما نے لگایا ہو۔''

''اوباما کا نام کیوں لیا۔ وہ کب سے مرہم لگانے لگا۔ وہ تو زخم دینے والے لوگ ہیں۔'' اس نے ایسا منہ بنایا جیسے منہ میں تمبولی آ گئی ہو۔

''واؤ......!'' میں متاثر ہوئی۔ ''تم باتیں بہت اچھی کرتی ہو۔ میری اسٹوری واقعی پڑھتی ہو یا گیس لگایا ہے؟''

''میں پڑھتی ہوں۔ ہر ہفتے، ہم سب پڑھتے ہیں۔'' اس نے تیزی سے کہا۔ میرے چہرے پر حیرانی دیکھ کر وہ سرعت سے وجہ تک پہنچی۔

''آپ صحیح سوچ رہی ہیں۔ میگزین مہنگا ہے، خریدنا مشکل ہوتا ہے۔ میرا بھائی ہاکر ہے نا، اخبار اور میگزین ڈالتا ہے تو اس لیے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' مجھے یقین آ گیا۔

''فیکٹری میں نائن ٹو فائیو کام کرنے اور کبھی اوور ٹائم کے بعد تو بالکل وقت نہیں ملتا مگر میں پڑھنے کے لیے یا کم از کم دیکھنے کے لیے ٹائم ضرور نکال لیتی ہوں۔'' اس نے اپنے تئیں سب کچھ واضح کیا۔''بارہ جماعت پاس ہوں میں؟'' اس کے انداز میں تفاخر آ گیا۔

''مگر تم زیادہ قابل لگتی ہو۔'' میں نے سچائی بیان کی۔ وہ بری طرح جھینپ گئی۔

''میں سب کو بتاؤں گی کہ...... دراصل میں نے آج تک کسی لکھنے والے کو دیکھا تک نہیں کہ......'' وہ تذبذب میں گھری۔

''کہ وہ انسان ہی ہوتے ہیں نا!'' میں نے جملہ مکمل کیا۔

''نہیں، نہیں ایسی بات نہیں۔ ابھی مجھے چوٹ لگی تو میں نے سوچا آج بہت برا دن تھا اور اب میں کہہ رہی ہوں کہ آج میری زندگی کا سب سے اچھا دن ہے۔ انسان اپنے خیالات کتنی جلدی بدل لیتا ہے نا۔'' وہ اپنی بات کے اختتام پر ہنسی۔

''بالکل بدل لیتا ہے مگر میری ایک بات کو درخواست سمجھو یا حکم یا کچھ بھی۔ پلیز میرے سحر راغب ہونے کا چرچا مت کرنا۔ مجھے اچھا نہیں لگے گا۔''

''وہ کیوں؟'' وہ متحیر تھی۔

''بس ہے کوئی وجہ، کبھی بتاؤں گی۔''

''تو کیا ہم دوبارہ ملیں گے؟'' وہ حیرت کے

سمندر میں غوطہ کھا گئی۔
''کیوں کیا ہم دوست نہیں بن گئے۔''
''کب؟'' اس کے ابھرتے سر کو جیسے میں نے ایک اور غوطہ دیا۔
''ابھی جب میں تمہیں سہارا دے کر اوپر لا رہی تھی۔ سہارا دوست ہی دیتے ہیں نا۔''
''مگر میں تو بہت عام سی لڑکی ہوں اور آپ......''
''میں تم سے بھی زیادہ عام ہوں، سمجھیں! چلو چائے لو۔'' ''آپ کے گھر میں کون، کون ہے؟''
''میرے میاں اور دو بیٹے بس۔ میاں کام پر اور بیٹے کوچنگ۔ جڑواں ہیں اور میٹرک میں ہیں۔''
''اتنے بڑے بچے......''
''نہیں، لیے تو چھوٹے تھے مگر رکھے رکھے بڑے ہو گئے۔'' اس کے کھلے منہ اور جملے کے تحیر نے مجھے بھی متحرک کر دیا تھا۔ میں نے اسے چھیڑا۔
''ہا ئیں!'' وہ حق دق رہ گئی۔
پھر میری شریر ہنسی میں اس کی جھینپی جھینپی سی ہنسی شامل ہو گئی۔
☆☆☆
وہ اکثر تو نہیں مگر آنے لگی اور مجھے اس کا آنا اچھا لگتا تھا۔
''جب کبھی آپ کو کچھ لکھنا ہو تو مجھے بتا دینا۔ ایسا نہ ہو کہ میں آپ کا ٹائم خراب کرتی رہوں۔''
''ایسا بالکل نہیں ہے اور اگر کبھی ہوا تو میں بتا دوں گی۔''
دراصل اس کی باتیں مجھے اچھی لگنے لگی تھیں۔ وہ مجھے اس دنیا کی جھلک دکھلا رہی تھی، جو شاید میری نظروں سے اوجھل تھی۔ میرا اپنا تعلق مڈل کلاس سے تھا مگر وہ غربت کی لکیر کے نیچے رہنے والوں کے اصل سے واقف تھی اور اس کی واقفیت میرے، بہت کام کی تھی۔
غربت کے بارے میں میری معلومات قیاس، قیافے تک محدود تھیں، جبکہ وہ آپ بیتی سنایا کرتی تھی، دکھایا کرتی تھی۔
اس کے پاس گنتی کے چند جوڑے تھے۔ عام سے گھر کے سلے، آڑی ترچھی سلائیوں والے۔ سستا کپڑا، چند روپے گز کے ربن، فیتے، ڈیڑھ دو سو والی جوتی، دو سو والا پرس۔ البتہ اس کا سیاہ گاؤن نیا صاف ستھرا اور چمک دار ہوتا تھا، میں نے تعریف کی تو اس نے مجھے حق دق کر دیا۔
''روز — فیکٹری جانا ہوتا ہے۔ اب اتنے کپڑے تو بنائے نہیں جا سکتے، میں اکثر ایسی لڑکیوں کو جانتی ہوں جو اتوار بازاروں سے استعمال شدہ کپڑے خرید لیتی ہیں۔ کبھی پٹی جوتیاں، ہاں گاؤن اچھا چڑھا لیتی ہیں۔ آپ بھی دیکھیے گا، سر سے پیر کے تلوے کو چھوتا سیاہ حجاب ہر شے کو چھپا لیتا ہے۔ بہت سی تو اندر کام کرتے ہوئے بھی حجاب نہیں اتارتیں۔ گاؤن سب کے نئے چمکیلے ہوتے ہیں۔''
''تو اتنی محنت کا کیا فائدہ؟ اپنے لیے دو جوڑے بھی نہ بنا سکیں۔ تنخواہ کہاں جاتی ہے۔''
''تنخواہ!'' وہ استہزائیہ ہنسی۔ ''یہ وہ ملازمت نہیں ہوتی جو شوقیہ کی جائے جوڑے بنانے کے لیے۔ ہمیں تو یومیہ اجرت...... مزدوری ملتی ہے۔ کچھ مہینے بھر کی مزدوری پرچون کو بقایا میں دے آتی ہیں۔ کچھ کمیٹیاں بھرتی ہیں۔ کچھ جہیز کے لیے جو سر مشین اور بیڈ شیٹس خرید کر لے آتی ہیں۔ کچھ نکمے شوہروں کی اولادوں کو پالتی ہیں۔ ہر لڑکی کے گھر میں یتیم بھانجے، بھانجیاں یا بھتیجے، بھتیجیاں ہوتے ہیں۔ کچھ سالوں میں ہمارے ملک میں بچے پیدا کم ہوئے اور یتیم زیادہ...
آپ کو پتا ہے کائنات اپنے اصل کو واپس پلٹ کر پھر انجام کو پہنچے گی۔ زمین کے آغاز پر انسان کم تھے۔ انجام تک پہنچتے پہنچتے بھی انسان کم کر دیے جائیں گے۔ دہشت گردی سے، سیلابوں، طوفانوں سے، بھوک و افلاس سے مار دیا جائے گا۔ گاجر مولیوں کی طرح کاٹ دیے جائیں گے۔ انسان پیدا ہوا تو جسم ڈھانپنے کے علم سے ناواقف تھا۔ مادر پدر آزاد گھومتا تھا۔ پھر شاید اس برائی بدہیئتی نمایاں ہوئی ہو گی تو پتے باندھنے لگا۔ پھر عقل و علم بڑھا تو سر تا پیر لباس میں چھپ گیا۔ زیادہ علم و عقل دماغ پلٹا دیتی ہے۔ اب پھر سے پتے باندھنے پر آ گیا ہے، ننگا

گھومنے میں فخر کرتا ہے۔
آپ دیکھیے گا سحر جی! ابھی صرف دوپٹا غائب ہوا ہے، شاید ہم اس وقت نہ ہوں اور اللہ کرے نہ ہی ہوں جب دوپٹے کے بعد قمیص اور...... جانے دیں۔
دراصل انسان دوبارہ روز اول کی طرف لوٹ رہا ہے، جب وہ صبح اٹھ کر خوراک کی تلاش میں بھٹکتا تھا۔ جان توڑ محنت کے بعد اسے اتنا کم کھانا حاصل ہوتا تھا کہ اسی پریشانی میں مبتلا ہو جاتا تھا کہ خود کیا کھائے اور گھر کیا لے کر جائے اور ابھی کل کے لیے بھی تو بچانا ہے۔ اتنے کم کو اتنے حصوں میں کیسے تقسیم کرے گا اور پھر کل ملے نہ ملے......
ہم ڈیلی ویجز پر کام کرنے والے لوگ بھی اسی ننگے دھڑنگے وحشی انسان کی طرح ہیں۔ جان توڑ محنت کرتے ہیں اور معاوضہ اتنا کم ملتا ہے کہ کسی خانے میں بھی فٹ نہیں بیٹھتا۔ ہمارے پاس بھی لباس نہیں ہوتا۔ ہم بھی پتے یعنی یہ چیتھڑے باندھتے ہیں اور ہمیں بھی کل کی فکر ہوتی ہے کہ پتا نہیں کل شکار ملے گا کہ نہیں ملے گا۔ ہڑتال، بلاوجہ فائرنگ، کرفیو، پہیہ جام، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''
''ایک بات کہوں شفا! تم اس روز کہہ رہی تھیں کہ میرا تمہیں ملنا تمہاری زندگی بدل دے گا۔ پتا نہیں میرے اندر وہ گن ہیں یا نہیں، جو زندگیاں بدل دیتے ہیں، مگر میں تم سے مل کر بدل رہی ہوں، یقین کرو۔ تم اتنی اندر کی بات کیسے کہہ دیتی ہو، اتنی گہرائی۔'' ''گہرائی نہیں، پستی کہیں۔ ہم سب پستیوں میں رہتے ہیں اور وہاں ایسی ہی باتیں ہوتی ہیں۔ ہم سب ایسا ہی سوچتے ہیں، بلکہ اس سے بھی گہرا مگر کہتے نہیں ہیں کسی سے۔ آپ کے لیے یہ باتیں نئی ہوں گی، اس لیے آپ حیران ہو رہی ہیں۔ میں اپنے اردگرد کے لوگوں کو یہ سب سنانے بیٹھوں تو وہ ایک جھاڑ پلائیں گے کہ کس کو سنا رہی ہے، کوئی نئی بات کر...... شاید ان کے پاس بیان کی قوت نہیں، وہ وضاحت نہیں دے سکتے۔ مگر ان سب کے دلوں میں یہی ہے۔
اور جہاں تک میری بات ہے، میں بھی کسی کے سامنے ایسے نہیں بولتی۔ بس آپ کے سامنے نہ جانے کہاں سے جملے بنتے چلے جاتے ہیں۔ آپ کو اچھے لگتے ہیں، پتا نہیں کیوں۔'' وہ اتنی علمیت دکھانے کے بعد سادگی سے مسکرا دیتی۔
''تم اشفاق احمد والا بابا تو نہیں ہو۔'' میں نے جیسے گتھی سلجھائی۔
''مجھے ان کے بابوں کا تو پتا نہیں، البتہ اپنے جیسے بہت سے بابوں سے میں آپ کو ملوا سکتی ہوں، بلکہ بابے نہیں، بابیاں۔'' وہ زور سے ہنس دی۔

☆☆☆

''آپ ایک کہانی لکھیں، جس کی ہیروئن کا نام شفا ہو۔'' اس نے فرمائش کی تھی۔
''اور ہیرو شفاعت۔'' میں نے ٹکڑا جوڑا۔
''اللہ!'' وہ لال سرخ ہو گئی۔ ''آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ ہیرو شفاعت ہی ہوگا۔''
''تو کیا نہیں ہے؟'' میں نے جلدی سے کہا۔
وہ لاجواب ہو گئی۔
''بس ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں، بلکہ جان گئے، پتا نہیں کیسے؟'' وہ الجھ سی گئی۔
''ہم مین روڈ سے بس میں اکثر اکٹھے ہوتے تھے۔ وہ بلدیہ اسٹاپ سے چڑھا کرتا تھا۔ میں اس کی شکل آشنا تو تھی۔ نام کے سلسلے میں بس اتفاق ہو گیا۔ آگے پیچھے اندر داخل ہوتے ہوئے شفاعت پکارا تو میں بھاگی گئی، شفا کہا گیا تو وہ الرٹ ہو گیا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ ایسے ہی جان پہچان بن گئی۔''
''تمہیں قدرت ملوا رہی ہے لڑکی! اشارہ سمجھو۔'' میں نے اسے چھیڑا۔ ''اچھا وہ ہے کیسا؟'' مجھے اشتیاق ہوا۔
''کیسا ہوتا ہے، لمبا ہے اور بہت دبلا پتلا ہے اور ہاں کالا بھی بہت ہے۔''
''کالا......!'' میں چلائی۔ ''کتنا کالا......؟''
''کالا...... کالا ہوتا ہے، کتنا کا کیا مطلب ہے؟'' ''نہیں۔ کوئی مثال تو دو، سنگھاڑے جیسا، الٹے توے جیسا، یا پھر...... پنسل کے سکے جیسا۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا، بس ہنستی رہی۔

''رنگ کو چھوڑیں، آپ محبت کہانی لکھیں، سیدھی سادی کہانی...... جس میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ لڑکا لڑکی نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا۔ ان کے گھر والوں نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا اور ان کی شادی ہو گئی۔''

''ہائیں...... !'' میں حق دق رہ گئی۔ ''تو اتنی سیدھی کہانی پڑھے گا کون؟''

''لوگ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ ہیروئن رو، رو کر پاگل ہو جائے اور ہیرو سر ٹکرا ٹکرا کر لہولہان کر لے۔ اگر سب کچھ ہنسی خوشی ہو رہا ہے تو پڑھنے والا کا کیا جاتا ہے۔ وہ بھی خوش ہو لے۔'' وہ ناگواری سے کہہ رہی تھی۔ میں فرماں برداری سے سر ہلاتی رہی۔

''پھر آپ لکھیں گی نا محبت کہانی؟''

وہ لجاجت سے میرا ہاتھ چھو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر آس، امید اور مان تھا۔ میں ہار گئی۔

''ہاں لکھوں گی۔'' میں نے اس کا گال تھپتھپایا۔

☆☆☆

عید منانے اور عید کے فوراً بعد رکھی جانے والی شادیاں نپٹانے کے بعد میں لوٹی تو بچوں کے اسکول کا آغاز ہوتا تھا۔ اتنے دنوں سے بند گھر بھی توجہ مانگ رہا تھا اور سب سے بڑھ کر میرا لکھنے کا کام۔ ایک ہفتہ کیسے گزرا پتا نہیں چلا۔

ٹیرس کی صفائی ستھرائی، پودوں کی دیکھ بھال کر کے جب میں لکھنے کے لیے اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھی تو دھیان شفا کی طرف چلا گیا۔ کتنے روز سے کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ میں ریلنگ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ میرا گھر کونے کا تھا اور دو رویہ سڑک کے بعد میرے گھر کے عین سامنے بہت بڑا مدرسہ تھا۔ اسی مدرسے کے باعث میں ٹیرس پر بڑی بے فکری سے بیٹھ جاتی تھی۔

شفا کا گھر نیول آبادی کے باہر پیچھے کی طرف تھا۔ وہ حفاظت کے خیال سے گولف کورس اسٹاپ پر اتر کر نیول کمپاؤنڈ کے اندر سے جایا کرتی تھی۔ یہ راستہ یقیناً کچھ لمبا تھا، مگر محفوظ تھا۔

ہماری فون پر بھی بس ایک بار بات ہوئی تھی۔

''اگر اوور ٹائم کر رہی ہوئی تو ابھی نہیں گزری ہو گی۔'' میں قیاس کے گھوڑے دوڑا رہی تھی۔ اور میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ آ گئی تھی۔

''میں آج بھی نہ آتی۔ مگر بس رہا نہیں گیا۔ لائٹ جلتی دیکھی تو۔'' وہ جھینپتے ہوئے صفائی دے رہی تھی۔ ''پر ہم تو ایک ہفتے سے آئے ہوئے ہیں۔'' میں مسکائی۔

''مگر اوپر اندھیرا تھا نا؟''

''بالکل تھا، اوپن ایریا ہے نا، سب سے زیادہ گندگی یہیں تھی۔ میں نے ہفتہ لگا کر نیچے سب سمیٹا اور آج مانی، ثانی کے ساتھ مل کر نقشہ درست کیا ہے۔'' میں نے چہار اطراف دیکھا۔ ''کیسا لگ رہا ہے؟''

''ایک دم شان دار چمکیلا چمکیلا۔'' اس نے دل سے سراہا۔ ''اور تم بھی تو بہت چمک رہی ہو۔ ہے نا، بالکل نکھری نکھری، نئی نکور، کیا ہوا ہے؟''

میں اس کا عمیق نگاہی سے جائزہ لے رہی تھی۔ میرے شریر لہجے پر وہ سفید ہوئی، پھر گلابی اور پھر اس کا سلونا چہرہ تمتمانے لگا۔

''کیا ہوا ہے شفا بی بی؟'' میں کچھ بہت اچھا سننے کو تیار ہوئی۔

''منگنی۔'' اس نے بمشکل کہا۔

''شفاعت سے نا؟'' میرا انداز ''وہ مارا'' والا تھا۔ وہ جواباً کچھ نہ بولی، بس بیر بہوٹی بن گئی۔

وہ سیدھی سادی کہانی پسند کرتی تھی۔ اسے اعتدال پسند تھا۔ اسے وہی سب ملا۔ اللہ نے اس کی زندگی میں آسانی پیدا کر دی تھی۔

بہانے ہی بنتے ہیں زندگی میں ملنے کے، بچھڑنے کے۔ بس ان کے ناموں میں کچھ صوتی مماثلت تھی، جو پہچان بنی۔ وہ اتفاق سے ایک ہی بس میں آیا کرتے تھے۔ ایک دن حالات خراب ہونے پر وہ اسے کسی سے بائیک مانگ کر بہت فکر مندی سے گھر تک چھوڑ گیا۔ اب ناموں پر چونکنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ شفا اور وہ شفاعت۔

اس نے اسٹاپ پر کھڑے ہو کر باتیں متشار نے

سے بہتر یہ جانا کہ ایک ہی بار دوٹوک بات کر لے۔ ممی والی شادی اور شفا جھٹ مان گئی۔ وہ حقیقت پسند لڑکی تھی۔ اسے خبر تھی۔ اس کے طبقے کی لڑکیاں ایسی آفر کے انتظار میں بالوں کی چاندی تک کو نوچنے پر آجاتی ہیں۔

وہ زندگی کی مشکلوں، بلاوجہ کے کھڑاک سے گھبراتی تھی۔ اس کے گھر میں اس رشتے کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور شفاعت کے گھر میں شفا کو...... وہ دونوں مل کر کام کریں گے جیسے ابھی کرتے ہیں۔ مشترکہ فیصلہ......

''میں نے سال پہلے اپنے گھر کے اوپر اپنے لیے کمرا ڈلوایا ہے۔ گرمیوں میں تپتا ہے، مگر تم فکر نہ کرو، میں چھت پر تھرموپول شیٹس رکھ دوں گا اور بہت سے گملے......اور ہم کون سا گھر میں ہوا کریں گے دن میں...... صبح اکٹھے نکلے شام کو واپس۔ رات کو چھت پر چارپائی ڈالو تو ایسی ٹھنڈی ہوا آتی ہے، ہاکس بے کے ساحل کی جانب سے کہ بس......''

دونوں نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ ان کے بس دو بچے ہوں گے، بھلے بیٹے ہوں یا بیٹیاں۔ لمبی لائن نہیں۔ ''تم بہت لائق اور سمجھ دار ہو شفا! بچے بھی تمہارے جیسے ہوں گے محنتی اور صاف گو۔'' شفا کے لیے یہی سب سے بڑی خوبی تھی۔

''اب تو ملنا پڑے گا جناب شفاعت صاحب سے۔'' میرے اندر سے خواہش پھوٹی۔

''ہاں نا...... تو وہ بھی تو آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ کہہ رہا تھا میں تو ہزار بار اس گھر کے پاس سے گزرا ہوں۔ مجھے نہیں پتا تھا وہاں اتنی بڑی رائیٹر رہتی ہیں۔''

''پاگل ہو تم......'' اپنی تعریف پر میں ہمیشہ ایسے ہی آئیں بائیں شائیں پر آجاتی تھی۔

''ویسے آپ کیوں نہیں چاہتیں کہ لوگ آپ کو جانیں پہچانیں؟''

''تم بار، بار یہ سوال کیوں کرتی ہو؟''

''آپ ہر بار ٹالتی کیوں ہیں؟''

''یہاں اس علاقے میں میری عزت، پہچان ایک ہاؤس وائف کی ہے۔ میرے بچے، میرے شوہر، عام عورت کی طرح رہتی ہوں۔ لوگوں کے اندر تک گھس جاتی ہوں، گھنی میسنی بن کر۔ خاص ہو کر سب کے سامنے آئی تو تمہارہ جاؤں گی۔ ابھی تو لوگ اپنا دل کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ پھر کوسوں دور بھاگنے لگیں گے۔ میں نے کئی بار آزمایا ہے اور مجھے یوں عام بن کر رہنا بہت اچھا لگتا ہے۔ جہاں خاص ہوں، وہاں ہوں۔''

''یہ تو آپ نے بہت ہی اندر کی بات بتائی۔'' اس کی آنکھوں میں ستائش ابھر آئی۔

''ابھی بھی کچھ محلے پڑوس کی عورتیں کہتی ہیں۔ سارا دن گھر میں گھسی رہتی ہے۔ دو بچے ہیں اس کے گھر میں کام ہی کیا ہے، مغرور ہے۔''

میں ہنسی تو وہ بھی زور سے ہنس دی۔

اس کی ہنسی میں بڑی جلترنگ تھی، نیاپن۔

آنکھوں میں ستاروں کو ماند کرتی چمک۔

وہ آٹھ نو سو والے فیروزی رنگ کے چکن کے سوٹ میں ملبوس تھی اور وہ اسے شفاعت نے دلایا تھا ہفتہ بازار سے، اس کے پیروں میں نئی چپل تھی اور پرس بھی نیا تھا۔

چہرہ ہمیشہ کی طرح سادہ تھا، مگر اندرونی خوشی و جوش نے کسی آرائش کی کمی نہ چھوڑی تھی۔

''کہانی تو بہت عام سی ہے شفا! سیدھی مگر اس کے مکمل ہونے پر جو خوشی ملی ہے اس کا مول کیا لگاؤں سچ میں! آئے دن انجام لکھتی ہوں، موڑ دیتی ہوں، سنسنی پھیلاتی ہوں، پھر سمیٹ لیتی ہوں، مگر اتنا سکھ کبھی نہ ملا۔ تم ایسی ہی سیدھی کہانی لکھنے کو کہہ رہی تھیں نا۔''

وہ جواباً کچھ نہ بولی، اپنی مدھم ہوتی مہندی کے نقش کھوجتی رہی۔

''نہ بہت دولت، نہ خون چوستی غربت۔ محنت، اخلاص، تعاون، صبر شکر، قناعت کے دائرے میں گھومتی زندگی۔ کوئی ظالم سماج نہیں۔ کوئی اعتراض

نہیں...... میں اس کہانی کو بہت اہتمام سے لکھوں گی۔"

"پر آپ تو کہتی ہیں لوگ ایسی کہانی نہیں پڑھتے؟"

"ہیرو، ہیروئن تو پڑھیں گے نا۔" میں نے اس کی ٹھوڑی چھوئی۔ "ہر کہانی ہر ایک کے پڑھنے کے لیے نہیں ہوتی۔"

☆☆☆

اور محبت کہانی سیدھی ہو سکتی ہے۔

مگر......

زندگی کہانی کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔ پر پیچ، بے لچک، کٹھور، بے حس، اندھی، بہری، بے رحم......

"تم اپنے قبیل کی دوسری لڑکیوں نسبت بہت سادہ رہتی ہو؟"

"ہاں ...... میں ایسی ہی ہوں، مگر آپ کی الجھن صحیح ہے۔ فیکٹریوں میں کام کرنے والیاں سنگھار کی بہت شوقین ہوتی ہیں۔ مگر وسائل نہیں ہوتے۔ وہ اپنی چند بڑے نوٹوں والی تنخواہوں سے کچھ سکے، کچھ چھوٹے نوٹ مٹھی میں بند کر کے اتوار بازاروں کا رخ کرتی ہیں۔

دس روپے کا کلپ...... بیس روپے کا کڑا...... پانچ روپے والی پونیاں ...... کلائی میں سرخ یا سیاہ دھاگہ باندھ لیں گی۔

ننانوے فیصد حجاب لیتی ہیں۔

مگر آنکھوں کو سجانے کا شوق ہوتا ہے۔ وہ کاجل ہی سے مسکارا اور لائنر کا کام لے کر آنکھوں کو سنوارتی ہیں۔

ہاتھوں پیروں کو سستی نیل پالش سے سجاتی ہیں اور کانچ کے چھلے اور اسٹیل کی انگوٹھیاں۔ پیروں میں پازیب یا وہی کالا دھاگا۔

ہر ایک پرس میں آئینہ لازمی ہوگا۔ مسلسل محنت کی تھکان چہرے پر نقش بن کر ابھر آتی ہے۔ مگر ہر روز سارا دن کے لیے مشینوں کے آگے جھک جاتی ہیں۔ شام کو پھر چڑیوں کے غول کی طرح واپسی کی اڑان بھرتی ہیں اور بچا ہے، چہچہاتی بھی ہیں۔ مگر ان کی زبانیں بہت تلخ ہوتی ہیں اور دنیا جہان کی گالیاں بھی انہیں ازبر ہوتی ہیں۔ ابن آدم کی بدنگاہی اور زبان کی غلاظت سے نپٹنے کے لیے گالیاں سب سے کارگر ہتھیار ہوتی ہیں۔

یہاں اس شامیانے میں جگہ جگہ اتنی کہانیاں بکھری تھیں کہ یہ زندگی تو کم تھی انہیں صفحہ قرطاس پر بکھیرنے کے لیے۔ شاید دو چار جنم مل جائیں تو......

مگر فائدہ ...... اتنی کہانیاں اور تمام کی تمام دکھی۔

"میں نے محبت کہانی کو لکھ لیا تھا شفا! بہت خوب صورت۔ الفاظ سے آراستہ کر کے۔ جملے، تشبیہات، پھول، خوشبو، ہوا، بادل، مسکراہٹ، خوشی" میں نے سیدھی محبت کہانی کو مرصع و مسجع کر کے کاغذ پر بکھیر دیا تھا۔

وہ خوشی کی کہانی تھی۔ قناعت و صبر کی، اعتماد و اعتبار کی سکھ اور سہولت کی۔

میرے بہتے آنسو کسی کو سوال پر نہیں اکسا رہے تھے۔

یہاں سب آنکھیں بہہ رہی تھیں یا پتھرا گئی تھیں۔

میں گھنی میسنی بن کر پوشیدہ رہ کر پنڈال میں بیٹھی تھی۔

ہم لکھنے والے ہمیشہ کہانی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ خود غرض۔

لیکن میں انسان بھی تو ہوں۔ میں اتنا دکھ کیسے سہوں، کیسے دیکھوں۔

اور کیسے لکھ سکتی ہوں اور پیش کیسے کروں گی۔

خوشی کہانی کو دکھ کا انجام کیسے دوں؟

اور سنگھار کی شائق لڑکیاں......

پہچان میں نہ آ رہی تھیں۔ ان کے شوق، ان کی شناخت سب بھسم ہو چکے تھے۔ ان کے وہ آئینوں والے پرس بھی خاکستر ہو گئے۔ اچھا ہوا نا......

ورنہ اب کی بار آئینے جو چہرہ دکھاتے، کیا ان کو

چیرو کہتے ہیں۔
اسٹریچر پر کوئی لاش چت نہیں تھی۔ اکڑی، لٹکی، مدد کو پکارتے ہوا میں لہراتے ہاتھ...... آسمان کو اٹھی آنکھیں اٹھی ہوئی گردنیں......

وہ سب پہچان میں نہیں آتے تھے۔ مگر وہ انسان تو تھے نا۔

جلے گوشت کی بو......

''تمہارا کون مرا ہے؟'' کوئی عورت میرے ساتھ آ لگی۔

اور میں کیا کہتی، میرا کون مرا ہے۔ ان چالیس جنازوں میں میرا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔

اور ان جل جانے والوں کا تو خون بھی جل گیا تھا۔ پہچان ہو تو کس صورت سے۔

میں شفا کے گھر چلی آئی۔ اس کا بھائی مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا۔

''مجھے یقین تھا آپ آئیں گی۔''

''میں یہاں سے واپس کیسے جاؤں گی؟'' میرے لبوں سے چیخیں نکل رہی تھیں۔

وہ اسٹور نما کمرا تھا۔ جہاں ایک چارپائی پر سفید بڑی آسمانی چادر سلیقے سے بچھی تھی۔ بستر بے شکن تھا مگر اس کی مالکہ کا جسم سلوٹ سلوٹ، سکڑ کر اتنا مختصر رہ گیا تھا کہ اسے قبر میں ایک گٹھڑی کی طرح رکھ دیا گیا ہوگا۔

کمرے میں رسائل اور اخبارات کا ڈھیر تھا۔ سالوں پرانے شمارے، اخبار، مضامین، اس کا پرانا گاؤن، کھونٹی پر ٹنگا تھا۔ اس کی ٹوٹی جوتی دروازے کے پاس پڑی تھی۔

''تم بہت عقل مند ہو۔ بہت اعلا پائے کی گفتگو کرتی ہو۔''

''عقل مند نہیں، چالاک کہیں۔ جو کچھ اخباروں، رسالوں میں پڑھتی ہوں، انہیں اپنی گفتگو میں مکاری سے ایسے جوڑتی ہوں کہ لگے میرے اپنے الفاظ و خیالات ہیں۔'' وہ شرارت سے کہتی۔

''پر یہ فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔ لوگوں کے سر سے سالہا سال کا گیان گزر جاتا ہے۔ آخری پل تک گدھے کے گدھے ہی رہتے ہیں۔'' میں نے اسے سراہا تھا۔ ''یہ بھی تو تمہاری ذہانت کی دلیل ہے نا کہ کس چیز کو کہاں، کیسے، کب پیش کرنا ہے۔''

''آپ کو میری تعریف کر کے پتا نہیں کیا ملتا ہے۔'' وہ الجھ کر شرمائی۔ ''میں ایسی باتیں اپنے ابا، اماں کے سامنے کروں نا تو وہ مجھے پگلی کہیں۔ اماں تو صاف بھائی کو الزام دیں گی، تو ہی الٹا سیدھا پڑھنے کو دیتا ہے۔''

اس بوسیدہ کمرے کے ہر کونے میں شفا تھی۔ مگر شفا نہیں تھی۔ وہ اب کہیں نہیں تھی۔

اس کی آواز، اس کی آنکھیں ہر شے سے جھانک رہی تھیں۔ مگر وہ نہیں تھی۔

اور......

میری اس کی پہلی ملاقات کا باعث ایک دردناک، دلخراش چیخ تھی۔ اس کے پیر سے بھل بھل نکلتا خون، آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھا تھا اور ہر موئے جاں سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔ تکلیف کی شدت، برداشت کی انتہا۔

''مجھے ان چھوٹے چھوٹے زخموں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ مجھے خون سے، آگ سے، کٹ جانے سے بہت خوف آتا ہے۔ میں کسی کو زخمی دیکھ ہی نہیں سکتی۔ زخمی سے زیادہ حال میرا خراب ہو جاتا ہے۔ استھما کے مریض کی طرح سانسیں بے قابو ہو جاتی ہیں۔''

''اور تم کتنا چیخی ہو گی شفا!'' میں اس کی چارپائی پر پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔ ''تم نے یہ تو بتایا تھا تمہیں چھوٹے زخموں سے ڈر لگتا ہے۔ بڑے سے کیسے نہ لگتا ہوگا۔''

''زندگی ایسی کیوں نہیں ہو سکتی کہ سب سہل ہو۔''

''اپنی خواہشات کا پہاڑ بنا لیتے ہیں اور اس پر چڑھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کوئی ہم تک پہنچے تو کیسے پہنچے۔''

آوازیں یادداشت سے سر اٹھاتی جا رہی تھیں۔
''وہ میرے ساتھ جینے مرنے کی قسم کھا رہا تھا۔
میں بس ہنس دی۔''
''ایسا کیوں ہوتا ہے سحر جی! لوگ ساتھ جی لیں۔ تو دنیا داد دیتی ہے۔ ساتھ مر جائیں تو ایک عالم ماتم کے لیے آ جاتا ہے دنیا یہ کیوں نہیں سوچتی کہ کہنے والے کی قسم پوری ہوئی۔ عہد تکمیل کو پہنچا۔ ارادہ اٹل رہا۔''
''مجھے شفاعت کے ہر جملے پر یقین آ جاتا ہے، وہ دعوے نہیں کرتا۔ میں اس کے ساتھ جی کے خوش رہوں گی۔ خالی جینے کی بات نہیں میں اس کے ساتھ مر کے بھی خوش رہوں گی۔''
''شفاعت...... شفاعت کا پتا لگا؟'' میرا گلا بے آواز رو، رو کر بیٹھ چکا تھا۔
''نہیں۔ وہ نیچے گودام میں تھا۔ شاید آج ڈی این اے کے ذریعے معلوم ہو۔''
''مجھے بتانا۔'' میں تو اسے دیکھنا چاہتی تھی، اس سے ملنا چاہتی تھی۔
شفا کہنے لگی ''وہ شرما گیا تھا۔''
میں نے کہا۔ ''شادی پر دیکھ لوں گی۔''
☆☆☆
میں ضیاء کے لاکھ منع کرنے اور مانی، ثانی کے متامل انداز کے باوجود چلی گئی تھی۔ شفاعت کے گھر......
چھت پر کھڑا کمرہ ایک گھونسلہ تھا ایک چہچہاتی گہری بات کرتی چڑیا کا اور کسی کے خوابوں کا مسکن تھا۔
یہاں مجھے پہچاننے والا کوئی نہیں تھا۔ دوست دشمن، اپنے پرائے ایک جنازے سے اٹھتے تھے اور دوسرے پر جا بیٹھتے تھے۔
میں نے شفا کی آنکھوں کی چمک میں شفاعت کو کھوجا تھا۔
مسکراہٹ کے عقب میں اسے جانچا تھا۔
ہنسی کی جھنکار میں شفاعت تھا۔ مگر میں نے اسے دیکھا نہیں تھا۔
''اچھا کیسا ہے وہ......؟''
''کیسا ہونا چاہیے؟ لمبا ہے اور بہت دبلا پتلا ہے اور ہاں کالا بھی بہت ہے۔'' ''کالا۔ کتنا کالا؟''
''کالا، کالا ہوتا ہے، کتنا کیا مطلب؟''
''نہیں کوئی مثال دو۔ سنگھاڑے جیسا، الٹے توے جیسا، یا پھر پنسل کے سکے جیسا۔''
ایک ہنسی سماعتوں کے در کھٹکھٹانے لگی۔
''صرف کہانیوں کے ہیرو گورے چٹے، سنہرے بالوں والے، عنابی لبوں والے ہوتے ہیں حقیقی ہیرو تو کالا ہی ہوگا۔''
''ہاں تو ٹھیک ہے کالا ہی رہے، مگر آخر کتنا؟''
اس کے بہت کالا، دبلا، پتلا، لمبا کہنے سے میرے ذہن میں جو تصویر بنتی تھی۔ توبہ...... لاحول!
''آخر پتا تو چلے کتنا کالا؟''
وہ میری پریشانی کا حل ڈھونڈنے کے لیے میرے گھر کو طائرانہ دیکھتی۔ فرش کو، چھت کو...... مگر کوئی تشبیہ مناسب نہ لگتی۔ وہ مختلف جانب دیکھتی، پھر نفی میں سر ہلاتی۔ پھر الٹی سیدھی چیزوں کے نام لیتی۔
''حبشی حلوہ کھایا ہے کبھی؟''
''جامن کالے، گرمی کا توڑ، ہونہہ...... اوں۔''
''بینگن...... ہی ہی ہی۔''
میں اسے خشمگیں نظروں سے گھورتی اور اس کے ہنستے چہرے اور ہنستی آنکھوں کو دیکھ کر خود بھی ہنس دیتی۔
''تم نے سارے جہان کی مثالیں دے دیں۔'' میں نے شدید خوف کے عالم میں بے ساختہ اپنا چہرہ ہتھیلیوں میں چھپا لیا۔ تابوت کے اندر...... وہ ...... شفاعت۔
جھرجھری کے باعث جسم لرزہ براندام تھا اور رواں رواں کھڑا ہوا۔
ساری تشبیہات استعمال کیں، بس یہ نہ کہا۔
''جل کر راکھ...... سیاہ کوئلے جیسا۔''
میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
☆☆☆

مونا ملی

بات گو ذرا سی ہے

حریم کالج سے واپس آئی تو گھر میں داخل ہوتے ہی حسب معمول ماں کو تلاشتی ہوئی کچن میں آ گئی۔ امی کے گرد پیچھے سے بازو پیار سے حمائل کر دیے اور پوچھا۔ ''پیاری امی کیا بنایا ہے جلدی بتائیں بہت زور کی بھوک لگی ہے۔'' امی نے جواب دیے بغیر ہانڈی کا ڈھکن اتار کر کھانے کا دیدار کرایا۔ خوش رنگ تازہ بگھاری ہوئی خوشبودار ماش کی دال بہار دکھا رہی تھی۔ حسب توقع دال دیکھتے ہی اس کا منہ پھول گیا۔

''کیا ہے امی یار! میں آپ کو صبح بھی کہتے ہوئے گئی تھی کہ آج کچھ اچھا پکایئے گا۔ میرا اتنا دل چاہ رہا تھا بریانی، پلاؤ یا کچھ بھی اچھا کھانے کو۔ سارا راستہ میں وین میں طرح طرح کے کھانوں کے بارے میں سوچتی ہوئی آئی اور ملی تو ماش کی دال!''

ابھی اس کی لن ترانیاں جاری تھیں مگر امی کی برداشت یہیں تک تھی۔ صافی زور سے سلیب پر پٹخ کر امی اس کی طرف مڑیں۔



"بجو جی آج کیا تاریخ ہے۔"

"اٹھائیس۔" اس نے مری مری آواز میں جواب دیا جانتی تھی، اب امی کا لیکچر شروع ہوا چاہتا ہے۔

"جی اٹھائیس تاریخ۔ اکتیس کا مہینہ ہے تمہارے ابو کی تنخواہ دو یا تین تاریخ سے پہلے نہیں آتی۔ یہ چند دن میں نے اسی طرح کھینچ تان کر نکالنے ہیں۔ میں نے تمہیں ہزار بار سمجھایا ہے کہ کھانے کو دیکھ کر منہ بسورنا ناشکری ہے۔ گھر میں جو پکا ہو ہنسی خوشی کھایا کرو۔ کتنے لوگ ہیں جو کئی کئی وقت بھوکے رہتے ہیں، ہزار بار شکر ادا کیا کرو کہ ہزاروں کیا لاکھوں سے بہتر زندگی گزارتے ہیں، اچھا کھاتے پہنتے ہیں کیا ہوا اگر چند دن دال سبزی کھانا پڑے تو؟ بھوکے تو نہیں رہتے نا! اور مہینہ بھر میں چکن گوشت وافر پکتا ہے یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔ آج کے بعد میں تمہاری یہ فضول باتیں نہ سنوں غضب خدا کا، چند مہینے بعد اپنے گھر کی ہو جاؤ گی وہاں جا کر خبردار جو ولید سے فرمائشیں کر کے فضول خرچی کی!"

وہ پیر پٹختے ہوئے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد امی کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ انہیں حریم پر پیار آنے لگا وہ ان کی نہایت تابع دار اور فرماں بردار بیٹی تھی بس تھوڑی چٹوری تھی۔ کھانے پینے میں ہزار نخرے کرتی۔ وہ اس کے کمرے میں آ گئیں۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے سونے کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔ امی نے اس کے پاس بیٹھ کر پیار سے اس کے بال ماتھے سے ہٹائے اور کہا۔

"آؤ کھانا کھا لیں۔ پھر سو جانا۔"

وہ شہ پاتے ہی اٹھ بیٹھی۔

"اچھا بس ایک چھوٹا پیزا منگا دیں بس ابھی کے لیے! پرسوں رات کو مزے لے کر دال کھا لوں گی۔ آئی سویئر بہت دل کر رہا ہے۔"

امی نے فٹ سے جواب دیا۔ "بیٹا جی یہ اثر ہوا ہے میرے لیکچر کا؟ ایسا کچھ نہیں ہو رہا، ویسے بھی میرے پاس پیسے بالکل ختم ہیں۔ چلو شاباش آجاؤ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

وہ مرے مرے قدموں سے کچن میں آ گئی۔ اندر آتے ہی فریزر کھول کر جھانکا اور خوشی خوشی امی سے کہا۔ "اچھا دال کے ساتھ بس دو کباب تل لوں؟"

امی نے ماتھا پیٹ لیا۔

"ارے بابا پتا ہے تمہیں! کباب میں کسی اچانک آئے گئے کے لیے رکھتی ہوں۔ کبھی اچانک حمنہ آ جاتی ہے عباد بھی ساتھ ہوتا ہے۔ اچھا لگتا ہے سوکھی چائے پر داماد کو ٹرخا دوں، ویسے بھی صرف چھ کباب بچے ہیں۔ مہینے کا آخر ہے اللے تللے ابھی افورڈ نہیں کر سکتے چلو اب ایک لفظ بولے بغیر ہاتھ دھو کر کھانے کے لیے آ جاؤ۔"

ست رَوی سے وہ کھانے کے لیے بیٹھی۔ پتلی پتلی گرم چپاتیوں کے ساتھ ماش کی دال بلاشبہ مزے دار تھی۔ اس نے دل ہی دل میں دوسری چپاتی ختم کرتے ہوئے تسلیم کیا۔ منہ سے نہیں کہہ سکتی تھی ایک اور ڈانٹ پڑنے کا اندیشہ تھا۔ کھانے کی پلیٹیں دھو کر وہ کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کے لیے کمرے میں جانے کا سوچ رہی تھی کہ امی کی آواز پر چونکی۔

"جی جی آپا! ہم گھر پر ہی ہیں آپ ضرور آئیں رات کا کھانا یہیں کھایئے گا۔ ویسے بھی کتنے دن ہو گئے آپ کو چکر لگائے ہوئے۔ اچھا ہے نا اس بہانے گپ شپ رہے گی۔"

امی نے سعیدہ پھپھو کا فون بند کیا اور کچھ پل سوچ میں ڈوب گئیں۔ وہ دروازے پر کھڑی امی کو دیکھ رہی تھی۔ امی نے چند منٹوں تک کچھ حساب کتاب کیا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد حریم کے کمرے میں آئیں اور کہا۔

"دروازہ بند کر لو۔ سعیدہ آپا کھانے پر آ رہی ہیں۔ میں قریبی بازار سے آ رہی ہوں۔"

حریم نے دروازہ بند کیا اور اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ آدھے گھنٹے بعد امی کے آنے پر دروازہ کھولا

اور جو بستر پر گری تو مغرب کی اذان پر آنکھ کھلی۔
کچن سے اٹھتی اشتہا انگیز خوشبوؤں نے اس کو بے چین کر دیا۔ فریش ہو کر کچن میں آئی تو دیکھا اس کی پیاری امی نے تقریباً تمام تیاری کر لی تھی۔ قیمہ تیار تھا چکن پلاؤ دم پر تھا۔ میٹھا فریج میں، امی نے اس کو دیکھتے ہی ہاتھ دھوتے ہوئے کہا۔
''اچھا ہوا تم اٹھ گئیں۔ کھانا تیار ہے تم آپا کے آنے پر کباب تل لینا اور رائتہ بنا لینا۔ میں نے چٹنی بھی تیار کر دی ہے۔ اب میں ذرا دو گھڑی کمر سیدھی کر لوں۔ آپا اور نعیم بھائی آتے ہی ہوں گے۔''
کھانے کا مینیو سنتے ہی اس نے شکوہ کناں آنکھوں سے امی کو دیکھا۔ وہ سمجھ کر بھی انجان بنتی ہوئی کچن سے چلی گئیں۔
پھر پھپھو کے آنے اور کھانے کے دوران بھی اس کا ناراض چہرہ امی کی نگاہوں کا مرکز رہا۔ اس نے اچھے طریقے سے کھانا سرو کیا۔ کھانے کے بعد چائے اور کچن کا پھیلاوا سمیٹنے میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ مگر امی اچھی طرح جانتی تھیں کہ حریم ناراض ہے۔ اس کی آنکھوں کا گلہ ان سے پوشیدہ نہ تھا۔ اس لیے پھپھو کے جانے کے بعد وہ اس کے کمرے میں آ گئیں۔
حریم اپنا بیگ کل کے لیے سیٹ کر رہی تھی۔ انہوں نے آ کر اس کے کاندھے پر بازو پھیلایا اور اس کو ساتھ لگا لیا۔ ''میری بیٹی ناراض ہے؟''
حریم خاموش رہی۔ امی پیار سے بولیں۔
''یہ دیکھو میرے دونوں پرس کھول کر دیکھو۔''
ایک امی کا وہ پرس تھا جس میں وہ مہینے کے خرچے کے پیسے رکھتی تھیں دوسرا پرس جس میں وہ کچھ پیسے جمع کر کے اپنی بچت رکھتی تھیں، وہ بچپن سے یہ دونوں پرس دیکھتی آ رہی تھی۔ امی کے کہنے پر بھی جب اس نے پرس کھول کر نہ دیکھے تو امی خود ہی دونوں پرس کھول کر دکھانے لگیں۔
''یہ جو مہینے کے خرچ کا پرس ہے اس میں سوائے چند سو کے کچھ نہیں بچا ہے اور یہ بچت والا پرس۔'' اس میں جو رکھے تھے اس میں سے آدھے آج مینیو پر خرچ ہو گئے۔ یہ پیسے میں اشد ضرورت کے لیے سنبھال رکھتی ہوں۔ اچانک کسی مہمان کی آمد کوئی ایمرجنسی یا کسی کی طبیعت خراب، پورے مہینے اگر ہاتھ روک روک کر یہ پیسے جمع نہ کروں تو بتاؤ۔ ایسی کسی ضرورت کے وقت کیا کریں؟ یقیناً کسی سے ادھار یا قرض لینا پڑے گا۔ تو کیا اچھا لگے گا؟ بیٹا زندگی بھر یاد رکھنا۔ جہاں تک ہو سکے ادھار یا قرض سے بچنا۔
اگر چھوٹی چھوٹی خواہشیں مار کر انسان سر اٹھا کر عزت سے بغیر کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے زندگی گزار سکتا ہے تو یہ سودا مہنگا تو نہیں ہے۔ آج اگر یہ پیسے نہ جوڑے ہوتے تو لامحالہ، مہینے کے آخر میں تمہاری پھپھو کی آمد پر کسی کے سامنے ادھار کے لیے ہاتھ پھیلانا پڑتا۔ سوچو کس عزت سے رب نے پورا کرا دیا۔ تم سوچ رہی ہو گی نا کہ تمہیں تو منع کر دیا کہ پیسے نہیں ہیں اور کچھ دیر بعد ہی جا کر دعوت کا اہتمام کر لیا تو بیٹا، عورت کو بہت سنبھل کر بہت سوچ بچار کر کے پیسہ خرچ کرنا چاہیے۔ جہاں تک ممکن ہو اضافی خرچے نہ کرنا، مگر کسی مہمان کی آمد پر حسب حیثیت تواضع کی کس قدر فضیلت ہے یہ تو تم جانتی ہی ہو۔
''مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ تو بیٹا، گھر داری کا حسن ان ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہے۔ عورت کا سلیقہ یہ بھی ہے کہ وہ شوہر کی کمائی کی قدر کرے اور آئے گئے کے سامنے مناسب تواضع کا سامان کر کے شوہر کی عزت بھی رکھے۔ میری بیٹی بہت عقل مند ہے مجھے پتا ہے وہ بھی اپنی نئی زندگی میں ایسے ہی توازن رکھے گی۔''
حریم امی کی باتیں سن کر دل سے مسکرا دی۔



عائشہ نصیر



اس خوب صورت سے وال کلاک میں رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

اس نے ایک بار پھر جمائی روکتے منہ پہ ہاتھ رکھا۔

"پھپھو کہہ رہی تھیں، دیہات کے لوگ جلدی سوتے ہیں۔ اگر یہ جلدی ہے تو ان کی دیر کیسی ہوتی ہوگی۔"

وہ سوئے جاگے ذہن سے سوچ رہی تھی۔

ویسے تو اسے یہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی مگر پھر بھی ہر لمحہ اس پر بوجھ بنتا جا رہا تھا۔ تھکن تھی کہ وجود کے ساتھ ذہن و دل پر بھی حاوی ہو رہی تھی۔

شہر سے اس دور دراز گاؤں تک کا سفر چاہے لگژری اے سی کار میں ہوا ہو، اس کے لیے بے حد صبر آزما اور مایوس کن تھا۔ پورے راستے وہ سر جھکائے بیٹھی رہی تھی مگر کچی سڑکوں پر اچھلتی، ہچکولے لیتی گاڑی نے پھپھو کے کیے سارے دعوے غلط ثابت کر دیے تھے۔

"ارے وہاں آ کے دیکھو تو پتہ لگے۔ وہ اب دس سالہ پرانا گاؤں نہیں رہا ہے۔ لاہور سے بڑھ کے سہولیات آ گئی ہیں وہاں۔ سڑکیں بن گئی ہیں، گیس، بجلی، موبائل کے ٹاور۔"

اور اب وہ اس نیم پکے گھر کے کمرے میں بیٹھی تھی۔

کمرا بڑا تھا مگر بے حد خوب صورت اور دیدہ زیب فرنیچر اس کمرے میں ایسے ہی لگ رہا تھا جیسے کوئی حسین نازک اندام شہزادی اپنی شاہی خواب گاہ چھوڑ کر کسی جھونپڑی میں آ بسی ہو۔

اس نے ہاتھ سے بھاری بھر کم دوپٹہ پیچھے کیا اور جھکی ہوئی گردن ذرا اٹھائی۔

"اف... اٹیچڈ باتھ روم بھی نہیں۔ میں چینج کیسے کروں گی۔"

پہلی بار کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے اس سوچ نے اس کی ہنسی گم کر دی۔ دل میں شکوہ ابھرا آنکھیں بھر آئیں۔

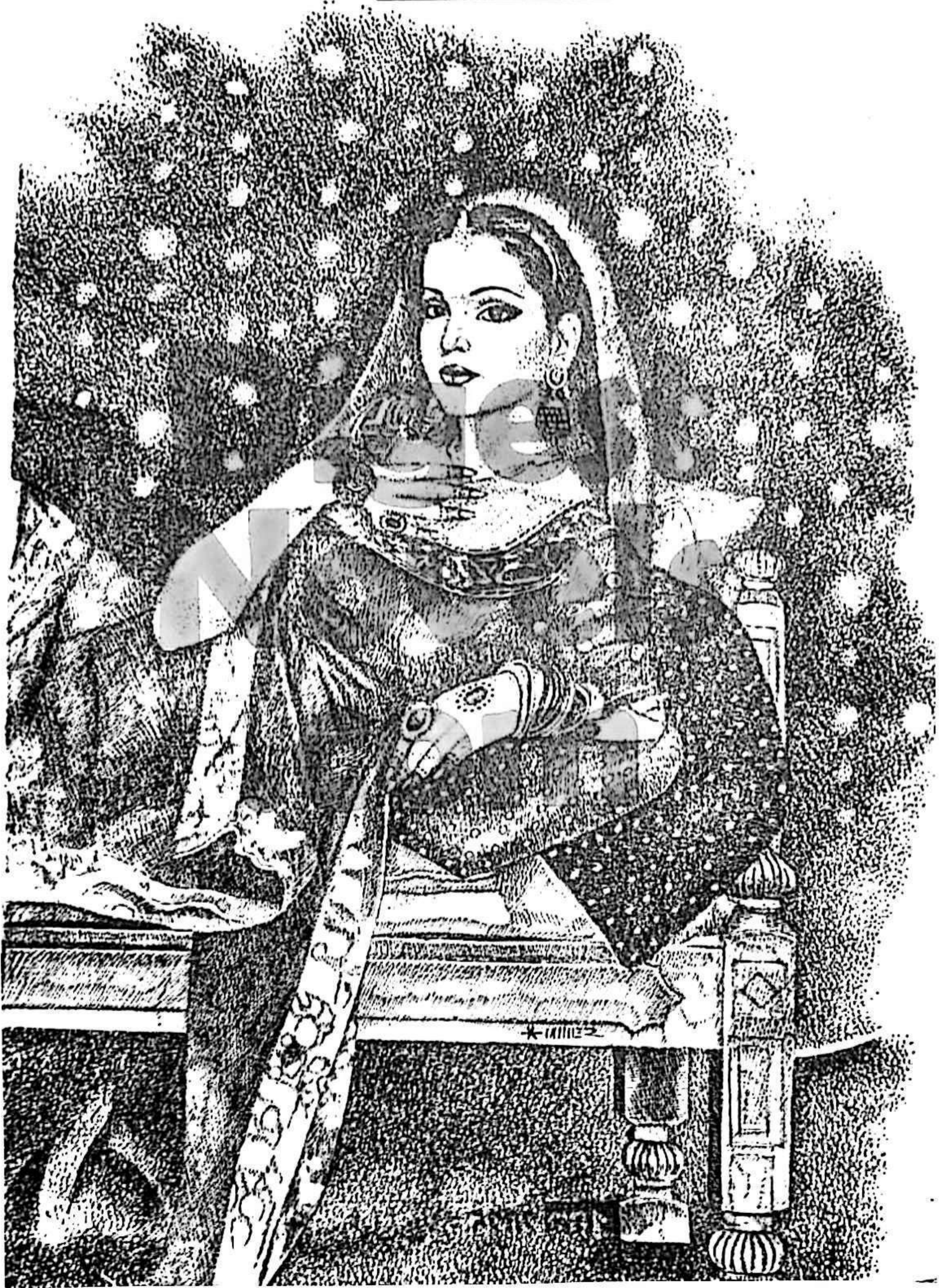
"فکر مت کرنا بریرہ۔ تمہارا کمرا تو پورے گھر میں سب سے اچھا ہے۔ محبت نے خود رنگ و روغن کروایا ہے اپنی نگرانی میں۔ خود ہی سب سجایا ہے۔ کسی اور پر نہیں چھوڑا۔" پھپھو نے مایوں سے ایک دن پہلے اس کا خوب صورت مراد بھیج کر تسلی دی تھی۔

"ارے اب تو دیہاتوں میں بھی لوگ کمروں کے اندر غسل خانے بنانے لگے ہیں۔ شہر کی ہوا لگ گئی ہے سب کو۔ اور محبت کا کیا مجھ سے چھپا ہے۔ وہ تو خود ایک عرصہ لاہور میں رہ کے گیا ہے۔ وہ یہ باتیں نہیں سمجھے گا تو اور کون سمجھے گا۔"

اس نے ایک نظر دیواروں پر ڈالی اور اس کا دل ڈوب گیا۔ دیواروں پر رنگوں سے مخصوص دیہاتی طرز کے پھول بوٹے اور نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ کاغذی پھولوں کی تو وہ دھوم مچی تھی کہ لگ رہا تھا ابھی کوئی بچہ نکل کر سالگرہ کا کیک کاٹنے لگے گا۔ سامنے کی دیوار پر بنا عظیم الشان دل اور دل کے اندر لکھا ایم اور بی۔ یہ حجلہ عروسی تھا یا پھر کسی ناکام فنکار کا انتقامی شاہکار۔ آنسو اس کی پلکوں سے چھلکے۔

"کل وہ لوگ آئیں گے اور یہ سب دیکھ کر مذاق نہ اڑائیں۔ ہو ہی نہیں سکتا۔"

مکمل ناول



وہ یہ سوچ کر ہی تڑپ گئی۔

اس کے ذہن میں اس شخص کے حوالے سے سارے خوش کن خیالات ایک لمحے میں بھاپ بن کر اڑ گئے تھے۔ کیا ہوتا اگر وہ بھی سر پر نگوں سے سجا کلہ سجائے، پیروں میں چھماتے کھسے پہنے اور رنگ برنگے کاغذی پھولوں کے سہرے اور، گلے میں نوٹوں کی مالائیں ڈالے اس کے پاس آتا۔

تصویروں کی بات اور تھی مگر یہ ایک اور ستم ظریفی تھی کہ آج اسے اپنے دولہا کی ایک جھلک بھی نظر نہیں آئی تھی، مردوں اور خواتین کا انتظام الگ الگ تھا۔ اور جب اس کی خالہ، چچی اور دیگر رشتے دار خواتین نے دولہا کو دلہن کے ساتھ بٹھانے کی بات کی تو اس کے سسر صاحب کو رخصتی کی جلدی ہونے لگی۔ رات سر پر تھی سفر لمبا تھا اور وہ غیر ضروری رسموں میں وقت ضائع کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہی کیا خاندان کی دیگر خواتین بھی دولہا کے دیدار سے محروم دل مسوس کر رہ گئیں۔

اور پھپھو نے اب تک جتنی بھی باتیں کی تھیں، وہ سب جھوٹ ثابت ہوئی تھیں تو اب محبت کے لیے کی گئی تعریفوں پر اسے تعفن آتا۔ اسے ابھی سے لگنے لگا تھا جیسے اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہو، کھلا دھوکا۔

مایوسی کا غلبہ اتنا شدید تھا کہ اس نے بنا یہ سوچے کہ یہ کیا وقت ہے اور وہ کہاں بیٹھی ہے۔ پاوچ سے اپنا موبائل نکالا اور اسی وقت رحمہ کو کال ملائی تھی۔

اس نے کال ریسیو کرنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگایا۔ وہ لوگ ابھی جاگ رہے تھے۔ اور کچھ گھنٹوں پہلے رخصت ہوئی دلہن کے فون نے اس کے دل میں سینکڑوں اندیشوں کو جنم دیا تھا۔

"بریرہ۔ کیا ہوا۔ سب خیریت تو ہے۔" اس کی متوحش اور پریشان آواز نے جیسے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔

"خیریت؟ یہ تم پھپھو سے پوچھو۔ کیا بگاڑا تھا میں نے ان کا۔ جو انہوں نے مجھ سے یوں دشمنی نکالی ہے۔" وہ پھٹ پڑی۔

"یا اللہ۔ مجھے ہول اٹھ رہے ہیں۔ بتاؤ تو سہی کیا ہوا ہے؟" رحمہ کو کزنز کے بیچ میں سے اٹھ کر بالکونی میں پناہ لینی پڑی۔

"میں گاؤں میں شادی نہیں کرنا چاہتی تھی مگر پھپھو نے مجھے کیسے سبز باغ دکھائے۔ جیسے میں دلہن نہیں، کسی رائل پروجیکٹ کی انویسٹر ہوں، گاؤں اب ایسا ہو گیا ہے۔ گاؤں اب ویسا ہو گیا ہے۔ تمہارا گھر ایسا ہے، تمہارا کمرا ایسا ہے۔ تمہیں آ کر میرا کمرا دیکھنا چاہیے تھا رحمہ......" بنا رکے وہ بولتی جا رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے تمہارے کمرے کو؟" رحمہ چکرائی تھی۔

"کمرا کم اور کسی سرکس کا ٹرائل شو زیادہ لگ رہا ہے۔ اور میں جوکر لگ رہی ہوں اس کمرے میں بیٹھی ہوئی۔" وہ تڑخی۔

"حد ہی ہو گئی بریرہ۔ میں بھی سوچوں، پتا نہیں کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ اور ادھر تم اپنے کمرے کی سجاوٹ کو لے کے رو رہی ہو۔ تم اتنی بچکانہ سوچ کی تو نہ تھیں۔" رحمہ کو غصے کے ساتھ حیرت اور مایوسی ہوئی تھی۔

"میں کمرے کی سجاوٹ پر نہیں رو رہی۔" اس نے ایک طویل سانس لے کر خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ "میں اس کمرے کو سجانے والے کو سوچ کے رو رہی ہوں۔ پھپھو نے کہا تھا، یہ کمرا اس نے سجایا ہے۔ تم ہی سوچو اگر اس کی پسند اور ذوق کا یہ عالم ہے تو وہ خود کیسا ہوگا۔ کون سا پینڈو برآمد ہونے والا ہے پھپھو کی تعریفوں کی چمکتی دمکتی زنبیل سے۔ وہ اتنی بدتمیز تو نہ تھی مگر آج تو حد ہو گئی تھی۔"

"میرے ساتھ غلط ہوا ہے رحمہ۔"

رحمہ کو واقعی پریشان ہونے لگی۔

"خدا کے لیے بریرہ۔ کوئی سن نہ لے۔ چپ کر جاؤ۔ موبائل رکھو اور بیٹھ جاؤ آرام......" اس کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔

بریرہ نے فون کاٹ دیا تھا۔

دروازے پر آہٹ ہوئی تھی۔ موبائل پاوچ میں رکھنے کا وقت ہی نہ ملا، اسے گود میں دوپٹے کے نیچے چھپایا اور سر جھکا لیا۔

بھاری لہجے میں سلام ہوا تھا۔
اس نے منہ ہی منہ میں بدبدا کے جواب دیا۔
وہ اس کا قریب آنا محسوس کر رہی تھی۔
"سلام کا جواب فرض ہے، پینیڈو ضرور ہوں لیکن مسلمان بھی ہوں الحمد للہ۔ سلامتی بھیج سکتی ہیں مجھ پہ۔" بڑے ہی خوب صورت اور شائستہ لہجے میں طنز کیا تھا اس نے۔
بریرہ ساکت سی ہوگئی۔
کرنٹ سا دوڑا تھا اس کے رگ و پے میں
اس نے باتیں سن لی تھیں یقیناً۔ اوخدایا۔
اسے پسینہ آیا تھا۔
اس نے بیٹھنے کی زحمت کیے بغیر ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹھوڑی اٹھائی تھی۔
"ادھر دیکھیے۔ گھبرایئے مت.. آپ کے لیے حتی الامکان کوشش کی ہے خود کو شہری رنگ میں ڈھالنے کی۔ سرمہ نہیں لگایا آج۔ ورنہ سرمے کے ساتھ تو میری آنکھوں کا وہ جادو چلتا ہے کہ بس۔ سہرا بھی باہر ہی چھوڑ کر آیا ہوں، نوٹوں والے ہار بھی بچوں میں بانٹ دیے۔"
لہجے میں کاٹ نہیں نرمی تھی مگر اس کے الفاظ۔
بریرہ کو زمین میں دھنسانے کے لیے کافی تھے۔
یہ کیسا دولہا ہے، پہلی رات ہی اپنی دلہن پر طنز کے تیر برسا رہا ہے۔ اس نے سوچا اور بھول ہی گئی کہ کچھ دیر پہلے وہ یعنی پہلی رات کی دلہن اس کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کر رہی تھی۔
شدید ناراضی و ناگواری سے اس نے پلکیں اٹھائیں اور کئی سیکنڈز پلکیں تک نہیں جھپک پائی۔
تانبے کی سی رنگت پر تراشیدہ نقوش اور بے حد گہری سرمئی آنکھیں، جیسے ساون سے پہلے کی گھٹائیں۔ کسی مرد کے چہرے پر اس نے اتنی خوب صورت آنکھیں آج تک نہیں دیکھی تھیں۔ کچھ تھا جو اسے اندر تک چھو گیا تھا۔ اور پھر جن نگاہوں سے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔
بے اختیار اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے وہ آنکھوں پر پلکوں کی چلمن گرا گئی تھی۔

"ہاں تو۔" وہ بھی جلد ہی اس کیفیت سے نکلتے ہوئے تکیہ لے کر اس کے سامنے بیٹھا۔
"مجھے افسوس ہے اس دھوکے کا جو آپ کے ساتھ ہوا۔" وہ بظاہر سنجیدہ تھا مگر بریرہ اس کے لہجے میں خفیف سی لطافت محسوس کر سکتی تھی۔
"قسم سے مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ میری چچی صاحبہ نے آپ کو میرے یا اس گھر کے حوالے سے سبز، باغ دکھائے ہیں، یا خواب و خیال کی کوئی ہالی وڈ مووی دکھادی ہے۔ اصل میں چچی جان کا بس چلے تو وہ دیہاتی جھونپڑی کو بھی وائٹ ہاؤس ثابت کر دیں۔ اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ وہ ہمارے گھر کو 'جدید دور کی حویلی' موسوم کر چکی ہیں، تو میں خود آپ کو ویڈیو کال پہ دکھا دیتا، تب فیصلہ آپ کا ہوتا۔" کہتے ہوئے اس نے ذرا مسکرا کر ٹھوڑی سہلائی۔
بریرہ حیران تھی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ اس نے کچھ دیر قبل رحمہ سے ہو رہی اس کی گفتگو سنی ہے۔
اسے برا نہیں لگا تھا۔ برا لگتا تو دور، وہ تو وضاحتیں دے رہا تھا، نرم، لطیف اور دوستانہ انداز میں۔
"خیر اب بھی فیصلہ آپ کا ہے۔ مزید آپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔ میری طرف سے تو بالکل نہیں۔"
وہ اس کی بات کا اصل مطلب سمجھ کر سر مزید جھکا گئی تھی۔
"اور یہ کمرا۔" اس نے چاروں جانب نگاہ دوڑائی۔ "میری نگرانی میں تیار ہوتا تو اس سے بدتر ہوتا۔" وہ مسکرایا۔ "پلان تو یہی تھا مگر پھر مجھے کسی کام سے لاہور جانا پڑا۔ واپس آیا تو میرے یاروں نے مجھے ہی سرپرائز دے دیا تھا۔ مجھے ان کا دل توڑنا مناسب نہیں لگا۔"
بریرہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس لمحے اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا، اس نے واقعی بچکانہ پن کی انتہا کر دی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ وضاحت دے، معذرت کرے یا شرمندگی کا اظہار۔
"خیر۔ آپ تھک گئی ہوں گی۔ سفر لمبا تھا۔ چاہیں

تو چینج کر لیں۔ باتھ روم اس طرف ہے۔" اس نے باقاعدہ ہاتھ کے اشارے سے سمت بھی دکھادی۔

بریرہ نے بے حد حیران ہو کر اس طرف دیکھا اور اس پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔

وہ کیوں نہیں دیکھ پائی تھی وہ دروازہ جو کمرے کے ساتھ ہی تھا۔ تب شاید کمرے کے کھلے دروازے کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ اور اب کمرے کا دروازہ بند تھا تو وہ جیسے اس کا منہ چڑاتے ہوئے سامنے تھا۔

اپنے اندر کی شرمندگی اور ہچکچاہٹ پر پردہ ڈالتے ہوئے اس نے آہستہ سے دوپٹہ پیچھے کیا اور اٹھنے کی کوشش کی۔

وہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اپنی بولتی گہری آنکھوں میں مچلتی عجیب سی شرارت لیے۔

کچھ اس کی موجودگی، اور کچھ اس کی نظریں، وہ بھول ہی گئی۔ موبائل گود میں رکھا ہے۔ اس کے اٹھتے ہی وہ پھسل کر نیچے گرا تھا۔

"ارے۔" وہ بے اختیار سیدھا ہو بیٹھا، جھک کر موبائل اٹھایا۔ پھر مسکراتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "بچ گیا آپ کا لائف کنکشن۔"

ایک اور طنز۔ بریرہ کا چہرہ سرخ پڑا۔

"کوئی بات نہیں... شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں"... وہ دل ہی دل میں خود کو سمجھا رہی تھی، ابھی نہیں تو بعد میں، وضاحت دی جا سکتی ہے —شاید کل ہی۔

اور ویسے بھی، جس انداز میں وہ بات کر رہا تھا، اس کے لہجے کی نرمی، آنکھوں کی چمک اور لفظوں میں کی بے ساختگی صاف بتا رہی تھی کہ وہ کوئی سخت مزاج کھڑوس طبیعت شخص نہیں... جس کے سامنے بولتے ہوئے زبان لڑکھڑائے اور حلق سوکھنے لگے۔

شاید، ان کے درمیان روایتی تکلفات کی دیوار گرنے میں بھی زیادہ وقت نہ لگے۔

سینے میں دبی گہری سانس خارج کر کے وہ نظریں چرا کر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھی تھی اور دوپٹے سے پنیں نکالنے لگی تھی۔ آج کی رات یوں گزرے گی، اس نے سوچا نہیں تھا۔

وہ اپنے بابا کی سب سے لاڈلی اور پیاری بیٹی تھی، پھر اسے پہلی اولاد ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ اسی لیے دو سال بعد رحمہ کی پیدائش نے بھی اس کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں ہونے دی تھی۔ اسے اپنی قدر و قیمت کا احساس تو تھا مگر وہ بگڑی نہیں تھی بلکہ نہایت کم عمری میں ماں کی وفات کے بعد اس نے بے حد ذمہ داری اور خوش اسلوبی سے گھر سنبھال لیا تھا۔ اپنی خوب صورتی، تعلیم اور سگھڑاپے کے باعث وہ خاندان میں کئی قابل بیٹوں کی ماؤں کی پسند بن چکی تھی مگر سب زیادہ حق خالہ جتاتی تھیں۔

طہٰ فی الحال بے روزگار تھا۔ مگر وہ کئی بار ڈھکے چھپے الفاظ میں جتا چکی تھیں کہ اس کی جاب لگتے ہی وہ سب سے پہلا کام احتشام بھائی سے بریرہ کا ہاتھ مانگنے کا کریں گی۔ اگر ان کی بہن زندہ ہوتی تو وہ بہت پہلے ان سے یہ یقین دہانی کرا چکی ہوتیں مگر بہنوئی کی بات ذرا مختلف تھی۔ اور انہوں نے یہ ثابت بھی کیا۔ جب ان کی اپنی بہن بریرہ کے لیے اپنے جیٹھ کے بیٹے کا رشتہ لے کر آئیں۔ وہ زمین دار لوگ تھے، دیہی رہن سہن تھا مگر محب سے ملنے کے بعد انہیں وہ اتنا اچھا لگا کہ انہوں نے ساری باتیں پس پشت ڈال دیں۔

بریرہ کو بتا کر اس کی مرضی ضرور پوچھی تھی اور اس نے سب کچھ ان کی پسند پر چھوڑ دیا۔

ان کے اس فیصلے سے خالہ تو ناراض ہوئیں ہی مگر ہر وقت ہنسی مذاق کرنے والا طہٰ بھی ان کے گھر کا رستہ بھول گیا۔ اور تب ہی اسے احساس ہوا کہ وہ بھی اسے پسند کرتا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

محب کے گھر والوں کو ہاں کر دی گئی تھی۔

ان کے گاؤں کے پس منظر سے بریرہ کو کچھ تحفظات تو تھے مگر اس کے لیے پھپھو موجود تھیں۔ ہر بار ایک نئی تسلی کے ساتھ اس کا دل اور حوصلہ بڑھاتیں۔ محب کی تعریفوں کے تو وہ پل باندھے تھے کہ بعض اوقات اسے شک ہوتا، کیا وہ انسان

ہے؟ یا پھر کوئی افسانوی کردار۔

اور اسی لیے شادی کے دن جب اچانک اس پر کئی حقیقتیں کھلیں تو وہ خود پر قابو نہیں رکھ پائی۔ مگر محبت کے لیے گائے گئے گن بے جا نہ تھے، اور اس بات کا احساس اسے پہلی رات ہی ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"چچی نے بتایا تو تھا کہ پھرتیلی اور سگھڑ بریرہ اصغری کا ماڈرن ورژن ہے مگر مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ شادی کے پہلے دن ہی وہ اسٹول پہ چڑھ کر اپنے عروسی کمرے کے جالے اتارنے لگیں گی۔"

صوفے پر سویا محب کھٹ پٹ سے جاگا تھا۔

پہلے تو اس نے سوچا کہ شاید خواب میں ہے، یا جن بھوت کمرا بدل بیٹھے ہیں۔ اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس کی ایک وجہ کل رات صوفے پر بے آرامی کی حالت میں لیٹنا بھی تھا۔ اس جی ہوئی سیج پر سونا اس کی انا نے گوارا نہ کیا۔ اور اب بالآخر اٹھ کر جلتی آنکھوں کے ساتھ بریرہ کو اسٹول پر چڑھے دیکھا۔ بکھرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس کا خوابیدہ ذہن سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ کر کیا رہی تھی۔

"میں جالے نہیں اتار رہی، میں یہ دل ہٹانے کی کوشش کر رہی ہوں۔" اس کے تبصرے پر تپنے کے باوجود بریرہ نے جواب دھیمے لہجے میں دیا۔ پہلے دن کی دلہن تھی، رحمہ کی طرح اسے کوئی دانت کھٹے کرنے والا جواب نہیں دے سکتی تھی۔

اس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اوہ... دل ہٹانے کی کوشش؟"

پھر مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ سر ہلایا، "کیوں بھلا؟ یہ تو بہت پیارا دل ہے ــــ بیچ میں ایم اور بی بھی کندہ ہیں... ہماری متوقع، امکانی محبت کا خوب صورت مظہر!"

بریرہ نے پلکیں جھپکائیں، اسے چند لمحے لگے تھے ان لفظوں کا مطلب سمجھنے میں۔

"کیا یہ ہمیشہ ایسے ہی بات کرتا ہے۔" اس نے جھنجلا کر سوچا تھا۔ "آج میرے گھر والے آئیں گے، میں نہیں چاہتی میری کزنز یہ دیکھ کر میرا مذاق بنائیں۔" کہتے ہوئے اس نے "ایم" کا پہلا حصہ اس زور سے اکھاڑا کہ اس کے پیروں تلے موجود ڈریسنگ ٹیبل کا اسٹول لرز گیا۔

اس نے گھبرا کر سہارے کے لیے دیوار پر ہاتھ رکھا۔

"آرام سے۔ کزنز کی ہنسی سے بچنے کی کوشش میں نہیں ان کے رونے کا سامان نہ کر دیں۔" اس کا توازن بگڑتے دیکھ کر وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ خفت سے بولی۔ اس کی طرف پشت تھی۔

وہ اس کی پشت پر بکھرے لمبے بالوں کو دیکھ رہا تھا جو بھیگے ہوئے لگ رہے تھے۔

"ویسے کل رات آپ بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ میں بتا نہیں پایا۔" سر کھجا کر کہتے ہوئے وہ ذرا پھیل کے، ٹیک لگاتے ہوئے پھر سے بیٹھ گیا۔ گہری آنکھوں میں کئی کیفیتوں کی لہریں مچلیں۔

"کل رات۔ مطلب اب نہیں لگ رہی۔" وہ خوش نہیں ہوئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کل رات پارلر کے مہنگے میک اپ میں اسے دیکھنے کے بعد وہ آج صبح اس کا سادہ چہرہ دیکھے اور اسی لیے اس نے صبح ہی صبح کافی محنت کی تھی۔ حالانکہ اس کی موتیا کی کلیوں کو شرماتی رنگت کو کسی غازے کی حاجت نہ تھی، اور اس کی نوکیلی خم دار پلکوں سے بجی سیاہ آنکھیں... جو ایک بار دیکھتا، دل وہیں گروی رکھ آتا۔ پھر بھی وہ نجانے کیوں اس کے سامنے عجیب سی ان سیکیورٹی کا شکار ہو گئی تھی۔

"مردوں کو اتنا خوب صورت نہیں ہونا چاہیے۔" بریرہ کا دلی شکوہ یہی تھا۔

"ویسے کیا خیال ہے۔ یہ دل کس کا ہوگا میرا یا آپ کا؟" اسی لمحے محب کی نرم و شوخ آواز ابھری۔

بریرہ ذرا رکی، پھر خود پر ہی ہنسی آئی۔

دھیمے سے بڑبڑائی "یہ تو آپ کو اپنے دوستوں سے پوچھنا چاہیے۔ ویسے مجھے تو گتے اور چمک پٹیوں کا لگ رہا ہے۔" پھر مڑ کر اس کی طرف

دیکھا۔ "مدد کردیں گے؟"

اسٹول پر کھڑے ہونے کے باوجود وہ بچے کچے دل کے اس باقی حصے تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ وہ کافی اوپر تھا۔

"آہ۔ مدد مانگ بھی رہی ہیں تو دل توڑنے کی۔" اس نے ایک مصنوعی افسردہ سی آہ بھری۔

"چھوٹی ہیں آپ۔" وہ اٹھ کر قریب آیا تھا۔

"چھوٹی۔" وہ اندر ہی اندر اس لفظ پر تڑپ گئی۔

مگر چھ فٹ سے نکلتے قد کے ساتھ وہ اس کے پانچ فٹ چار قد انچ کو چھوٹا کہہ رہا تھا تو غلطی اس کی بھی نہیں تھی۔

وہ اسٹول سے اترنے لگی ایک ہاتھ دیوار پہ رکھے۔

مگر پیر نیچے رکھنے کی کوشش میں اس کا توازن بگڑا۔

مگر وہ گرتی کیسے وہ پاس ہی تو کھڑا تھا۔ اس نے لمحہ ضائع کیے بغیر اسے سنبھال لیا۔

"کہا تھا نا دھیان سے۔" ایک ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑی تھی اور دوسرا اس کی پشت کے بھیگے بالوں پر جم گیا تھا۔ بریرہ کے روئیں روئیں میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اس پر مستزاد کانوں کے پاس اس کا بھاری پرحدت لہجہ۔ وہ کرنٹ کھا کر اس سے دور ہٹی۔

چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ لیے اس نے ایک نظر اپنی ہتھیلی کو دیکھا۔ جس پر اس کی بھیگی زلفوں کی نمی بکھری تھی، پھر اس کا ادھورا کام کرنے کو دیوار کی سمت بڑھا تھا۔

ولیمے کی تقریب خوش اسلوبی سے ہونے کے بعد اس نے کچھ دن کے لیے میکے جانے کی بات کی، اپنی جیٹھانی سیمی بھابھی سے۔ وہ بڑی سادہ مزاج اور ہنس مکھ سی تھیں۔ اس کی بات پر متذبذب ہو گئیں۔

"۔ میں کچھ نہیں کہوں گی پر یہ بہت جلدی نہیں ہو جائے گا؟ کیا تمہارے ہاں اتنی جلدی جاتے ہیں میکے؟" ان کا انداز طنزیہ نہیں تھا، وہ بے چاری سادا لہجے میں استفسار کر رہی تھیں، وہ الگ بات کہ بریرہ کو ان کے الفاظ ذرا چبھے۔

لمحاتی کشمکش کی خاموشی کے بعد اس نے بے بسی سے کندھے اچکائے۔

"پتا نہیں ......" اس نے دھیمے سے کہا۔ "یہ میں کیسے بتا سکتی ہوں، میری تو یہ پہلی شادی ہے۔" آخری بات اس نے دل میں سوچی۔

"اچھا۔ چھوڑ۔ تو آپا سے پوچھ لے۔" انہوں نے جیسے پچکارا۔

اس کا یہ آئیڈیا انہیں خاص پسند نہیں آیا۔

"ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا کہ دلہن ولیمے کے اگلے دن ہی میکے کے لیے نکل پڑے۔ ابھی تو بہت لوگ ہیں جو شادی میں آ نہیں پائے، دلہن دیکھنے آئیں گے، کیا جواب دیں گے ہم انہیں۔"

اس کی ساس حیات نہیں تھیں مگر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ نجمہ آپا وقتاً فوقتاً یہ کمی پوری کرنے آتی رہیں گی۔

ان کے سامنے تو وہ بھیگی بلی بن کے بیٹھی رہی، کمرے میں آکر محبت سے بات کرنی پڑی، اب وہی اس کی آخری امید تھا۔

"لیکن کیوں؟" وہ حیران تھا۔

"میری کچھ ضروری چیزیں رہ گئی ہیں وہاں۔" وہ دھیرے سے بولی۔ سچ تو یہ تھا کہ اسے گھر کی شدید یاد ستا رہی تھی ــــ اپنا کمرا، وہ خاموش بالکونی، اپنی کتابوں کی مہک۔

"دیکھو۔ اب اگر آپا کی مرضی کے بغیر تمہیں لے کر جاؤں گا تو ابھی سے ہی مجھ پر زن مرید ہونے کا ٹھپہ لگ جائے گا۔" اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اور ویسے بھی اب مجھے کہنے کے بجائے تب آپا کے سامنے بول دیتیں۔"

"اگر میں انہیں کچھ کہتی تو آپ مجھے بدتمیز سمجھتے۔" بے دلی سے کہتے ہوئے وہ پلٹ کر بیڈ پر بیٹھی۔

"سچ میں؟" محب نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"نہیں۔" وہ جھنجلا سی گئی۔ "مجھے ان کے سامنے کچھ کہتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا"۔ اس نے اعتراف کیا۔

"واہ۔ پھولن دیوی ڈرتی بھی ہیں۔" اس پر چوٹ کرتے ہوئے وہ آ کر اس کے برابر بیٹھا شاید

کچھ زیادہ قریب۔

کیونکہ وہ فوراً کھسک کر ادھر ہوئی۔

اس کی اس حرکت پر محبت زیرلب مسکرایا۔

"ٹھیک ہے ابھی کے لیے صبر کرلو۔ پھر چلی جانا۔" محبت کی نظریں چہرے کے اطراف میں بکھری اس کی بالوں کی لٹوں میں الجھنے لگیں۔

"کب؟" اس نے گردن ذرا موڑ کر اس کی سمت دیکھا اور عجیب سی کیفیت کا شکار ہوگئی اس کی خوب صورت آنکھوں کی مسکراہٹ دیکھ کر۔

"جب آپا چلی جائیں گی۔" اس کے قرب کی مہک، وہ بے اختیار اس کے پاس سے اٹھا۔

"لیکن کب۔ بتائیں تو؟" وہ پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر پوچھ نہیں پائی اور محبت مزید کمرے میں رکا نہیں۔

☆☆☆

"پتا ہے۔ اس دن جب تم نے اتنی دیر رات فون کر کے وہ رونا دھونا مچایا تھا تو اس وقت ہم سب بیٹھے یہی ڈسکشن کر رہے تھے۔"

وہ بالکونی میں جھانکتے چاند کو تکتی وہیں کارپٹ پر ٹانگیں سمیٹے بیٹھی تھی، شادی سے پہلے یہ وقت اور مقام اس کا پسندیدہ تھا۔ جب رحمہ ٹرے میں چائے کے کپ لیے آئی۔

محبت آپا کے جانے کے بعد اسے لے تو آیا تھا مگر صرف دو دن کے لیے۔ گاؤں میں ابھی ان کی دعوتیں چل رہی تھیں اس لیے وہ زیادہ اعتراض نہیں کر پائی۔

"کون سی؟" اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"سب لڑکے محبت کی تعریف کر رہے تھے بلکہ لڑکے کیا بڑے بھی۔ ارحم بھائی، بڑے ماموں۔ محمود انکل۔ خالو جی۔"

وہ چند لمحے کسی سوچ کے زیر اثر اسے دیکھتی رہی پھر جھجک کر پوچھا۔ "کیا طٰہ آیا تھا؟"

"شادی میں تو آیا تھا مگر گھر نہیں آیا۔" رحمہ نے اپنا کپ اٹھا کر چسکی بھری۔

"مطلب اسے ہال ہی میں دیکھا گیا اور وہیں سے شاید گھر چلا گیا۔ خالہ کو فیصل بھائی لینے آئے تھے۔ تم کیوں پوچھ رہی؟"

"بس ایسے ہی۔" اس نے کندھے اچکائے۔ "وہ رشتہ ہونے کے بعد سے نہیں آیا تو مجھے لگا، شادی پر بھی نہیں آئے گا۔"

"مجھے اس کے اس قدر ہرٹ ہونے کی وجہ سمجھ نہیں آرہی۔ تمہاری اس سے کوئی کمٹمنٹ نہیں تھی، تمہارا اس سے رشتہ نہیں ہوا تھا۔ ہاں۔ مجھے خالہ کے لیے ضرور برا لگا۔ وہ ہم سے پیار کرتی ہیں اور یہ ان کی دلی خواہش تھی۔ اگر یہ طٰہ کی بھی دلی خواہش تھی تو اسے تمہیں بتانا چاہیے تھا۔ یا مجھے ہی بتا دیتا۔" رحمہ بہت چڑی ہوئی لگ رہی تھی، طٰہ کی بالخصوص اس سے بہت دوستی تھی اور اس کی خاموش ناراضی نے اسے کافی اپ سیٹ کر دیا تھا۔ مگر اسے بریرہ کے سامنے بھڑاس نکالنے کا موقع آج ملا۔

"اچھا چھوڑو یہ ذکر۔ مجھے اس بارے میں اور بات نہیں کرنی۔" وہ بیزار سی ہوئی۔

"اچھا۔ اپنے ٹال، ڈارک اور ہینڈسم شوہر کے بارے میں بتاؤ۔" پوچھتے ہوئے رحمہ کے لہجے میں شرارت چھلکی۔

"کیا بتاؤں...؟" اس نے ابرو اٹھائے۔

"اس دن تمہاری وہ باتیں سننے کے بعد انہوں نے تمہیں کچھ کہا تھا؟" وہ تھوڑا اور قریب ہوئی جیسے بریرہ اسے یہ بات سرگوشی میں بتانے والی ہو۔

بریرہ ہنس پڑی۔

"بہت کچھ کہا تھا مگر ویسے نہیں جیسے تم سوچ رہی ہو۔" اس نے رحمہ کے کندھے پہ دباؤ ڈال کے اسے دھکیلا۔

"مطلب؟"

"مطلب وہ بھڑکا نہیں، ناراض نہیں ہوا۔ باتیں سنائیں۔ طنز بھی کیے مگر ہلکے پھلکے انداز میں جیسے گپ شپ لگا رہا ہو۔" وہ لمحات یاد کر کے اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے مسکراہٹ پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"کیوں نہیں؟" رحمہ کے لہجے میں حیرت تھی۔
"میری وہ باتیں سننے کے بعد اسے لگا، میں خوش نہیں ہوں تو۔" وہ اضطراری کیفیت میں انگلیاں چٹخا رہی تھی۔
"اور اس کے بعد؟" رحمہ سوالیہ نظروں سے اس کے چہرے کے آتے جاتے رنگ دیکھ رہی تھی۔
اس بار بریرہ نے بنا کچھ کہے صرف نفی میں سر ہلایا۔
رحمہ کے چہرے پر غصے کے تاثرات ابھرے۔
"حد ہے۔" غصے سے کہتے ہوئے اس نے بات اُدھوری چھوڑ دی۔
"کوئی اور بات کرو پلیز۔" وہ پریشان ہوگئی تھی۔
"اب مجھ سے کوئی اور بات نہیں ہوگی۔" وہ خالی کپ ٹرے میں رکھ کر اٹھی۔
اس کے جانے کے بعد اس نے اپنا موبائل اٹھا کر دیکھا۔ کوئی میسج نہیں۔ کوئی کال نہیں۔ کوئی مس کال تک نہیں۔ نئی نویلی دلہن میکے میں اور شوہر اتنا لاپروا۔ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اس نے موبائل واپس ٹیبل پر رکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
تقریباً دو گھنٹے بعد مووی کے ختم ہونے پر جب وہ کمرے میں آئی تو نجانے کس امید کے زیرِ اثر اس نے موبائل اٹھایا اور اس کا دل دھڑک اٹھا۔
اسکرین پر اس کے نام کی کئی مس کالز جگمگا رہی تھیں اور ایک میسج۔
اسے خود پر غصہ آیا۔ اس نے موبائل کمرے میں چھوڑا ہی کیوں۔
میسج کھولتے ہوئے اس کی انگلیوں میں لرزش سی اتر آئی تھی۔
وعدہ نہیں، پیام نہیں، گفتگو نہیں
حیران ہوں اے خدا مجھے کیوں انتظار ہے۔
بنا مخاطب کیے اس نے اس ایک شعر میں ہی اپنی دلی کیفیت بیان کردی تھی۔
بریرہ کو اپنے رخسار دہکتے محسوس ہوئے۔ لبوں پر بہت خوب صورت مسکراہٹ آکر ٹھہر گئی تھی۔
"واہ۔ بے چاری نئی دلہن کو آتے ہی کام پہ لگا دیا۔"
وہ رحمہ کے ساتھ کچن میں لنچ کی تیاری کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں محب نے بھی آجانا تھا۔
مگر کچن کے دروازے سے آئی یہ آواز طٰہٰ کی تھی۔ اس نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔
دروازے سے ٹیک لگائے وہ مسکراتی نظروں اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ بلیک پینٹ اور کیمل کلر کی شرٹ میں ملبوس۔
"اوہو۔ بڑے لوگ آج کیسے ادھر کا رستہ بھول گئے۔" رحمہ نے دیکھتے ہی اس پر چوٹ کی جبکہ بریرہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"بڑے لوگوں کو اطلاع ملی تھی کہ کزن صاحبہ آئی ہیں تو سوچا چل کر قدم بوسی کی جائے۔" طٰہٰ نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا، لہجہ شرارتی تھا۔
رحمہ کا منہ بنا۔ "ہاں صرف یہی آپ کی کزن ہے۔ میں تو آپ کی خالہ کو کوڑے کے ڈھیر پر ملی تھی۔"
وہ ہنس پڑا اس کی بات پر۔
"کیسے ہو۔" بریرہ پوچھ رہی تھی۔
"میں تو ٹھیک ہوں اور تم؟" وہ گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔
ریشمی بالوں کو جوڑے میں باندھنے کے باوجود کئی لٹیں چہرے کے اطراف میں بکھری تھیں۔ گردن اور ماتھے پر پسینہ جگمگا رہا تھا۔ ایک کلائی میں بھر کے چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ ہاتھوں پہ لگی مہندی کے نقش و نگار بھی ابھی مدھم نہیں ہوئے تھے۔
"اچھی لگ رہی ہو۔" یہ آواز طٰہٰ کے دل سے نکلی تھی۔
بریرہ کی آنکھوں میں لمحے بھر کو حیرانی ابھری اور پھر وہ ہنس دی۔
"پسینہ پسینہ ہو رہی ہوں اور اچھی لگ رہی ہوں؟"
"مجھے تو ہر حال میں اچھی لگتی ہو۔" وہ جس طرح بولا، بریرہ تو جز بز ہوئی ہی رحمہ نے کڑاہی میں چمچ زور سے پٹخا۔
"میڈم اب شادی شدہ ہوگئی ہیں مسٹر۔ فلرٹ

سے گریز کیجیے ورنہ ان کے شوہر کو مولا جٹ بننے میں دیر نہیں لگے گی"۔

"فلرٹ کہاں، میں تو تعریف کر رہا ہوں"۔ وہ معصومیت سے بولا۔

"چلو یہاں سے۔ گرمی ہے بہت۔" بریرہ نے دوپٹے کے پلو سے پسینہ پونچھتے ہوئے اسے اشارہ کیا۔

"ہاں۔ جایے جایے۔ خدمت گار آپ کے لیے چائے پانی کا بندوست کرتی ہے۔" رحمہ نے آواز دی۔

"ہاں۔ پانی نہیں کولڈ ڈرنک اور چائے میں چینی کم پتی زیادہ۔ ورنہ ٹپ نہیں ملے گی۔" طٰہ نے جاتے جاتے اسے چھیڑا تھا۔

"تو بتاؤ۔ کیسی ہے گاؤں کی زندگی؟" لاؤنج میں بیٹھتے ہی وہ صوفے کے ہتھے پر انگلیاں بجاتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا، گہری نظریں اس پر جمائے۔

"ابھی زندگی ٹھیک سے شروع کہاں ہوئی ہے۔" اس نے ہاتھ پیچھے کر کے بالوں کو سمیٹا۔

"مطلب ابھی اپلے تھوپنے کے کام پر نہیں لگایا، نہ ہی اپنے رانجھے کے لیے کھیتوں میں کھانا لے جانے کا تجربہ ہوا۔"

بریرہ اسے ناراضی گھورنے لگی، طٰہ کا انداز اگرچہ سنجیدہ مگر الفاظ واضح طور پر مذاق اڑانے والے تھے۔

"وہ کھیتوں میں کام نہیں کرتا۔ اور نہ ہی وہاں اپلے تھوپنے یا دودھ دوہنے جیسے سین ہیں۔ پھپھو نے صحیح کہا تھا، وہاں بھی سب نارمل کام ہی ہیں جیسے یہاں ہیں۔ اور میں نے تو ابھی وہ بھی شروع نہیں کیے۔" اس کا لہجہ دفاعی تھا۔

"ٹھیک ہے۔ چڑو مت۔ مذاق کر رہا تھا۔" اس کے غصے سے محظوظ ہوا۔ "اپنے شوہر نام دار کے بارے میں بتاؤ۔ کیسا ہے وہ؟"

طٰہ کے اس سوال پر بریرہ کی آنکھوں میں برق سی کوندی تھی۔ اور طٰہ کو اپنے دل پر گرتی محسوس ہوئی۔

"تم نے اسے دیکھا ہے، تم بتاؤ؟" ایک مغرور سی مسکراہٹ لیے بریرہ نے اس کا سوال اسی کو لوٹا دیا۔

"شکل کی تو بات کروں تو مجھ سے زیادہ ہینڈسم تو نہیں۔" اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ بریرہ ہنس پڑی۔

تھوڑی دیر بعد رحمہ کولڈ ڈرنکس لائی تو وہ اٹھ کر نہانے کے لیے اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اسے محبت کے آنے سے پہلے تیار ہونا تھا۔

☆☆☆

وہ پورا راستہ خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔ اس طویل سفر میں اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔

اس کے وجیہہ چہرے پر چھائی یہ گمبھیر خاموشی اتنی اجنبی لگ رہی تھی کہ اس کا دل گھبرا اٹھا۔

وہ تو ان چند دنوں میں ہی اس کی پرشوق نگاہوں، مسکراہٹوں، شوخ جملوں کی عادی ہو گئی تھی اور اب یہ بدلاؤ، یہ سکوت۔ اسے ہول اٹھ رہے تھے۔ کن انکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس نے سوچ کے گھوڑے دوڑائے۔ سوچتے سوچتے اسے اچانک ہی کچھ یاد آیا اور اس کا دل ایک دم بیٹھ گیا۔

آج دوپہر میں جب وہ تیار ہو کر نیچے آئی تو وہ آچکا تھا۔ رحمہ کچن میں تھی اور وہ طٰہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ بابا جو اپنے دوست سے ملنے گئے تھے وہ بھی بعد میں آئے۔

اس نے تیار ہونے میں خاصا وقت لیا تھا اس لیے اسے اندازہ نہیں تھا کہ اسے آئے ہوئے اور طٰہ سے باتیں کرتے ہوئے کتنی دیر ہوئی تھی۔

طٰہ نے اسے ایسا کیا کہہ دیا تھا کہ اس کا موڈ اس درجہ خراب تھا بلکہ یہ موڈ خراب ہونے سے بھی آگے کی بات تھی۔

وہ لوگ گھر پہنچے تو مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ وہ بھابھی سے مل کے اور ابا جی کو سلام کر کے سیدھی اپنے کمرے میں آئی۔ اس کی ایک نماز قضا ہو چکی تھی اور دوسری کا وقت نکل رہا تھا۔

الجھے ذہن اور بھاری دل کے ساتھ وہ سجدے میں جھکی۔ نجانے کتنی دعائیں مانگ ڈالیں، کتنے اندیشوں کو رب کے حضور رکھ دیا۔

وہ اتنی جلدی محبت کے ساتھ کوئی غلط فہمی یا بدگمانی نہیں چاہتی تھی۔
وہ جانماز سمیٹ رہی تھی، جب وہ کمرے میں داخل ہوا، اور آتے ہی واش روم میں گھسا۔
وہ آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ گہرے رنگ کے لباس میں اس کی رنگت گلابیاں چھلکا رہی تھی۔ سفر کی وجہ سے کاجل پھیلی آنکھوں میں بھی سرخی سی جم گئی تھی۔ کتنا دل لگا کر تیار ہوئی تھی وہ آج۔ مگر محبت نے اسے غور سے دیکھنے کی زحمت تک نہیں کی۔
وہ شاید منہ ہاتھ دھو کر نکلا تھا۔ چہرہ بھیگا۔ آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئیں۔
ایک نظر اسے دیکھ کر وہ باہر نکلنے کو تھا جب بریرہ کی نازک مہین آواز نے اس کے قدم روکے۔
"سنیے۔ بات کرنی ہے آپ سے۔"
"نماز پڑھ لوں، پھر آ کر سنتا ہوں۔" اس کی نظروں کی طرح اس کا لہجہ بھی سپاٹ تھا۔ وہ سر ہلا کر رہ گئی۔
مگر وہ نہیں آیا۔ بریرہ انتظار ہی کرتی رہی اور اسی انتظار کے دوران عالم اضطراب میں وہ ایک بار پھر رحمہ کو کال ملا بیٹھی۔
"اس کے اور طٰہٰ کے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں۔ کیا تم نے کچھ سنا تھا؟" اس نے رحمہ کی آواز سنتے ہی سوال کیا تھا۔
"نہیں۔ میں کچن میں تھی۔ کیوں کیا ہوا؟" رحمہ کے لہجے میں تشویش در آئی۔
"اس کا موڈ بہت خراب ہے رحمہ۔ شاید طٰہٰ نے اسے کچھ کہا ہے۔ مجھے نہیں پتا کیا۔ لیکن کچھ نہ کچھ تو کہا ہے۔" وہ روہانسی ہو گئی۔
"پاگل ہو گئی ہو بریرہ۔ وہ کیوں اسے کچھ کہے گا۔"
"مجھے نہیں پتا۔ لیکن وہ ایسا بالکل نہیں جیسا آج ری ایکٹ کر رہا۔ اور مجھے اس کے علاوہ اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی۔" وہ شدید بے چینی میں گھری تھی۔
"تمہاری عادت ہے بنا سوچے سمجھے نتائج پر چھلانگ لگانے کی۔ طٰہٰ بیوقوف نہیں بریرہ کہ محبت کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات کرے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تمہارا شوہر ہے۔" رحمہ کا انداز سمجھانے والا تھا۔ "اور کہنے کے لیے ہے ہی کیا۔ تمہارا کوئی اس سے افیئر تھوڑی تھا جو تم اتنا ڈر رہی ہو۔"
رحمہ کی باتوں سے اس کا دل پرسکون تو ہوا مگر پوری طرح نہیں۔
وہ بے چین ہی رہی۔ اور رات دیر تک اس کے انتظار میں جاگتے ہوئے اس کی آنکھ کب لگی، اسے پتہ بھی نہیں چلا تھا۔ وہ کسمسائی۔ شاید اس نے نیند میں بھی اس کی نظروں کی تپش محسوس کر لی تھی۔ کروٹ بدلتے ہوئے اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔
اس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔
محبت نے فوراً ہی نظروں کا زاویہ بدل کے بیڈ سے اپنا تکیہ اٹھایا تھا۔
وہ چند لمحے اپنی خمار آلود آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔
"کیا آپ ناراض ہیں مجھ سے؟"
وہ صوفے کی طرف بڑھ رہا تھا جب بریرہ نے یہ سوال کیا۔
وہ رکا اور ٹھہر کر اسے دیکھا۔ "نہیں تو۔"
"تو پھر آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہے؟" ایک ہاتھ رخسار کے نیچے رکھے سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس کے لہجے میں عجیب سی شکایت تھی۔
"الجھن میں تھا۔" یک ٹک اسے دیکھتے ہوئے وہ مدھم لہجے میں بولا۔
پھر وہ بیڈ کے قریب آیا۔
بریرہ اٹھ کر بیٹھی۔ دل عجیب ہی لے پر دھڑکا۔
"تمہارے کزن نے کل کچھ ایسی بات کی کہ میں بھول نہیں پا رہا۔" وہ اس کے نزدیک ہی آ کر بیٹھا۔ اس کی بات نے بریرہ کی رنگت اڑا دی تھی۔
"کیا بات؟" اس کا لہجہ بے چینی سے لرزا۔
"اس نے کہا، میں تمہیں اس سے اڑا لے گیا ہوں۔ کیا تم مجھے اس بات کا ایگزیکٹ مطلب بتا سکتی ہو؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا، جہاں

گھبراہٹ کے کئی رنگ ابھرے۔

"اسے۔ مذاق کرنے کی عادت ہے۔" وہ بس اتنا ہی کہہ پائی۔

"ایسا مذاق؟" اس کے چہرے کے عضلات تنے، آنکھوں میں دبا دبا قہر اترا۔ "میری بیوی کے بارے میں؟ میں سہنے کا عادی نہیں۔"

وہ ساکت ہوئی۔

یہ لہجہ — یہ آنکھیں، یہ لہجہ — کوئی ان دیکھے دریچے سے کھل گئے تھے۔

"تو اس کے لیے میں کیسے قصوروار ہوئی؟" اس کے دھیمے لرزیدہ لہجے میں بے بسی کی آمیزش تھی۔

"کیا سچ میں قصوروار نہیں؟" اس نے جس انداز میں یہ سوال کیا۔

بے یقینی سے وہ چند لمحے گنگ رہ گئی۔

"آپ۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" اس کا حلق خشک ہو چکا تھا، وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

"یہی کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔" پیشانی سہلاتے ہوئے ہنس کر کہتے اس کے لہجے میں عجیب سی چبھن تھی۔

"ایسا کچھ نہیں۔ جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔"

"ایسا ہی ہے۔ اور تم نے خود کہا تھا پہلی رات ہی اپنی بہن سے۔ بھول گئیں؟" اس نے یاد دلایا تھا، بریرہ کا سر جھک گیا۔

"مجھے یاد ہے۔ بھول گیا تھا۔ مگر آج پھر سے یاد کرنا پڑا۔ ایک ایک لفظ۔" اس کی سرمئی آنکھوں میں جو دہک تھی۔ برف میں دبا ہوا لاوا۔

وہ بس نفی میں سر ہلاتی جا رہی تھی۔ "ایسا نہیں ہے۔ وہ میں نے اس لیے نہیں کہا تھا۔ وہ اور بات تھی۔"

"سو جاؤ۔" وہ اس کی بات تیزی سے کاٹتا اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے نہیں سنا، بریرہ نے کیا کہا، نہ یقین کیا۔

کرتا بھی کیوں۔ وہ اسے جانتا ہی کتنا تھا۔ محض کچھ دن۔ اسے لگ رہا تھا اس کے بستر میں ہزاروں کانٹے اگ آئے ہوں۔

"یہ تم نے کیا کیا طٰہٰ۔ یہ تم نے کیا کیا۔" منہ پر ہاتھ رکھے سسکیاں دباتے ہوئے وہ دل ہی دل میں طٰہٰ پر چیخ اٹھی تھی۔

صبح اس کی آنکھ باہر سے آتی آوازوں پر کھلی۔ وہ بند آنکھوں سے ہی کچھ دیر تو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا پھر آنکھیں کھولیں۔

کمرے میں نیم اندھیرا تھا مگر بھڑے ہوئے دروازے سے آتی ہلکی روشنی بتا رہی تھی کہ آدھا دن چڑھ آیا ہے۔ وہ بے اختیار اٹھ بیٹھا۔ اس کا اتنی دیر تک سونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر آدھی رات کے بعد جو آنکھ لگی تو اس کا یہی نتیجہ نکلنا تھا۔

اسی وقت دروازہ کھلا اور بریرہ اندر داخل ہوئی اور اسے جاگتا پا کر اپنی جگہ ٹھہر گئی۔

کھلے گریبان، بکھرے بال اور سرخ آنکھوں کے ساتھ بکھرے حلیے میں بھی ایک پل کو اس کی دھڑکنیں تھم سی گئیں۔

"کوئی آیا ہے کیا؟" اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کی چچی۔ شاید۔" اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

"شاید؟" چارجنگ سے اپنا موبائل نکالتے ہوئے محب نے اس جواب پر اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"بھابھی نے بتایا، وہ آپ کے اباجی کے سوتیلے بھائی کی بیوی ہیں۔" وضاحت دیتے ہوئے وہ آ کے بیڈ پر بیٹھی۔

"میرے اباجی۔" دہراتے ہوئے وہ ذرا ہنسا۔ "میرے اباجی تمہارے بھی کچھ لگتے ہیں۔" اس نے جتایا۔ شاید کل کے ملے شاک سے وہ سنبھلنے لگا تھا۔

وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ "میں ابھی تک یہی سوچ رہی ہوں کہ انہیں کیا کہہ کے پکاروں۔"

"مطلب۔ تم نے ابھی تک انہیں پکارا بھی نہیں؟" وہ حیرت سے دریافت کر رہا تھا۔

"براہ راست تو نہیں۔ ایسا کوئی موقع ہی نہیں آیا۔" وہ اس کی سحر انگیز آنکھوں میں دیکھنے سے گریز

کر رہی تھی۔
''آپا بھی ہوگا تو آئیں بائیں شائیں کر کے نکل لی ہوگی۔'' اس نے طنز کیا تھا۔
''ناشتے میں کیا لیں گے آپ؟''
وہ الماری سے اپنے کپڑے نکال رہا تھا اس کے سوال پر نا سمجھنے والی نظروں سے اسے دیکھا۔
''بھابھی کو پتا ہے۔''
''لیکن مجھے نہیں پتا۔'' اس کے جواب پر بریرہ بمشکل ضبط کر پائی۔
پھر بھی وہ اس کے لہجے کی تپش محسوس کر گیا تھا۔
''تمہیں پتا کر کے کرنا بھی کیا ہے۔'' محبت کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو، تم ہوتی کون ہو پتا کرنے والی۔
''کچھ نہیں۔'' اس بار بریرہ نے اپنی ناگواری نہیں چھپائی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بنا رکے کمرے سے نکل گئی۔
ایک ہلکی سی مسکراہٹ لبوں میں دبائے وہ سر جھٹک کر واش روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔
اور جب وہ باہر نکلا تو بریرہ صوفہ سیٹ کے سامنے رکھے ٹیبل پر ناشتہ لگا رہی تھی۔
اس کی آہٹ پر مڑی تو اسے اپنی جانب حیران نظروں سے دیکھتا پایا۔ سفید رنگ کے لباس میں سیدھی مانگ نکالے سادہ سی چوٹی بنائے وہ اس کی نظروں کے ارتکاز پر گلابی پڑ گئی۔
''تمہیں بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔'' محبت اس کے خوشنما چہرے کو تکتا جا رہا تھا اس کے حسن میں ایک نرم سا سحر تھا، نگاہ کو باندھ کر رکھنے والا۔
''تو پھر کسے بنانے کی ضرورت تھی؟ اور بات ضرورت کی نہیں، یہ میری ذمہ داری ہے اب۔ ویسے بھی فارغ بیٹھنا مجھے کبھی آیا ہی نہیں۔'' کہتے ہوئے اس نے جھک کر اس کا پھینکا گیا تولیہ اور شرٹ اٹھائی۔
''ہاں۔! یہ صرف تمہاری ذمہ داری ہے جسے نبھانے کی تم خود کو پابند پاتی ہو۔'' اسے یوں حق سے اس کمرے میں مصروف دیکھ کر محبت کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی کوئی نوکیلی سلاخ اندر تک کاٹ گئی تھی۔ اس کا دل یکا یک اچاٹ ہوا۔
''مجھے بھوک نہیں۔ واپس لے جاؤ۔''
اس کے سرد لہجے پر بریرہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
تھوڑی دیر پہلے کی نرمی کی جگہ اجنبیت کی برفیلی تہہ نے لے لی تھی۔ چکھنا تو دور۔ اس نے دوبارہ ناشتے کی طرف دیکھا تک نہیں۔
بس سرد سی خاموشی سے پلٹا اور کمرا چھوڑ گیا۔
وہ بے دم ہوتے وجود کے ساتھ صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ چائے سے ابھی بھی بھاپ اٹھ رہی تھی۔
''اس کی غلط فہمی بے جا نہیں۔ نہ اس کا ردعمل۔'' وہ خود کو سمجھا رہی تھی۔ ''غلطی مجھ سے ہوئی ہے، بیوقوفی میں نے کی ہے۔ محبت کی جگہ کوئی بھی دوسرا مرد ہوتا، یہی سوچتا، یہی کرتا۔ اب مجھے ہی سب ٹھیک کرنا ہے۔ کوئی میری طرف سے اس کا دل صاف نہیں کر سکتا سوائے میرے۔ میرے سوا اور کوئی نہیں جو اس کی نگاہوں کی دھند صاف کر سکے۔'' خود کو دلاسہ دیتے ہوئے ان لمحوں میں اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ مرد کے دل میں اگر ایک بار شک کا بیج گر جائے، تو وہ کسی زہریلی بیل کی طرح بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ جڑ سے اکھاڑنے پر بھی وہاں کی مٹی بنجر ہی رہتی ہے ہمیشہ کے لیے۔

☆☆☆

اس نے پہلی بار بریرہ کو سمیر کی شادی میں دیکھا تھا۔
اور اسے دیکھتے ہی محبت نے سوچ لیا تھا کہ وہ شادی کرے گا تو اسی لڑکی سے۔ بریرہ نہیں جانتی تھی اور نہ ہی محبت کو اسے یہ بتانے کا موقع ملا تھا کہ ان کی اس سیدھی سادی ارینج میرج کے پیچھے محبت کی جنونی اور مصمم ارادوں والی محبت کی کارفرمائیاں شامل تھیں۔
یہ سب وہ اسے بتانے والا تھا مگر شادی کی رات ہی رحمہ سے ہو رہی اس کی ناراضی اور شکووں

سے بھرپور گفتگو سننے کے بعد اسے اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔ محب کو اس کی باتوں کا برا نہیں لگا تھا، نہ کوئی دوسری سوچ ذہن میں آئی تھی۔ وہ سمجھتا تھا۔ بریرہ شہر کی لڑکی تھی، اس نے اب تک کی زندگی ساری سہولتوں اور آسائشات کے ساتھ ایک بالکل مختلف ماحول میں گزاری تھی۔ اس نے تو پہلے سے ہی سوچ لیا تھا اگر بریرہ کو گاؤں میں رہنا پسند نہیں تو وہ اسے یہاں نہیں رکھے گا۔ مگر۔ اس کی دنیا زیر وزبر تب ہوئی جب وہ اس کے کزن طٰہٰ سے ملا۔ اب وہ سوچتا تھا تو اسے خیال آتا تھا کی بریرہ کا اتنی شدت سے محض دو دن کے لیے میکے جانے کا اصرار بھی بے جا نہیں تھا۔ اس کے پیچھے بڑی مضبوط وجہ تھی۔ طٰہٰ۔ اس سے بات کر کے محب کو احساس ہوا کہ وہ صرف خوش شکل ہی نہیں خوش گفتار بھی ہے۔

محب خود بھی باتوں میں اچھا تھا، ان کے درمیان گپ شپ چل نکلی تھی۔ اور اسی طرح جاب اور شادی سے متعلق بات پر اس نے کہا۔ ”ہاں جاب ملتے ہی شادی کا ارادہ تھا مگر کزن صاحبہ کو تو آپ لے اڑے۔“

اس کا لہجہ سرسری تھا، اس کی ہنسی عام تھی۔ مگر محب کے اندر جیسے کچھ کلک ہوا تھا۔ ایک دم سے اس کا جی مکدر ہوا اور باقی کا وقت اس نے خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوششوں میں گزارا۔ بریرہ کے آنے پر محب نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔

وہ طٰہٰ کو دیکھ رہا تھا، جانچ رہا تھا۔ اپنی بیوی کے وجود پر اس کی محویت بھری نظریں محسوس کر رہا تھا۔ وہ خود بھی ان لمحوں سے گزرا تھا، یہ نظریں اچھی طرح پہچانتا تھا۔

یہ سب کچھ کتنا پرفیکٹ تھا۔ قریبی کزن۔ بچپن کے دوست۔ شاید مستقبل کے سنہرے خواب بھی۔

اور ایسے میں اچانک وہ آ گیا ان دونوں کے بیچ۔ کسی خاموش فلم میں شور مچاتا اجنبی کردار۔ جو کہانی کی سمت بدل دے۔

وہ ازسرنو ہر ایک بات سوچ رہا تھا۔ یاد کر رہا تھا۔ طٰہٰ کی بات سے بھڑکنے والی چنگاری یکا یک خاموش آگ میں بدلتی اس کا ہر یقین، ہر خوش کن خیال خاکستر کر رہی تھی۔

بریرہ کی پہلی رات کی گئی باتیں، اس کے میکے جانے کے لیے اس قدر اصرار۔ اس کا ہر انداز، ہر طرز عمل۔ اسے شک کی دبیز دھند میں لپٹا نظر آنے لگا تھا۔

بریرہ سے بات کرنے کے بعد بھی اسے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ درحقیقت وہ اس کی جھوٹی تاویلیں سننا ہی نہیں چاہتا تھا، کون سی لڑکی اپنے شوہر کے سامنے اپنی سابقہ چاہت کا اعتراف کرتی ہے۔ بریرہ بھی انکار ہی کرتی جیسے اس نے کیا۔

اس وقت باغ میں موجود پیکنگ میں مصروف مزدوروں کے شور و ہلچل کے باوجود اس کے دل و دماغ میں الگ ہی جنگ چھڑی تھی۔

جب ذہنی پراگندگی حد سے بڑھی تو وہ ستانے کو ایک درخت کے نیچے بچھی چارپائی پر نیم دراز ہوا۔ موبائل نکالا اور نظریں بریرہ کے نمبر پر جما دیں۔ اس کا شدت سے دل چاہا اس کی آواز سننے کو۔

اس نے کال ملائی تھی۔ مگر ذہن کو پرسکون رکھنے کی یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔

نمبر دوسری لائن پر مصروف تھا۔

وہ ممکنہ طور پر رحمہ کے ساتھ بزی ہو سکتی تھی یا پھر کسی دوسری کزن کے ساتھ۔

وہ بے اختیار اٹھ بیٹھا، ایک بار پھر کال ملائی، اور ایک بار پھر وہی ریکارڈڈ آواز۔

”آپ کا مطلوبہ نمبر دوسری کال پر مصروف ہے۔“

لب بھینچے، دھندلائی نظروں سے وہ اپنے آس پاس چلتے پھرتے لوگوں کو محسوس کر رہا تھا۔ نظریں خالی تھیں۔ اور ذہن میں آن کی آن میں اگتا خدشوں اور بدگمانیوں کا جنگل۔

اسے ہمیشہ لگا تھا کہ وہ ایک مضبوط، متوازن اور شعور یافتہ مرد ہے۔

شک، وسوسے، تذبذب... ان کے لیے اس کے دل میں کبھی کوئی جگہ نہیں رہی۔
مگر بریرہ کی آمد نے وہ زمین ہی ہلا دی تھی، جس پر وہ برسوں سے کھڑا تھا۔ اب تو یہ حالت تھی کہ اس کا خود پر بھی یقین متزلزل ہونے لگا تھا۔
آج ان کی ایک جگہ دعوت تھی۔ وہ ٹھیک سے تو نہیں جانتی تھی، شاید محبت کے ننھیال والوں میں سے تھے۔ ویسے تو بھابی وقتاً فوقتاً اسے سب کے بارے میں بتاتی رہتی تھیں۔ مگر نئے نئے دن تھے اور وہ ابھی سبھی رشتے داروں کو ذہن کے ایک گوشے میں نام اور رشتے کے ساتھ محفوظ کرتی جا رہی تھی۔ ان کا خاندان بھی تو اتنا بڑا تھا۔
گہرے جامنی رنگ کے لباس میں جس پر شیشوں کا خوب صورت کام تھا۔ یہ جوڑا اس کے بری کے جوڑوں میں سے تھا۔
گرمی تھی بالوں کو کھلا چھوڑنے کے بجائے جوڑے میں قید کیا اور زیادہ میک اپ سے احتراز کرتے ہوئے صرف لپ اسٹک کو ترجیح دی۔ پھر سائڈ میں پڑا دوپٹہ اٹھا کر کندھے پر ڈالتے ہوئے اس نے ذرا گھوم کر اپنے سراپے کا جائزہ لیا۔
''اچھی لگ رہی ہو مامی۔''
اچانک آئی اس آواز پر اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ریشماں کھڑی تھی۔ آپا کی بڑی صاحبزادی۔ وہ شادی کے بعد سے یہیں تھی۔ نئی مامی کی آمد نے اسے اتنا پرجوش کر دیا تھا کہ اس نے ماں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔
''شکریہ۔'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ ''اندر آؤ نا۔ وہاں کیوں کھڑی ہو۔''
''میں دیکھنے آئی تھی۔ نانا جی پوچھ رہے ماما آئے کہ نہیں۔'' اس نے بتایا۔
''اوہ۔'' بریرہ کے ہونٹ سکڑ گئے۔ ''وہ شاید ابھی آتے ہوں۔ تم آؤ۔ میں تمہارا میک اپ کر دوں۔ تم ساتھ چل رہی ہو نا؟''
''سچی۔'' اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اس خیال سے ہی۔ مگر پھر وہ دھیمی پڑ گئی۔ ''پر میں نے تو ابھی کپڑے بھی نہیں بدلے۔ میں کپڑے بدل کے بس ابھی آئی۔''
''ٹھیک ہے۔'' وہ اس کے جوش پر وہ ہنسی۔
وہ بہت تیزی سے پلٹی تھی اور کمرے میں داخل ہوتے محبت سے بری طرح ٹکرا گئی۔
''آرام سے۔ ٹرین چھوٹ رہی ہے کیا۔'' محبت نے اسے کندھوں سے پکڑ کر روکا۔
وہ کھلکھلا کر ہنسی اور بھاگ گئی۔
بریرہ کے اعصاب الرٹ ہوئے تھے۔
محبت کی نظریں اس کے سراپے میں الجھ کر رہ گئیں۔
''کہیں جانا ہے؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔
اس نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔
''آپ کے ماموں کی طرف۔'' بتاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر ذہن میں تصدیق کی کہ وہ ماموں ہی تھے۔
''اوہ۔ میں بھول گیا تھا۔'' اس نے یہ سنتے ہی بے اختیار پیشانی مسلی۔ ''آج سارا دن منڈی میں مصروف گزرا اس لیے ذہن سے ہی نکل گیا۔''
اس کے چہرے کے تھکن اور حلیے پر اٹی گرد بتا رہی تھی اس کی مصروفیت۔ وہ مضمحل انداز میں بیڈ پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا تھا۔
اور بریرہ ڈریسنگ ٹیبل سے ٹیک لگائے اسے دیکھنے لگی۔
سرخی مائل گندمی رنگت اور ایک ہی نظر میں دل مٹھی میں جکڑ لینے والی آنکھیں۔ اس وقت اس خوشنما چہرے پر اضمحلال کا رنگ نمایاں تھا۔
بریرہ کا بے اختیار دل چاہا، اس کی تھکن سمیٹ لے۔ تب ہی محبت نے اس کی نظریں محسوس کر لیں اور سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
بریرہ اتنا گڑبڑائی کہ نظر تک نہ چرا سکی۔
''میں پانی لاتی ہوں۔'' وہ جانے کو تھی۔ مگر محبت تب تک اپنی جگہ سے اٹھ چکا تھا۔

اگلی نظر آئینے پر ڈالتے ہوئے محب نے اپنے اور اس کے عکس کو دیکھا۔ اگرچہ بریرہ کی پشت تھی مگر اس کے باوجود دونوں کے سراپے کا تضاد نمایاں تھا۔

اور اس کے لیے محب کے ذہن میں بس ایک ہی مثال آئی۔

جیسے ایک نازک اندام حسین شہزادی کسی غریب جفاکش مزدور کو مل گئی ہو۔

ایک بار پھر ایک طویل گہری سانس بھرتے ہوئے۔ اپنی گھڑی ٹیبل پر پھینک کر پیچھے ہٹا۔

بریرہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر گھڑی کی طرف۔

وہ مسکراہٹ لبوں میں دبائے۔

نہانے گیا تو وہ بیڈ پر پڑا اس کا موبائل دیکھنے لگی۔ وہ آن تھا، بیٹری بھی ٹھیک ٹھاک تھی، بس ایرپلین موڈ پر تھا۔

اس نے نچلا لب دانتوں تلے دبایا۔ آج صبح خالہ سے بات کرتے ہوئے محب نے کال کرنے کی کوشش کی تھی۔ تب وہ خالہ کی بات کاٹ نہیں سکتی تھی۔ اور تھوڑی دیر بعد جب اس نے کال بیک کرنے کی کوشش کی تو وہ فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ اور پھر نمبر ہی بند آنے لگا۔

اب بریرہ کو سمجھ میں آ رہا تھا، نہ سگنلز کا مسئلہ تھا نہ بیٹری کا۔ وہ بات کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس کا پھر سے دم الجھنے لگا۔

اسی وقت ریشماں چلی آئی۔ اس نے کپڑے بدل لیے تھے۔

بادل نخواستہ چہرے پر مسکراہٹ سجا کر اس نے خود کو نارمل کیا تھا۔

☆☆☆

خالہ نے انہیں دعوت پر مدعو کیا تھا۔ اس سے بات کرنے کے بعد انہوں نے بھابی سے بھی بات کی۔ بریرہ کو بہو نہ بنا سکنے کے اپنے ذاتی ملال کو ایک طرف رکھ وہ ایک ماں کی اس کے سسرال والوں سے تعلقات رکھنا چاہتی تھیں۔

بریرہ سمجھتی تھی نگران کے اس دعوت نامے سے وہ عجیب ہی مخمصے میں پڑ گئی۔ محب پہلے ہی اس کے اور طٰہٰ کے حوالے سے بدگمانی کا شکار تھا، ایسے میں وہ اسے بتاتی کہ طٰہٰ کی ماں اسے اپنے گھر بلانا چاہ رہی ہیں تب اس کا کیا ردعمل ہوتا۔

اس مشکل کا اسے ایک ہی حل سمجھ میں آیا اور وہ بھابی کے پاس چلی آئی۔

اس وقت تک رات کا کھانا کھایا جا چکا تھا۔ محب اور زبیر بھائی اباجی کے کمرے میں تھے، اور بھابھی اپنے کمرے میں منے کو سلا رہی تھیں۔ ریشماں بھی وہیں موجود تھی بھابی کے موبائل میں منہ دیے۔

"آ ناں بریرہ۔ بیٹھ ادھر۔" اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر انہوں نے بڑے پیار سے اسے پکارا۔

"یہ ابھی تک سویا نہیں؟" اس نے بیٹھتے ہوئے ڈیڑھ سالہ وارث کے ننھے ننھے پیروں پر گدگدی کی۔

"جب تک یہ میری نیند کا بیڑا غرق نہ کر لے، اسے نیند نہیں آتی۔" وہ جھنجلائی ہوئی تھیں۔ "سدلیس کو سوئے اتنی دیر ہو گئی۔"

اس نے بھابی کے دوسری جانب سوئے سدلیس پر نظر ڈالی۔

"اس عمر کے بچوں کے الگ ہی سیاپے۔ تجھے بھی جتنی نیندیں پوری کرنی ہوں، کر لے۔ ایک بار بچہ گود میں آ گیا، پھر یہ سکھ یاد آئیں گے۔" ان کا انداز چھیڑنے والا تھا۔ بریرہ کا چہرہ سرخ ہوا۔

وہ انہیں کیا بتاتی، اس کی نیندیں پہلے ہی حرام ہیں۔

پہلے پہل تو ماحول کی اجنبیت اس کی بے خواب راتوں کی وجہ تھی۔ یہ لوگ تو عشاء کی نماز کے بعد ہی سو جاتے تھے۔ سوائے محب کے جو رات دیر تک دوستوں میں بیٹھا رہتا تھا۔ ایسے میں وہ اپنے بیڈ پر کروٹیں بدلتی، موبائل یہاں بے کار ہی تھا۔ واقعی

فائی تھا نہیں اوراس کے سم پر نیٹ اتنا سلو تھا کہ واٹس ایپ میسج تک ایک گھنٹے میں ڈیلیور ہوتا اور ادھر رحمہ اس کے ریپلائے کا انتظار کرتے کرتے غصے سے آف لائن ہو جاتی۔ یہ تو شکر تھا، کال لگ جاتی تھی۔ اس نے سوچا تھا، جو سم یہاں چلتی ہو وہی نکلوائے جو گھر کے باقی لوگ بھی استعمال کرتے تھے۔ مگر اس کے لیے محب سے بات کرنی پڑتی، اور آج کل جو اس کے تیور تھے وہ تو اس سے ضروری بات کرنے سے بھی کترانے لگی تھی اسی لیے تو اس وقت بھابھی کے کمرے میں موجود تھی۔

"بھابھی۔!" اس نے جھجکتے ہوئے ان کی سمت دیکھا۔ "آپ نے اباجی کو بتایا دعوت کے متعلق؟"

"ہاں۔ ان کو تو میں نے صبح ہی بتا دیا تھا۔ میں جانتی تھی، تجھے بے چینی ہو رہی ہوگی، دعوت میکے والوں کی طرف سے ہو تو بندہ زیادہ اتاولا ہونے لگتا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"آپ محب کو بھی بتا دیں گی؟" چند لمحے اضطرابی کیفیت میں اپنے ہاتھوں پر نظریں جمائے رکھنے کے بعد اس نے مدھم لہجے میں کہا تھا۔

بھابھی ایک دم چونک کر سیدھی ہو بیٹھیں۔ اور اس نے ریشماں کو بھی متوجہ ہوتے محسوس کیا۔

"تو نے ابھی تک اسے بتایا نہیں؟" وہ حیرانی سے دریافت کر رہی تھیں۔

اس نے بنا کچھ کہے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں؟"

اس کی سمجھ میں نہیں آیا، کیا کہے۔ اب وہ ان کے اس حیران اور مشکوک "کیوں" کا کیا جواب دیتی۔

"ایسے ہی۔ مجھے لگا، آپ کہہ دیں گی۔ خالہ نے آپ سے بھی بات کی ناں۔" یہ انتہائی بے تکا جواب تھا مگر اسے کچھ تو کہنا تھا۔

"چل ٹھیک ہے، میں کہہ دوں گی۔ تو زیادہ پریشان نہ ہو۔" اپنی سادہ طبیعت کے باعث بھابھی زیادہ گہرائی میں تو نہیں اتریں مگر اس کی کیفیت سے یہ تو ان پر واضح تھا کہ وہ محب کو بتانے کے خیال سے پریشان ہے۔ وہ واجبی تعلیم والی سیدھی سادی عورت تھیں۔ انہیں خود شادی کے بعد شوہر سے بے تکلفی والی بات چیت میں ایک عرصہ لگ گیا تھا۔ انہوں نے بریرہ کے لیے بھی یہی خیال کیا۔

زیر لب شکریہ کہتے ہوئے بریرہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دل سے واقعی ایک بوجھ اترا تھا۔ پھر بھی اس نے تہیہ کر لیا تھا، آئندہ بھابھی کو اپنے مسئلوں میں شریک نہ کرنے کا۔

وہ کمرے میں آیا تو بریرہ واش روم میں تھی، اور پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔

وہ آج معمول کے برخلاف سیدھا کمرے میں آ گیا تھا، کیونکہ جس وقت وہ باہر جانے کی تیاری میں تھا، بھابھی نے آ کر اس سے بات کی۔

وہ چند لمحے انہیں دیکھتا رہا۔

"کون سی خالہ؟" اس نے پوچھا، ذہن میں کہیں یہ خیال تھا کہ شاید کوئی دوسری خالہ ہوں۔

"ارے۔ ایک ہی تو خالہ ہے بریرہ کی۔ تجھے ابھی تک یہ نہیں پتا؟" انہوں نے تاسف زدہ حیرت کا اظہار کیا۔

"دعوت کب ہے؟" اس کی آواز سپاٹ ہوئی۔ اعصاب یکایک عجیب سے تناؤ کی زد میں آئے تھے اور یہ اثر چہرے پر بھی چھلکا۔

"ہفتہ۔ ویسے انہوں نے کہا جو دن ہمیں ٹھیک لگے۔ ہفتہ، اتوار میں سے۔ تو بتا؟" بھابھی پوچھ رہی تھیں۔

اس نے ایک گہری سانس خارج کی۔ "بریرہ کیا کہتی ہے؟"

"اس بیچاری نے کیا کہنا ہے۔ پر اسے جلدی تو ہو رہی ہوگی۔ آخر میکہ ہے اس کا۔ اس نے کہا پہلے تجھ سے پوچھ لوں۔" اپنی دھن میں کہتے ہوئے بھابھی کو پتا ہی نہیں چلا کہ انہوں نے اپنی بات سے

کیسے اس کا تن من سلگا دیا تھا۔
"تو اس نے آپ سے کہا مجھ سے بات کرنے کے لیے۔" اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ آئی۔ وہ خود اسے یہ بات نہیں بتا سکتی تھی۔ خالہ کے گھر جانے کی بات کرنے کے لیے بھی اس نے بھابھی کو آگے کر دیا۔ یہ اس کے دل کا چور نہیں تو اور کیا تھا۔
وہ کوئی جواب دیے بغیر پلٹ گیا۔ پیچھے بھابھی حیرت سے اسے جاتا دیکھتی رہ گئیں۔
اور اس وقت لاشعوری طور اس کے نکلنے کے انتظار میں وہ جوتوں سمیت ہی بیڈ پر آلیٹا تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑے بریرہ کے موبائل میں تھرتھراہٹ نے اسے متوجہ تو کیا مگر اس نے اٹھ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔
محب اپنا دماغ پرسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ بریرہ سے بات کرتے ہوئے وہ اپنا ضبط نہ کھو دے۔
تھوڑے وقفے سے موبائل کے اسکرین پر پھر روشنی ابھری۔ وہ جو کوئی بھی تھا، بڑا مستقل مزاج تھا۔
اس بار اس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھا ہی لیا۔ جو شاید اسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔
اسکرین پر نگاہ ڈالتے ہی دماغ میں جھماکا ہوا وہ اسے بت بنا گیا تھا۔
وہ اسکرین پر طٰہٰ کے نام کو گھور رہا تھا یک ٹک۔ جب تک کہ اسکرین کی روشنی تاریکی میں نہ بدل گئی۔
وہ تقریباً پندرہ منٹ بعد نکلی تھی۔ گیلے بال تولیے میں لپیٹے۔ ڈھیلی ڈھالی نائٹی نما کرتی میں۔
حیران نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بریرہ کے رگ و پے میں عجیب سی بے چینی کی لہر دوڑی۔
وہ جو آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا تھا، اس کی آہٹ محسوس کرتے ہی اس نے بازو ہٹا کر اسے دیکھا۔
"بھابھی نے بتایا، تم اپنی خالہ کے گھر جانا چاہتی ہو۔" وہ اٹھ بیٹھا۔ سوال کرتے ہوئے محب نے سرتاپا اس کا جائزہ لیا تھا۔
"بات میرے چاہنے کی نہیں ہے۔ انہوں نے بلایا ہے۔ صرف مجھے نہیں، سب کو۔" اس نے دھیرے سے جواب دیا۔
"تو مطلب تم نہیں جانا چاہتیں؟" محب نے اس کے الفاظ پکڑے۔
بریرہ ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اس سے کیا اگلوانا چاہ رہا تھا۔
"میں کیوں نہیں جانا چاہوں گی۔ وہ میری خالہ کا گھر ہے۔"
"اور؟"
"اور کیا؟" اسے محب کا رویہ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ کچھ عجیب تھا اور یہ بات اس کا دل ڈبونے کے لیے کافی تھی۔
"اور طٰہٰ کا گھر ہے۔" محب نے بات پوری کی۔
اس کا چہرہ سرخ پڑا۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔
"اس کا نام مت لیجیے۔"
"کیا فرق پڑتا ہے نام لینے نہ لینے سے۔ وہ چوبیس گھنٹے میرے دماغ میں موجود رہتا ہے اور تمہارے بھی۔" کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عجیب ہی طوفان بھرنے لگا تھا۔
"میرے دماغ میں نہیں ہے وہ، نہ میرا اس سے کوئی ایسا تعلق ہے۔ کبھی تھا ہی نہیں۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ آپ کو میرا یقین نہیں۔ میری باتیں آپ کو جھوٹ لگتی ہیں تو میرے یہاں ہونے کا مطلب کیا ہے؟" وہ رو پڑی تھی بے بسی سے۔
"تم چاہتی ہو، میں تمہیں چھوڑوں تاکہ اپنے کزن سے ری یونائٹ ہوتے ہوئے تمہیں کوئی گلٹ نہ ہو۔" وہ اس کی سماعتوں میں زہریلے نشتر اتار رہا تھا۔
وہ بے یقینی سے اسے تک رہی تھی۔ "یہ۔ یہ مت کیجیے۔ آپ بہت غلط کر رہے ہیں۔" اس کی دھیمی کانپتی آواز ابھری۔

"میں غلط کر رہا ہوں؟ اور جو تم کر رہی ہو، وہ کیا ہے؟" بریرہ کی بات پر اس کا ضبط چھوٹ گیا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اس کی آواز بلند ہوئی۔
بریرہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی۔ وحشت زدہ ہو کر اس نے ادھ کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔ یقیناً محب کی آواز باہر سنی گئی ہوگی۔
"کیا۔ کیا۔ کیا ہے میں نے۔" اس کے منہ سے الفاظ ٹکڑوں کی صورت میں ادا ہوئے تھے۔ وہ حقیقتاً اس کے جنونی غصے سے اندر تک خوفزدہ ہو گئی تھی۔
محب نے جواب دینے کے بجائے موبائل اٹھا کر اس کی طرف پھینکا تھا۔
فرش پر قالین ہونے کے باوجود جتنی قوت سے اس نے پھینکا تھا، گرتے ہی ٹھک کی آواز آئی تھی۔
اس کا دل ڈوب رہا تھا، جھکتے ہوئے اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے موبائل اٹھا کر پلٹا۔ اسکرین دراڑوں سے بھر چکی تھی۔ مگر پھر بھی وہ مس کالز اور دو میسیجز کے ساتھ طٰہٰ کا نام پڑھ سکتی تھی۔ اس کی رنگت سفید پڑ گئی۔
وہ اس کے قریب آیا تھا۔ ضبط کی سرخی آنکھوں میں لیے، جلتی نظریں اس کے چہرے پر جمائے۔
"جانتی ہو، میں کیا سوچتا تھا۔ میں بھی ایسا شوہر نہیں بنوں گا جو بیوی پر شک کرے، اس کا موبائل چیک کرے۔ اس کے پل پل کی خبر رکھے۔ مگر دیکھو مجھے کیا ملا۔ میری بیوی اس شخص سے تب بات کرتی ہے جب میں نہیں ہوتا۔ وہ تمہیں رات اس وقت، اس پہر تب کال کرتا ہے، جب میں نہیں ہوتا۔" سلگتے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے وہ صرف اس کی نہیں اپنی بھی توہین کر رہا تھا۔
وہ کہنا چاہتی تھی۔ طٰہٰ نے اس سے پہلے کبھی کال نہیں کی، شادی سے پہلے بھی اس کا طٰہٰ کے ساتھ میسیج یا واٹس ایپ پر کوئی رابطہ نہیں رہا، یقیناً کوئی وجہ ہوگی۔ شاید اسے خالہ نے کہا ہو، شاید وہ ان کے آنے کے متعلق پوچھنا چاہ رہا ہو۔ وہ بتانا چاہتی تھی کہ رات یہاں گہری محسوس ہو رہی ہے، وہاں تو شاید ابھی انہوں نے ڈنر بھی نہ کیا ہو۔ اور سب سے بڑی بات اگر وہ طٰہٰ سے خفیہ رابطے میں ہوتی تو کیا کبھی اپنا فون بنا لاک کے چھوڑتی۔
مگر اس پر سکتہ طاری تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر لب صرف پھڑپھڑا کر رہ گئے۔
"میں بچہ نہیں ہوں بریرہ۔" اس کی ٹھوڑی سختی سے پکڑ کر محب نے اپنی قہر برساتی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑیں۔ "مجھ پر مزید اپنے جھوٹے لفظوں کے جال مت پھینکنا۔"
اسے ایک جھٹکا دے کر وہ پیچھے ہٹا تھا۔
بریرہ لڑکھڑا گئی۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے پیچھے دروازہ ایک دھڑام سے بند کیا تھا۔
گھٹنوں میں سر دے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆

وہ اس وقت دوستوں کے بیچ تھا جب اس کے فون پر ایک اجنبی نمبر سے کال آنی شروع ہوئی۔ الجھن زدہ نظروں سے کچھ دیر اس نمبر کو دیکھنے کے بعد اس نے کال ریسیو کی۔
"السلام علیکم محب بھائی۔ رحمہ بات کر رہی ہوں۔" دوسری طرف سے نسوانی آواز ابھری۔
اور وہ ایک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ "وعلیکم السلام رحمہ کیسی ہو۔" ایک طرف پہ آتے ہوئے اس نے اپنی کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ شام کے اس پہر یہ کال غیر متوقع تھی۔
"میں تو ٹھیک ہوں، اپنا بتائیں۔ سب خیر تو ہے نا۔؟ کوئی خبر ہی نہیں آپ لوگوں کی طرف سے۔ بریرہ کا نمبر بھی آف آ رہا ہے۔ لاسٹ سین تو پتا نہیں کب کا ہے۔ میں نے سوچا، اس وقت آپ گھر پر ہوں گے اس لیے آپ کے نمبر پر کال کر لی۔ اور تو خیر کسی کا نمبر ہے بھی نہیں میرے پاس۔" رحمہ ایک سانس میں شروع ہو گئی تھی، لہجے میں تفکر نمایاں تھا۔

محبت کے لب بھینچ گئے۔ اسے بالکل خیال نہیں رہا تھا کہ تین دن پہلے اس نے جس طرح بریرہ کا فون پھینکا تھا، اس سے یقیناً اسے نقصان پہنچا ہوگا۔ اب احساس ہوتے ہی ندامت کی ایک ٹھنڈی لہر اسے اندر تک بھگو گئی۔

"اور خالہ کی دعوت پر بھی نہیں آئے آپ لوگ۔ ادھر ہم انتظار ہی کرتے رہے۔ اوپر سے بریرہ کا نمبر آف۔ بندہ کچھ تو اطلاع کر دے۔" رحمہ کے لہجے میں جس طرح دبا دبا غصہ تھا اس سے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ دل میں اس سے زیادہ دبائے بیٹھی ہے۔

"دراصل۔ بریرہ کا موبائل خراب ہو گیا ہے۔" جونہی رحمہ کی بات ختم ہوئی، وہ بول اٹھا ورنہ رحمہ کے انداز سے لگ نہیں رہا تھا کہ وہ اسے کچھ بولنے دے گی۔

"کیا۔ خراب ہو گیا؟ کیسے؟" رحمہ کا لہجہ چونکا ہوا تھا۔

مگر بجائے اس کی بات کا جواب دینے کے کہ میں نے پھینک کر توڑا، محبت نے بات دوسری طرف گھمائی۔

"اور دعوت پر نہ جانے کا فیصلہ بریرہ کا تھا۔" یہ بات سچ تھی۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ بریرہ نے یہ فیصلہ اس کے جھگڑنے کے بعد پریشر میں آکر کیا تھا۔ اسے خود پر شرم آئی۔ وہ واقعی ایک کمینہ شوہر بنتا جا رہا تھا۔

"اس نے ایسا کیوں کیا، وہ تو خالہ کی لاڈلی ہے۔" رحمہ کو یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

"ہاں۔ لاڈلی۔" وہ سلگ ہی گیا، کنپٹی کی رگ پھڑک اٹھی۔

"اور موبائل خراب ہو گیا تھا تو آپ کے فون سے فون کر کے بتا دیتی یا ایک میسج ہی کر دیتی۔ اتنی عجیب حرکتیں کیوں کر رہی ہے، وہ اتنی غیر ذمہ دار تو نہیں تھی۔" رحمہ کے لہجے میں عجیب سی بے یقینی تھی۔

وہ خاموش ہی رہا، کیا کہتا کہ پچھلے دو دنوں سے ان کے بیچ بات چیت بالکل بند ہے۔

"کیا آپ میری اس سے بات کروائیں گے؟" اس نے پوچھا تھا۔

"میں باہر ہوں اس وقت۔" اس نے اطراف میں دیکھا، شام کی سرمئی روشنی اندھیرے میں تحلیل ہو رہی تھی۔ "گھر جا کر کال بیک کرتا ہوں۔"

"اچھا سنیں محبت بھائی۔"

اس سے پہلے کہ وہ کال کاٹتا، رحمہ کی پکار نے اسے باز رکھا۔

"میں بریرہ سے ملنے آنا چاہ رہی تھی۔ آسکتی ہوں؟"

"کیوں شرمندہ کر رہی ہو یار۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔ جب جی چاہے آؤ۔" وہ بے اختیار بول اٹھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ اسے کچھ بتائیے گا مت۔ اسے سرپرائز ملے تو اچھا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے قدرے تامل سے اپنی رضامندی دی اور الوداعی کلمات کہہ کر کال منقطع کر دی۔

وہ گھر آیا تو بریرہ کچن میں تھی۔ نجانے کتنی دیر میں کمرے میں آتی۔ وہ خود بھی کچن میں چلا آیا۔ سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے وہ پیاز کی کٹنگ میں مصروف تھی۔

"چائے ملے گی ایک کپ؟"

اس کی آواز پر بریرہ نے چونک کر دیکھا تھا اور محبت پیاز کی مرچوں سے سرخ ہوتی اس کی آنکھوں کو دیکھتا رہ گیا۔

"کھانا تیار ہے آدھے گھنٹے تک۔" نظر چراتے ہوئے اس نے گویا اطلاع دی۔

"لیکن مجھے چائے ہی چاہیے۔ سر میں درد ہے۔" اس نے اپنی بات پہ زور دیا۔ کھانا تیار ہونے کا مطلب تھا کہ وہ مزید گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ کمرے میں نہ آتی۔

"سر میں درد ہے تو سر درد کی گولی کھا۔ یہ کون سا وقت ہے کھانے کے ٹیم چاپینے کا۔" بھابھی نے تندور لگایا ہوا تھا، آٹا لینے کچن میں آئی تھیں۔ جب اس کی بات سنی اور دخل دیئے بنا نہ رہ سکیں۔

"وہ میں چائے کے ساتھ لے لوں گا۔" اس نے کہا اور پلٹ آیا، اس سے پہلے کہ کوئی دوسرا اعتراض سننے کو ملتا۔

تھوڑی دیر بعد اسے چائے ضرور ملی مگر بریرہ نہیں آئی۔ اس کے بجائے ریشماں آگئی تھی، چائے کے کپ کے ساتھ سر درد کی گولیوں کا پتہ لیے۔

اس کے دماغ کا میٹر صحیح معنوں میں گھوما۔ مگر ریشماں کے سامنے اس نے بہت مشکل سے تاثرات پر قابو پایا۔

"مامی کہاں ہے تمہاری۔ میں نے اس سے کہا تھا چائے لانے کے لیے۔"

"وہ بڑی مامی کے ساتھ روٹیاں لگا رہی تندور میں۔" ریشماں نے اطلاع دے کر چائے اس کے حوالے کی۔

"اسے کہاں آتا ہے روٹی لگانا۔ ہاتھ جلا لے گی اپنا۔" وہ یہ سن کر اور متفکر ہوا۔ "جا کر بلاؤ اسے۔"

ریشماں سر ہلا کر باہر نکل گئی تھی۔

اور چند لمحوں بعد وہ اس کے سامنے تھی۔ دہکتے تندور کے سامنے سے آئی تھی۔ رخساروں میں بھی شرارے جل بجھ رہے تھے۔

"کہیے۔" وہ گھبرا سی گئی اس کے لبوں کی خاموشی اور بولتی نگاہوں سے۔ اتنی جلدی تو شاید گرگٹ بھی رنگ نہ بدلے، جتنی جلدی وہ رنگ بدلتا تھا۔

"میں نے تم سے چائے کا کہا تھا۔ تم نے ریشماں کو بھیج دیا۔" اس کی گھبراہٹ محسوس کر کے اس نے نظروں کا زاویہ بدلا۔ بولا تو لہجے میں ناگواری عیاں تھی۔

"مجھے لگا، آپ کو چائے چاہیے اور وہ میں نے بھجوا دی۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

محب نے سر جھٹکا۔ یہ موضوع غیر ضروری تھا۔

"تمہارا موبائل کہاں ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"سائیڈ ٹیبل کی دراز میں۔" اس نے کسی قدر تعجب سے جواب دیا۔

وہ اب ہاتھ بڑھا کر دراز سے موبائل نکال رہا تھا۔

"آف ہے۔" موبائل کی اسکرین پر جیسے مکڑی کا جالا بن چکا تھا۔

"کچھ کام نہیں کر رہا۔ نہ کال میسج ہو رہے، نہ ریسیو ہو رہے تو آف کرنا ہی بہتر تھا۔" وہ کہہ کر پلٹنے لگی۔

"میں کل شہر جا کر نیا لے آؤں گا۔" محب کو اتنی شرمندگی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ تین دن پہلے وہ اپنے غصے کی زد میں اس کا فون برباد کر چکا تھا۔ اور اسے آج بھی خیال نہ آتا اگر رحمہ کال نہ کرتی۔

بریرہ نے اس بات پر ٹھہر کر اسے دیکھا۔

"مجھے نیا نہیں چاہیے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر اسے ریپئر کرا لوں گا۔" اس نے کہا۔

"اس کی بھی ضرورت نہیں۔" اس کی بات ختم ہوتے ہی بریرہ دوٹوک انداز میں بول اٹھی۔

محب نے حیران نظروں سے اس کے سپاٹ چہرے کا جائزہ لیا۔ "تمہیں فون کی ضرورت نہیں؟" اس نے جیسے تصدیق چاہی۔

"ابھی تو نہیں۔ فون کے بغیر ٹھیک ہوں۔ پھر کوئی کال آئی کسی رانگ نمبر سے بھی۔ تو آپ پھر سے مجھ پر فردِ جرم عائد کر دیں گے۔"

اپنی بات سے اس کا دماغ جھنجھنا کر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی۔

وہ لب بھینچے کھلے دروازے کو ہی دیکھتا رہا۔

بھابھی نے مشین لگائی ہوئی تھی۔ وہ ان کی مدد کے خیال سے دھلے ہوئے کپڑے چھت پر پھیلانے آئی تھی۔ اور جب وہ نیچے آئی، ایک خوشگوار حیرت

اس کی منتظر تھی۔

صحن میں کھڑی بھابھی کے ساتھ، باتوں میں مصروف رحمہ اسے دیکھتے ہی بازو پھیلائے اس کی طرف بڑھی۔

وہ اس اچانک جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے اس کے گلے لگی تھی۔ دل یکا یک بھر آیا۔

"ٹھیک ہو؟" دونوں ہاتھوں کو اس کے رخساروں پر رکھے رحمہ اس کا بجھا ہوا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

اس نے پلکیں جھپکتے ہوئے آنسو اندر دھکیلے اور اثبات میں سر ہلایا۔

"کس کے ساتھ آئی ہو؟ اکیلی تو نہیں آسکتیں۔" پوچھتے ہوئے اس کی نظریں بے اختیار دروازے کی طرف اٹھیں۔

"بریرہ۔ بہن کو اندر لے جا۔ گرمی ہے باہر ہی کھڑا رکھے گی کیا۔!" رحمہ کے جواب دینے سے پہلے ہی بھابھی نے گھر کا تو اسے بھی خیال آیا۔

وہ اسے اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔

"بتاؤ ناں۔ بابا آئے ہیں؟" رحمہ کی کمر کے پیچھے ایک اور تکیہ رکھتے ہوئے بریرہ اس کے سامنے آبیٹھی۔

"نہیں۔ پاگل ہو۔ بابا اتنی لمبی ڈرائیو کر سکتے ہیں کیا؟" رحمہ ٹیک لگاتے ہوئے مزید کمفرٹیبل ہو بیٹھی۔ "طٰہ کے ساتھ آئی ہوں، تمہارے جیٹھ اسے مردان خانے لے گئے۔" لاپروائی سے دیئے گئے رحمہ کے اس جواب نے اسے یوں اچھلنے پر مجبور کیا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"کیا۔ تم۔ طٰہ کے ساتھ آئی ہو؟" اس کی آواز بلند ہوئی۔

"تو اور کس کے ساتھ آتی؟" اس کے ری ایکشن نے رحمہ کو بوکھلا دیا۔

"کاشف کے ساتھ آجاتیں یا مظہر کو بول دیتیں۔" اس نے ماموں زاد کے نام لیے۔

"تمہیں لگتا ہے کہ وہ اتنے اچھے ہیں کہ اتنی دور ایک ہی دن میں آنے جانے کے لیے تیار ہو جاتے؟ طٰہ سے پوچھا تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔" اس کے ہراساں چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ خفگی اور حیرانی سے کہہ رہی تھی۔ "تمہاری ہوائیاں کیوں اڑ گئی ہیں۔ طٰہ ہے۔ کوئی چنگیز خان نہیں جو یہاں تمہارا سر لینے آیا ہو۔"

اضطراری کیفیت میں ناخن کترتے ہوئے اس کی آنکھیں ایک پل میں بھر گئیں۔

وہ جتنا کوشش کر رہی تھی، حالات اتنے ہی الٹی سمت میں جا رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بھی محب کے الزامات کو مزید ہوا دینے پر اتر آئے ہوں۔

"بریرہ۔ تم مجھے پریشان کر رہی ہو۔ بتاؤ کیا بات ہے؟" رحمہ تشویش کا شکار ہو گئی تھی۔

اس کے آنسو ٹوٹ کر گرے۔ اس نے سوچا تھا وہ اس بارے میں رحمہ کو کچھ نہیں بتائے گی، اگر وہ آج نہ آتی تو بریرہ اپنے ارادے پر قائم بھی رہتی۔ مگر اب اسے محسوس ہو رہا تھا اگر اس نے رحمہ کے آگے دل نہ کھولا تو اس کی سانس بند ہو جائے گی۔ اور اسی لیے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اسے سب بتا گئی۔

"اوہ میرے خدا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اتنے تعلیم یافتہ ہو کر بھی محب بھائی اتنے تنگ نظر نکلیں گے۔" رحمہ شاکڈ تھی۔

"بنیاد تو اسے میں نے ہی فراہم کی شادی کی رات وہ بکواس کر کے۔" اس نے ایک سرد آہ بھری۔ "کاش وہ وقت واپس ان لمحات میں موڑ سکتی اور اپنا منہ بند رکھتی۔"

"ہاں مگر اس بکواس میں تم نے کہیں یہ نہیں کہا تھا کہ تم طٰہ کو پسند کرتی ہو۔" رحمہ کا لہجہ تیز ہوا۔

"ہاں مگر میں نے مایوسی اور پچھتاوے کا اظہار کیا تھا۔ اور...... باقی کی کسر طٰہ نے پوری کر دی۔" اس نے کانپتے ہاتھوں میں چہرہ چھپایا۔

"اس طٰہ کو تو میں پوچھوں گی۔" رحمہ نے دانت پیسے۔ "کیا ضرورت تھی اسے محب بھائی کے

سامنے ایسی بکواس کرنے کی۔ ہر کوئی اپنی بیوی کے بارے میں ایسے جوکس ہضم نہیں کر سکتا۔ اور یہ دیسی لوگ تو کچھ زیادہ ہی کنزرویٹو ہوتے ہیں اس معاملے میں۔"

"اگر تم اس سرپرائز کے چکر میں نہ پڑتیں اور کل رات ہی مجھ سے بات کر لیتیں تو میں طٰہٰ کے ساتھ آنے سے منع کر دیتی۔ بلکہ تمہیں ہی آنے سے منع کر دیتی۔ اب جانتی ہو، وہ کیا سوچے گا۔ وہ سوچے گا۔ فون خراب ہونے سے میرا طٰہٰ سے رابطہ کٹا تو وہ مجھ سے ملنے یہاں تک چلا آیا۔" اس کا گلا رندھ گیا۔

"تم اس کے دماغ سے سوچ رہی ہو بریرہ۔" رحمہ حیرانی سے اس کا متوحش چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"ہاں۔ میں اس کے دماغ سے سوچ رہی ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں، وہ ایسے ہی سوچتا ہے۔" وہ ہذیانی لہجے میں بولی تھی۔

رحمہ ساکت بیٹھی چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر پوچھا۔ "تمہارا موبائل؟"

اس نے اٹھ کر دراز سے نکالا اور اس کی گود میں پھینکا۔

"کیا انہوں نے تم پر ہاتھ بھی اٹھایا؟" وہ فون کی حالت دیکھ کر ہی خوفزدہ ہو گئی۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"ہمارے ساتھ چلو۔" ایک گہری سانس بھر کر رحمہ یکدم فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"اس سے کیا ہوگا۔ واپس تو یہیں آنا ہے۔" اس نے سر جھٹکا۔

"مت آنا۔" وہ پوری طرح سنجیدہ تھی۔

"کیا کہہ رہی ہو؟" وہ سمجھ نہیں پائی۔

"یہی کہہ رہی ہوں جو تم سن رہی ہو۔ اسے تم پر یقین ہی نہیں ہے تو۔ ہر قسم کے انسان کے ساتھ گزارا ہو جاتا ہے مگر شکی انسان کے زندگی گزارنا بہت مشکل ہے بریرہ۔"

"اگر آج امی ہوتیں تو کیا وہ بھی یہی کہتیں؟" اس نے سوال کیا۔

"مطلب؟" رحمہ ٹھٹکی۔

"مائیں بیٹیوں سے یہی کہتی ہیں ناں۔ صبر و برداشت سے کام لو، جیسے بھی حالات ہوں گزارا کرو۔ ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہاں کہتی ہوں گی۔ مگر ان لڑکیوں کے شوہر ان پر اس طرح شک کر کے ان کی زندگی عذاب نہیں بناتے ہوں گے۔ اور۔" پھر کر کہتے ہوئے رحمہ نے لمحاتی توقف کیا۔ "اور میں اپنی بیٹی سے یہ نہیں کہوں گی۔"

"تم نہیں جانتی۔" اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہ تھی۔

"ٹھیک ہے تو کیا کرو گی۔ یہیں رہ کر نفسیاتی مریض بن جاؤ گی۔ دماغ کام کرنا ہی بند کر دے گا بلکہ مجھے تو لگ رہا، بند کر چکا۔" رحمہ غصے سے بڑبڑائی تھی۔

"میرے لیے دونوں طرف مشکل ہے۔ چاہے یہاں رہوں، چاہے وہاں آؤں۔" اس کی نظریں اپنے ٹوٹے پھوٹے ناخنوں پر تھیں۔

رحمہ نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ "اچھا پھر کچھ دنوں کے لیے چلو۔ ذہن بدلو۔ ماحول بدلو۔"

"چلی چلتی اگر تم طٰہٰ کے ساتھ نہ آئی ہوتیں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے؟" رحمہ نے اسے گھورا۔ "تمہیں تو پتا بھی نہیں تھا کہ طٰہٰ میرے ساتھ آ رہا ہے۔ وہ اس کے لیے تمہیں کیسے قصوروار ٹھہرا سکتے ہیں۔"

اس کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ آئی۔

"ساتھ جانے کی صورت میں ضرور ٹھہرائے گا۔"

"مجھے اس سے بات کرنے دو۔"

"نہیں۔ مت کرنا۔" اس نے ایکدم ہول کر کہا۔

"مروت۔ میں بس تمہارے ساتھ جانے کی بات کروں گی اور آرام سے کروں گی۔" اس کا خوف محسوس کر کے رحمہ کو اپنا غصہ ضبط کرنا ہی پڑا۔

وہ مزید کچھ نہیں کہہ پائی۔

اسے پتا نہیں چل سکا تھا کہ طٰہٰ کو دیکھ کے محبت کا پہلا ردعمل کیا تھا کیونکہ اس وقت وہ گھر پر نہیں تھا۔ بریرہ نے بھی سلام سے زیادہ طٰہٰ سے کوئی بات نہیں کی۔ مگر اس سارے وقت میں یہ بے چینی اس پر آسیب کی طرح حاوی رہی تھی کہ محبت کیا سوچے گا، کیا کہے گا۔ یہ بھی شکر تھا، وہ اس دن کافی لیٹ گھر آیا۔ تب وہ لنچ کر کے بس جانے کی تیاری میں تھے۔

وہ کمرے میں کسی کام سے آیا تھا جب رحمہ نے بریرہ کے ساتھ جانے کی بات کی۔

وہ ٹھٹھکا۔ ذرا سا مسکرایا۔ پھر بریرہ کی سمت دیکھا۔ وہ گویا سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اگر بریرہ جانا چاہے تو۔ اتنی دور سے بہن اور کزن اسے لینے آئے ہیں۔ میں کون ہوتا ہوں اعتراض کرنے والا۔" کہتے ہوئے اس کی گہری آنکھوں میں جو کیفیت تھی۔ وہ اس کے لفظوں سے زیادہ طاقتور تھی۔

اس کے نکلتے ہی رحمہ نے اس کی طرف رخ موڑا۔ "تم نے سنا۔ انہوں نے کیا کہا۔"

"ہاں سن لیا۔ تم جلدی کرو۔ تھوڑی دیر اور ہوئی تو گھر پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی۔" بریرہ اس کا بازو تھپتھپا کر وارڈروب سے اس کی چادر نکالنے لگی۔

"تم نہیں آرہیں۔" رحمہ اس کے تیور سمجھ کر دھیمی پڑ گئی۔

"نہیں۔" اس نے قطعیت سے یک لفظی جواب دیا تھا۔

☆☆☆

"کبھی کبھی جس چیز کو پانے کی سب زیادہ خواہش کی ہو... وہ مل بھی جائے تو دعا کی قبولیت پر یقین نہیں آتا۔ لگتا ہے جیسے یہ کوئی غلطی ہو۔ وقت کی، حالات کی یا پھر خود ہماری۔" دونوں بازو سر کے پیچھے رکھے سمیر کے سامنے والی کرسی پر براجمان وہ خود کلامی کے انداز میں گویا تھا۔

"کہنا کیا چاہتے ہو؟"

اس کی آنکھوں میں ٹھہرا اضطراب سمیر کی زیرک نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔

اس دن بریرہ کے منع کرنے کے باوجود وہ اس کے لیے نیا موبائل لینے شہر آیا تھا۔ پھر اسے سمیر سے ملنے کا خیال بھی آیا، اس وقت لنچ بریک تھا جب وہ آفس سے اٹھ کر اس کے ساتھ اس ریسٹورنٹ میں چلا آیا تھا۔ اس سے ملنے کی ایک وجہ اس کی حد سے بڑھی ذہنی پراگندگی بھی تھی، وہ اس کے بچپن کا دوست تھا اور ہر ایسے وقت میں اس کی سننے والا اس کا ہمدرد و غم گسار ساتھی بھی۔

"بریرہ کی خواہش غلطی تھی یا پھر اسے پانا؟" وہ سمیر تھا، سمجھ گیا تھا اس بات کے ڈانڈے کہاں جا کر مل رہے ہیں۔

"تم تو اسے بچپن سے جانتے ہو نا۔ کافی آنا جانا رہا ہوگا ان کے گھر؟" وہ یہ سوال اس سے نظریں ملائے بغیر کر رہا تھا۔

سمیر کی آنکھوں میں ایک پل کو استعجاب ابھرا پھر کندھے جھٹکتے ہوئے بولا۔ "ہاں جانتا ہوں۔ مگر میں کوئی اس کی سہیلی نہیں تھا مطلب۔ جیسے نارمل کزنز ہوتے ہیں ویسے ہم بھی تھے۔ ہیں۔" اس نے خود ہی اپنی تصحیح کی پھر چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم یہ اب کیوں پوچھ رہے ہو۔ یہ تو پہلے پوچھے جانے والے سوالات ہیں۔"

"میں بس۔" اس سے کوئی بات نہ بن پائی تو لمحے بھر کو چپ ہوا۔ "میں بس یونہی پوچھ رہا تھا۔"

"نہیں۔ تم یونہی نہیں پوچھ رہے تھے۔ مجھے بتاؤ محبت، مسئلہ کیا ہے؟" سمیر سیدھا ہو بیٹھا، لہجے میں بھرپور سنجیدگی لیے۔

"کیا۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ شادی... بریرہ کی مرضی کے خلاف ہوئی ہو؟" اس نے رک رک کر پوچھا۔

"نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" سمیر نے یہ سنتے ہی

شدت سے اس کی نفی کی۔

محبت کے سینے میں دبی ہوئی سانس خارج ہوئی۔

"میرے ماموں کوئی جاہل قسم کے پرانے خیالات والے انسان نہیں ہیں کہ بیٹیوں کو بھیڑ بکری کی طرح کان سے پکڑ کر کسی کے بھی حوالے کر دیں۔ کیا بریرہ نے تم سے کچھ کہا؟" وہ سوال کر رہا تھا۔

"نہیں۔" محبت کا دل یکایک انجانی سی بے چینی سے بھر گیا۔ یہ کیا کر رہا تھا وہ؟

ایک دوسرے مرد کے سامنے، اپنے دل کی الجھنیں تو ٹھیک... مگر اپنی ہی بیوی کو یوں موضوع گفتگو بنانا...؟ سمیر اس کا دوست اور ہمراز تھا... لیکن بریرہ؟

شک نے اس کے حواس پر اس قدر غلبہ پالیا تھا کہ وہ یہ بھی بھول بیٹھا کہ وہ کس کے سامنے کیا کہہ رہا ہے۔

"چلنا چاہیے۔ کافی دیر ہوگئی ہے۔" وہ ایک دم سے اپنی کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"سن۔" سمیر نے ٹیبل پر رکھے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گویا اسے روکا۔

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"بے شک میں نہیں جانتا، اس رشتے کے حوالے سے بریرہ کے دل میں کیا تھا۔ مگر میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ اسے پانے کے لیے تو نے کیا کیا پاپڑ بیلے ہیں۔ اور تو اس سے کتنا پیار کرتا ہے۔ اگر اسے کوئی مسئلہ ہے بھی۔ تجھ سے، تیرے گھر سے، یا گاؤں میں رہنے سے۔ تو وہ مسئلہ تو حل کرے گا۔ اسے خوش رکھنا تیری ذمہ داری ہے۔ اس کے دل میں اپنے لیے پیار جگانا تیرا کام ہے۔ شادی ایک ذمہ داری ہے اور پیار اس سے بڑی ذمہ داری۔ اور تو نے دونوں ایک ساتھ اپنے کندھوں پہ لی ہیں۔ تو اب مرد بن اور اسے ٹھیک سے نبھا۔" بات ختم کرتے ہوئے سمیر نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔

"جا اب۔ بھابھی انتظار کر رہی ہوگی۔"

آنکھوں میں عجیب ہی کیفیت لیے اس کی بات سنتے ہوئے اس کے آخری جملے پر محبت کے ہونٹوں پر پہلی بار دن بھر کی تھکن سے آزاد مسکراہٹ آئی تھی۔

سر ہلا کر اسے خدا حافظ کہتے ہوئے وہ وہاں سے نکل آیا۔ سمیر سے کی گئی وہ مختصر مگر بامعنی ملاقات، جیسے اس کے اندر کا شور کم کر گئی تھی۔ اگرچہ وہ پورے معاملے سے باخبر نہیں تھا پھر بھی اس کی حالت سمجھ گیا تھا۔ سچ ہے، مخلص دوست کسی بیش بہا خزانے سے کم نہیں ہوتے۔

گھر آتے ہوئے ڈرائیونگ کے دوران اس کا ذہن مسلسل مصروف رہا۔ سمیر کی باتوں نے اسے ایک نئی روشنی میں اپنا جائزہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہی کہتا ہے سمیر۔ محبت کا دعویدار تو میں ہوں۔ بریرہ تو شاید اس شادی سے پہلے مجھے جانتی بھی نہ ہو۔ اور اگر میں نے اسے اپنی دنیا میں شامل کیا ہے، تو اس کے دل تک پہنچنے کی راہ بھی مجھے ہی ڈھونڈنی ہوگی۔"

"شادی سے پہلے وہ جس کسی کی بھی زندگی کا حصہ رہی ہو... اب وہ صرف میری ہے۔"

اس نے لب بھینچتے ہوئے جیسے خود سے وعدہ کیا۔

"اور میں... میں اسے اتنی آسانی سے کھونے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

گھر پہنچتے پہنچتے اس نے دل میں کئی خوش گوار امیدیں بُن لی تھیں، کئی نئے ارادے، کئی مصمم عہد۔ اس کا ارادہ سیدھا اپنے کمرے میں جانے کا تھا، مگر بھائی کا پیغام ملا تو موبائل والا شاپر ریشماں کے حوالے کر کے قدم ڈرائنگ روم کی طرف موڑنے پڑے۔

اور۔ ان کے ساتھ بیٹھے شخص پر نظر پڑتے ہی اس کے اعصاب پر بجلی سی گری۔ طٰہٰ مسکراتے ہوئے خود ہی اٹھ کر اس کی سمت بڑھا تھا۔ خالی الذہنی کی کیفیت اتنی شدید تھی کہ اسے خود کو سنبھالنے میں کئی

لمحے لگ گئے۔

"رحمہ کہہ رہی تھی، وہ بریرہ کو سرپرائز دے گی مگر یہاں تو آپ بھی سرپرائز لگ رہے ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

وہ بدقت مسکرایا۔ رحمہ نے واقعی بریرہ سے زیادہ اسے سرپرائز کیا تھا۔

وہاں بیٹھنا، طٰہٰ کو کمپنی دینا، آخر وہ اس کا سسرالی رشتے دار تھا۔ اس کی باتیں سننا، حسب المقدور گفتگو میں شامل ہونا اس کے لیے ایک آزمائش بن گیا تھا۔

"وہ یہاں کیوں ہے؟ رحمہ کسی اور کے ساتھ بھی تو آسکتی تھی۔ طٰہٰ ہی کیوں۔ وہ کوئی اس کا اکلوتا کزن تو نہیں۔ مگر شاید۔ بریرہ کا ہے۔"

یہ سوچ تھی اور دل میں اترتی لاتعداد زہریلی سوئیاں۔ اور پھر جب رحمہ نے بریرہ کے ساتھ جانے کی بات کی۔

اس نے فوراً بریرہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

امید و بیم سے زیادہ اس کی آنکھوں میں اندیشے تھے، خوف تھا۔ مگر وہ کچھ اور ہی سمجھا۔

"ابھی طٰہٰ اسے لینے آیا ہے۔ وہ ساتھ جائیں گے۔ وہ ساتھ ہوں گے۔ اس سفر میں بھی، شاید گھر پہنچنے کے بعد بھی۔"

یہ خیالات جن کیفیات میں ڈھل کر اس کی آنکھوں تک پہنچی تھیں، وہ بریرہ تک بخوبی اس کا پیغام پہنچا گئی تھیں۔ چاہے اس نے زبان سے کچھ بھی کہا ہو۔

☆☆☆

شام میں کسی وقت بادل گھر آئے تھے اور جل تھل مینہ برسنے لگا۔ اور پھر لگاتار برستا ہی رہا۔

بیڈ پر آنے سے پہلے اس نے اپنے کمرے کی عقبی صحن میں کھلنے والی کھڑکی کھول دی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے جب کھڑکی کے پٹ کھڑکھڑاتے بارش کی بوچھاڑ اندر تک برساتے تو بوندوں کی نمی اس تک بھی آپہنچتی۔ مگر اسے برا نہیں لگ رہا تھا۔ آنکھیں موندے سونے کی کوشش کرتے ہوئے بوندوں کی سرگم اسے لوری کی طرح لگ رہی تھی۔

محبّ باہر تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔ اس موسم میں بھی۔ وہ نیم غنودگی میں جانے لگی تھی جب دروازہ کھلنے کی آواز نے اسے اس کیفیت سے نکالا۔

اس نے آنکھیں کھولیں لیکن ہلنے کی یا اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ محبّ نے دروازہ بند کیا پھر آکر کھڑکی بھی بند کر دی۔ ہواؤں کا شور تھما تھا۔ بارش کی آواز بھی دور سے آتی محسوس ہونے لگی۔

اس کی طرف پشت تھی مگر محبّ جانتا تھا۔ وہ جاگ رہی تھی۔ اور بریرہ نے بھی اس کا بیڈ کے قریب آنا محسوس کر لیا تھا۔

"تم آج اپنی بہن کے ساتھ کیوں نہیں گئیں؟" اس کی بھاری مگر مدھم آواز نے اس نرم سکوت میں ارتعاش پیدا کیا۔

بریرہ سیدھی نہیں ہوئی بس ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

وہ شاید بارش میں بھیگتا ہوا آیا تھا۔

"آپ چاہتے تھے، میں جاؤں؟" وہ اس کے بالوں سے پھسلتے قطرے کنپٹیوں میں جذب ہوتے دیکھ رہی تھی۔

"نہیں۔" یک ٹک اسے دیکھتے ہوئے وہ بے اختیاری کیفیت میں بولا۔ وہ چاہے لاکھ کوشش کرتا اس سے دور رہنے کی مگر۔ اس کی مقناطیسی کشش کے سامنے محبّ کے سارے ارادے ریت کی دیوار ثابت ہوتے تھے۔

بریرہ نے جواب دینے کے بجائے اسے ایسی نظر سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ "بس اسی لیے نہیں گئی۔" اور پھر سے اس کی طرف سے رخ پھیر لیا۔

محبّ نے بے اختیار ہاتھ بڑھایا۔

بریرہ کو ہزار وولٹ کا جھٹکا لگا۔ دل اچھل کر حلق میں آیا۔

☆☆☆

"اب بتاؤ گی بھی۔ کیا ہوا ہے؟ رات میں ایسا کون سا معرکہ ہو گیا تم دونوں کے بیچ کہ ایک دن پہلے میرے ساتھ آنے سے انکاری ہو کر مجھے اکیلے بھیج دیا اور دوسرے ہی دن فون کر کے تمہیں لینے کے لیے کسی سپر مین کو بھیجنے کی درخواست کی"۔

رحمہ کا دماغ واقعی چکرایا ہوا تھا۔ جب سے پریرہ آئی تھی، رحمہ یہ بات نجانے کتنی بار پوچھ چکی تھی۔ مگر اس نے بھی خاموشی اختیار کی ہوئی تھی، مجال ہے ہلکا سا اشارہ تک دیا ہو۔

اس وقت بھی صوفے پر نیم دراز، دھیرے سے پیر ہلاتی، آنکھیں موندے ہوئے تھی، اس کی بات پر آنکھیں ذرا سی کھول اسے دیکھا۔

"بتایا تو۔ کل تمہارے ساتھ طٰہٰ تھا۔" آواز میں وہی دھیمی، بے نیازی ٹھنڈک تھی جو رحمہ کو مزید بھڑکا گئی۔

"جھوٹ... بکواس۔ وہ بات حل ہو گئی تھی۔ تمہارے شوہر نے کہہ دیا تھا، چلی جاؤ۔"

"ہاہ۔" ایک استہزائیہ ہنسی اس کے لبوں کو چھو گئی۔

"اور پھر بھی تم نہیں آئیں تو کچھ دن انتظار کر سکتی تھیں۔ یہ کیا کہ ایک دن میں ہی ارادہ بدل لیا۔ سچ بتاؤ۔ وہ جھگڑے نا تمہارے ساتھ؟ مجھے پہلے ہی فکر ہو رہی تھی، وہاں سے تمہارے بغیر آتے ہوئے۔" رحمہ فکر و تشویش سے پوچھ رہی تھی۔

اس کے چہرے پر تفکر کے سائے دیکھ کر اس کے دل سے ایک آہ سی اٹھی۔

"ہاں۔" اس نے بالآخر کہا۔ "میں اسے اپنا یقین نہیں دلا سکتی۔ میرے الفاظ بے وقعت ہیں۔" اس کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہونے لگے مگر لہجہ ہموار تھا۔ "اور میرا وہاں دم گھٹنے لگا تھا۔"

"اوہ میری بہن۔" رحمہ نے بے اختیار اٹھ کر بازو اس کے گرد ڈالے تھے۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں مسلیں کسی نادیدہ منظر کو مٹانے کی کوشش میں۔

"میں بہک گیا تھا، سوچ ہی نہیں پایا کہ تم یہ نہیں چاہتیں"۔

وہ گنگ تھی اور ساکت۔

اس کی باقی کی رات آنکھوں میں کٹی۔ صبح ہوتے ہی اس نے بھابھی کے فون سے رحمہ کو کال کر کے کسی کو بھیجنے کو کہا۔ طٰہٰ کے علاوہ کسی کو بھی۔ کیا عجیب بات تھی کہ وہ اب بھی یہ دھیان رکھ رہی تھی۔

بھابھی اس اچانک فیصلے پر حیران تھیں۔ اس نے بہانہ سوچ لیا تھا۔ جو کہ پوری طرح بہانہ تھا بھی نہیں۔ کل ہی رحمہ نے اسے بابا کے موسمی بخار کا بتایا تھا۔

دوپہر تک کاشف اسے لینے آ گیا تھا۔ اور ایک ہی گھنٹے میں وہ وہاں سے نکل آئی... شاید ہمیشہ کے لیے۔

رحمہ کی تفتیش کا سامنا کرنے کے بعد جب اس نے کسی طرح اسے مطمئن کیا تو رات کے کھانے پر اسے بابا کے سوالات کا سامنا کرنا پڑ گیا۔

"سب ٹھیک تو ہے۔ تمہارے سسرال والے، محب؟ تم خوش ہو؟" وہ انتہائی سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے۔ ان کی فکر کی اصل وجہ اس کا آج اچانک آنا تھا جبکہ رحمہ کل ہی اس سے ملنے گئی تھی۔

اس کا دل پہلے ہی بوجھل تھا، اور بابا کا سوال گویا زخم پر نمک بن کر گرا۔

"جی بابا۔" پانی کے گھونٹ سے بمشکل نوالہ نگلتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا تھا۔

"آپ یہ سوال پوچھ ہی کیوں رہے ہیں۔ میں ناخوش ہوں تو کیا یہ بات آپ کو بتا سکتی ہوں۔" اس کی آنکھوں میں ریت چبھنے لگی۔

"میں جانتا ہوں، تم ایک بالکل مختلف ماحول میں گئی ہو۔ تمہارا رشتہ یہاں کرتے ہوئے مجھے تمہاری سمجھداری پر اتنا بھروسہ تھا کہ میں نے سوچا تم وہاں آسانی سے ایڈجسٹ کر لو گی۔ میں غلط ہو سکتا ہوں۔ اور اگر میں غلط ہوں تو مجھے جاننا ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو بیٹی رخصت کر کے سمجھتے ہیں،

ہر ذمہ داری سے بری الزمہ ہو گئے۔ اگر تمہاری زندگی کا فیصلہ میں نے کیا ہے تو میں یہ یقینی بناؤں گا کہ وہ فیصلہ درست ثابت ہو۔" وہ کہہ رہے تھے۔

"پلیز بریرہ کنٹرول۔" بے چینی سے اپنی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے رحمہ اس کی جھکتی پلکیں دیکھ سکتی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں بابا۔ خوش بھی ہوں۔ کوئی مسئلہ ہوا تو آپ کو ضرور بتاؤں گی۔ بے فکر رہیں، آپ کا فیصلہ غلط نہیں... شاید میرا ہی نصیب خراب ہے۔" آخری جملہ وہ باآواز بلند کہنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔

"تم بابا کو بتا دیتیں۔ اگر تمہارا واپس جانے کا ارادہ نہیں۔ انہیں پتا ہونا چاہیے۔ یہ چھپائے جانے والی بات نہیں۔" بعد میں رحمہ اس سے کہہ رہی تھی۔

"بتا دوں گی مگر ابھی نہیں۔ اتنی جلدی... نہ میں تیار ہوں، نہ وہ سن پائیں گے۔" اس نے کہا تھا۔ دل میں درد کی ایک لہر اٹھی۔

"تو سب ختم ہو گیا۔ میں اسے چھوڑ دوں گی... اور بھول جاؤں گی کہ میں کسی محب علی کی زوجیت میں آئی تھی۔ آہ۔ کیا میں واقعی بھول جاؤں گی" یہ خیال ہی کسی نیزے کی طرح اس دل کو دولخت کر گیا۔

☆☆☆

اس دن گھر آ کر اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا۔ کسی خالی پن کا، کسی پھیکے پن کا۔ کچھ دیر بعد بھابھی نے آ کر اس کی وجہ بھی بتا دی۔

اس کا دماغ بھک سے اڑا تھا۔ کئی لمحے گزر گئے تھے اسے اس خبر کو سمجھنے میں۔

"ہاں۔ مجھے لگا ہی تھا، وہ تجھ سے پوچھ کے نہیں جا رہی۔" بھابھی نے اس کے چہرے سے ہی بھانپ لیا۔

پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ اپنے اندرونی جذبات چہرے پر آنے سے نہیں روک پایا۔ جھٹکا ہی اتنا شدید تھا۔

"کوئی جھگڑا ہوا ہے؟ وہ کہہ رہی تھی اس کے بابا کی طبیعت نہیں ٹھیک۔ مگر مجھے شک پڑ گیا تھا۔" وہ پوچھ رہی تھیں۔

"نہیں۔" انہیں بدقت جواب دے کر وہ اپنے کمرے میں آیا تھا۔

"وہ ایسے کیسے جا سکتی ہے۔ اس طرح اچانک... بنا بتائے۔ اگر مجھے بتا کر جاتی تو کیا میں اسے روکتا۔ اور گئی کس کے ساتھ؟" اسے اچانک ہی خیال آیا کہ شاک میں وہ بھابھی سے یہ پوچھ ہی نہیں پایا۔

اس نے موبائل نکال کر بریرہ کا نمبر دیکھا۔ یہ نمبر بھی بے کار ہی تھا۔ دراز میں پڑے اس کے ٹوٹے پھوٹے موبائل کی طرح۔

اچانک ہی کسی خیال کے تحت اس نے دراز کھولی اور گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

وہ اسے یہیں چھوڑ گئی تھی۔ نیا موبائل تو اس نے ابھی کھول کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھی کچھ کم ضدی نہیں تھی۔

اس نے رحمہ کو کال کرنے کا سوچا مگر پھر اپنا یہ خیال رد کر دیا۔ وہ اس سے کیا بات کرتا جبکہ اسے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ بریرہ نے اسے کیا بتایا ہوگا۔ بریرہ کے اٹھائے اس قدم نے اسے عجیب ہی بے بسی سے دوچار کر دیا تھا۔

کافی دیر کی ذہنی کشمکش کے بعد وہ بریرہ کا فون اٹھا کر گھر سے نکل آیا تھا۔ شام اپنے پر پھیلا چکی تھی۔ مگر اسے زیادہ دور نہیں جانا تھا۔ پانچ منٹ کی واک کے بعد وہ فیروز کی دکان پر تھا۔

☆☆☆

"یہ جاگنا شب کو دن میں سونا
کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔"

رحمہ نے آتے کے ساتھ ہی کھڑکیوں کے پردے ہٹائے تھے۔

سورج کی روشنی براہ راست اس کی آنکھوں پر پڑی تو اس نے بے اختیار آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

"اٹھ بھی جاؤ، کتنا سوؤ گی۔ وہاں بھی اتنا ہی لیٹ اٹھتی تھیں کیا۔"

"کیا ٹائم ہو رہا ہے۔" اس نے روشنی کی طرف سے کروٹ بدلی۔

"دس بج رہے ہیں۔" بتاتے ہوئے رحمہ دھم سے اس کے قریب بیٹھی۔

"مجھے نیند نہیں آ رہی تھی رات کو، فجر کے بعد سوئی۔" اس نے اپنی سرخ متورم آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

"جانتی ہوں۔" رحمہ نے بغور اس کا تمتماتا چہرہ دیکھا۔ اسے آئے نجانے کتنے دن ہو گئے تھے مگر جب سے آئی تھی تب سے۔ رات کے کسی بھی پہر رحمہ کی آنکھ کھلتی تو بریرہ کو جاگتا ہوا ہی پاتی۔

"ناشتہ میرے ہاتھ کا کرو گی یا خود بناؤ گی۔"

"ناشتہ نہیں صرف چائے۔" اس نے بال سمیٹے۔

"دل نہیں چاہ رہا یا احتجاج نہیں کرو گی۔" رحمہ نے بظاہر سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

وہ ہنس پڑی۔ "میرے خیال میں دونوں باتیں ایک ہی ہیں۔ دل احتجاج نہیں چاہ رہا۔"

"بریرہ میری بات سنو۔ لوگوں کی باتوں کے خوف سے تم ایسے ٹاکسک رشتے میں نہیں رہ سکتیں۔ تمہارا ذہنی سکون اہم ہے ہر چیز سے زیادہ۔" رحمہ کا بس نہیں چل رہا تھا کیسے اس کی تکلیف خود پر لے لے۔ جب سے وہ آئی تھی، اس کی بھوک، پیاس، نیند، ہنسنا بولنا سب ختم ہو گیا تھا۔ اب رحمہ کو لگ رہا تھا، اس کا یہاں آنا بھی بے کار ہی رہا کیونکہ وہ ذہنی طور پر اب بھی وہیں تھی۔ ان ہی منفی اور تکلیف دہ سوچوں کے زیر اثر، لوگوں کی باتوں کا خوف الگ اسے قطرہ قطرہ گھلا رہا تھا۔

"اور جو لوگ اسے جانتے ہیں۔ اس کے گھر والے، خاندان والے، وہ کبھی میرا یقین نہیں کریں گے۔ وہ ان کے ساتھ ویسا بالکل نہیں رحمہ! جیسا وہ میرے ساتھ ہے۔" اس نے جیسے رحمہ کی بات سنی ہی نہیں تھی۔

"تمہیں لوگوں کے یقین کی پڑی ہے بریرہ؟ بھاڑ میں جائیں لوگ۔ تمہارے لوگ ہم ہیں۔ میں اور بابا۔ اور ہم تمہارے ساتھ ہیں چاہے تم جو بھی فیصلہ کرو۔"

بریرہ نے گھٹنوں میں سر دیتے ہوئے اس سے چہرہ چھپایا۔

دکھ اور تاسف سے اسے دیکھتے ہوئے رحمہ کے لبوں پر کوئی بات آ کر رکی۔

"بریرہ۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے اسے پکارا۔ "کیا۔ کیا تم ان سے پیار کرنے لگی ہو؟"

اس نے سر نہیں اٹھایا، نہ کوئی جواب دیا۔ مگر رحمہ نے اس کا وجود لرزتے محسوس کیا۔

وہ رو رہی تھی۔ رحمہ کو اپنا جواب مل گیا۔

☆☆☆

سمیر نے اسے کال کی تھی، وہ اسے معمول کی فون کال سمجھتا اگر وہ اس کی آواز سنتے ہی شروع نہ ہو جاتا۔

"او محبت کے بچے۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں۔" اس کا ہیلو سنتے ہی سمیر کی تیز برہم سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"کیا؟" وہ اسی وقت اپنے کمرے میں آیا تھا، لائٹس آن کرتے ہوئے بیڈ پر آ بیٹھا۔

"بریرہ ناراض ہو کر گئی ہے؟" سمیر نے سوال نہیں کیا تھا جیسے اسے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

وہ اچھل ہی پڑا۔ "تم سے یہ کس نے کہا؟"

"کیا بریرہ نے چچی کو فون کیا تھا"۔ وہ یہی سوچ سکتا تھا۔

مگر سمیر نے اگلے ہی جملے سے اس کی غلط فہمی دور کر دی۔ "یمی بھابھی نے فون کیا تھا امی کو۔"

"اففف۔ حد کرتی ہیں بھابھی بھی۔" لب بھینچے ہوئے وہ بے اختیار بھابھی پر جھلا گیا۔

"امی پریشان ہیں۔ میری اس دن تم سے بات نہ ہوئی ہوتی تو میں اس بات پر یقین بھی نہ

کرتا۔ مگر اس دن تمہارے تیور دیکھ کر ہی میں کھٹک گیا تھا۔ اس لیے اب امی کو کچھ بتانے کے بجائے میں نے سوچا۔ پہلے تم سے پوچھ لوں۔ وہ بھی شاید بات کریں تم سے۔ لیکن تم مجھے بتاؤ۔ مسئلہ کیا ہوا؟" وہ انتہائی سنجیدہ لہجے میں سوال کر رہا تھا۔

محب چند لمحے خاموش رہا۔ "یہ بات تمہیں اس سے پوچھنی چاہیے... ناراض ہو کر وہ گئی ہے۔" اس کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی تلخی اتری۔ وہ جاتے ہوئے اس کا سکھ چین اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

"ہاں تو کیوں گئی۔ کیوں ناراض ہوئی؟ تم نے کچھ تو کہا ہوگا۔" سمیر نے جس انداز میں یہ بات کی، سرتاپا اسے سلگا کر رکھ دیا۔

"اوہ... تو تم اس کا بھائی بن کر مجھ سے بات کر رہے ہو۔"

"کمال کرتے ہو تم۔ یہ بات تمہاری طرف سے سامنے آئی ہے، اس کی طرف سے خاموشی ہے۔ اور اس دن تم میرے سامنے اس بارے میں ڈسکس بھی کر چکے ہو، تو اب میں تم ہی سے پوچھوں گا نا یار۔" سمیر کو بھی اس کی بات بری لگ گئی۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا اور پھر سختی سے لب بھینچ لیے۔ نہیں۔ وہ مر کر بھی سمیر کو اصل وجہ نہیں بتا سکتا تھا۔

"محب۔" اس کی خاموشی پر سمیر نے اسے پکارا۔

"ہمم۔" اس نے ہنکارے کی صورت جواب دیا۔

"مجھے لگ رہا ہے، بریرہ نے ماموں کو کچھ نہیں بتایا۔ اگر ایسا ہے تو ابھی یہ بات صرف تم دونوں کے بیچ ہے۔ حل کروا سے۔ ورنہ ہم تو ہیں ہی۔ میں اور امی۔ جب کہو گے، تمہارے لیے بات کرنے جائیں گے۔" سمیر کا انداز ایسا تھا، گویا کہہ رہا ہو۔ تم اکیلے نہیں ہو۔ شاید یہ محب کے اس الزام کا اثر تھا۔

"تھینکس۔ پہلے کی بات اور تھی لیکن اب وہ میری بیوی ہے اور میرے خیال میں، میں یہ معاملہ خود سنبھال سکتا ہوں۔" اس نے جلتی آنکھیں مسلیں۔ اندر سلگتی تپش اب پلکوں تک آپہنچی تھی۔

"سچ میں سنبھال لو گے؟" وہ نجانے کیسی یقین دہانی چاہ رہا تھا۔

"ہاں۔ تم جانتے ہو، وہ میرے لیے کیا ہے۔" اس کا لہجہ پرسکون مگر اٹل تھا۔ "تو تمہیں مجھ پر یقین ہونا چاہیے کہ میں اپنے اور اس کے بیچ معاملات کبھی اس نہج پر نہیں پہنچاؤں گا کہ اسے ٹھیک کرنے کے لیے کسی تیسرے کو بیچ میں آنا پڑے۔"

"واہ میرے شیر۔ مجھے بس یہی سننا تھا۔ تو میں امی کو بول دوں۔ وہ پریشان نہ ہوں۔ انہیں فکر لگ گئی ہے۔ اس رشتے کو کرنے کے جتنے جتن انہوں نے کیے تھے اب کہہ رہی ہیں، انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی تم دونوں کے درمیان اس نوعیت کے جھگڑے ہونے لگیں گے۔"

"ان سے کہیں، فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔" وہ نرم لہجے میں بولا۔ اور پھر چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کال منقطع کر دی۔

اپنا فون رکھتے ہوئے اس کی نظر ساتھ پڑے بریرہ کے موبائل پر گئی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھایا۔ جب سے یہ ریپئر ہوا تھا، وہ اسے لاتعداد بار دیکھ چکا تھا... ہر ایک کونا۔ اور اسے کچھ نہیں ملا۔

نہ واٹس ایپ چیٹ، نہ فون میسجز، نہ کال ہسٹری۔ کچھ نہیں۔

وہی پہلی اور آخری کال تھی جو اس رات اس کی موجودگی میں آئی تھی۔ اور وہ دو میسجز جو اس نے تب نہیں دیکھے تھے مگر اب دیکھ لیے تھے اور ان میں کچھ خاص نہیں تھا۔

پہلے میسج میں۔ "اٹس می طٰہٰ۔"

اور دوسرے میں۔ "کال اٹھاؤ بریرہ۔"

ان پیغامات سے صاف ظاہر تھا کہ کال نہ اٹھانے پر طٰہٰ اپنا نام بتا رہا تھا، یہ سوچ کر کہ بریرہ کے پاس اس کا نمبر سیو نہیں۔

محبت یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ بریرہ نے سب ڈیلیٹ کیا ہوگا... کیونکہ جس وقت وہ کمرے میں آیا، بریرہ کو علم ہی نہیں تھا۔ کہ وہ آئے گا اور اس کا موبائل چیک کرے گا جو وہ اس طرح کی پیش بندی کرتی۔ اور نہ ہی بعد میں اسے یہ موقع ملا کیونکہ اسکرین ٹوٹ چکی تھی۔ اگر کوئی کال ریسیو تک نہیں ہو رہی تھی تو چیٹ ہسٹری یا کال ہسٹری ڈیلیٹ کیسے ہوتی۔

تو کیا وہ صرف ذرا سی رائی تھی جس کا اس نے پہاڑ بنا ڈالا؟ اور تھی بھی کس کی طرف سے۔ طٰہٰ کی طرف سے۔ بریرہ کی طرف سے نہیں۔

ایک تو پہلے ہی بریرہ کے اس طرح جانے سے اس کا ہر پل کانٹوں پر بسر ہو رہا تھا، اس پر دل و ضمیر کو کچوکے لگاتے مسلسل یہ سوال۔

اب صرف وہ چاہیے تھی۔

بریرہ۔

خاموشی کے شور میں، تنہائی کے بیچ،

ہر چیز سے بڑھ کر...

ہر دلیل سے بلند۔

☆☆☆

اس دن خالہ چلی آئیں، ساتھ ایک خوش خبری بھی لائی تھیں۔

رحمہ تو سنتے ہی پرجوش ہوئی۔

"سچ میں خالہ۔ کون ہے وہ لڑکی، کیا ہم اسے جانتے ہیں؟" ان کے پیروں کے پاس بیٹھتے ہوئے اس نے پرجوش لہجے میں پوچھا تھا۔

"مسعود کے ایک بہت دیرینہ دوست ہیں، ان کی بیٹی ہے۔ بہت ہی پیاری اور سلجھی ہوئی بچی ہے۔ سچ کہوں تو بہت دنوں بعد مجھے کسی لڑکی کو دیکھ کر ایسا پیار آیا۔" خالہ مسکراتے ہوئے تفصیل بتا رہی تھیں۔

بریرہ کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ "طٰہٰ کیا کہتا ہے؟"

ایک گہری سانس بھرتے ہوئے وہ ایک دم سنجیدہ ہوئیں۔ "وہ پس و پیش سے کام لے رہا ہے۔ اعتراض یہی ہے کہ اتنی جلدی شادی نہیں کرنی۔ مگر میں اور انتظار نہیں کر سکتی۔ فیصل کی بار سوچا تھا، بہو آئے گی تو گھر اس کے حوالے کر کے سکھ کا سانس لوں گی۔ وہ خود تو کیا آتی، فیصل کو ہی رخصت کرا کے لے گئی۔ طٰہٰ کے لیے کچھ اور سوچا تھا۔ خیر۔ نصیب کی بات۔ یہ لڑکی بھی اچھی ہے۔ میرا دل کہتا ہے۔ اور پھر اس بار میں نے امیدیں بھی کم کر لی ہیں۔ گھر کی کیا... صرف طٰہٰ کی ہی ذمہ داری اٹھا لے تو بڑی بات ہے۔"

"ان شاء اللہ یہ لڑکی ویسے ہی ہو گی جیسے آپ نے امید کی ہے۔ اگر آپ کا دل مطمئن ہے تو سمجھیں سب اچھا ہوگا۔" بریرہ نے انہیں تسلی دی۔

"چلو۔ اسی خوشی میں، میں چائے کے ساتھ کچھ میٹھا بنا کے لاتی ہوں۔" رحمہ چہکتے ہوئے اٹھی تھی۔

اس کے جاتے ہی خالہ نے اس کی طرف دیکھا۔ "تمہیں یہاں آئے کتنے دن ہوئے؟"

وہ چونکی۔ "ڈیڑھ ہفتہ۔ شاید۔" وہ واقعی دنوں کی گنتی بھول چکی تھی۔

"کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا ناں؟ ناراض ہو کے تو نہیں آئیں؟" وہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ ماند پڑتی رنگت، آنکھوں میں عجیب سا خالی پن۔

"نہیں خالہ۔ کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔" وہ لحہ بھر کو گھبرائی ضرور مگر لہجہ نارمل ہی رکھا۔ "کیا۔ کیا کسی نے کچھ کہا ہے؟" اس کے انداز میں جھجک اتر آئی۔

وہ ایک لمحے کو چپ رہیں پھر کہا۔ "عشرت کہہ رہی تھی، بریرہ شاید ناراض ہو کر آئی ہے۔" انہوں نے بڑی مامی کا نام لیا۔

"ان سے یہ بات کس نے کہی؟" اسے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔

"تم جانتی تو ہو، ایسی خبریں وہ خود سے بنا کے خاندان بھر میں نشر کر دیتی ہے۔ کہہ رہی تھی۔ دس دن پہلے فون کیا تھا تب بھی بریرہ یہیں تھی، اور اب ایک دن پہلے کیا، تب بھی۔ لوگ کان لگائے بیٹھے ہوتے

ہیں بس۔ ذرا سا موقع ملے اور وہ چٹخارے لے سکیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں خالہ۔ میں بس کچھ دن رہنا چاہتی تھی۔" اس نے خالہ کی آنکھوں میں نہیں دیکھا یہ بات کرتے ہوئے، مبادا وہ اس کی چوری پکڑ لیں۔

"مگر اتنے دن کیوں؟" انہوں نے حیرت سے سوال کیا۔ "تمہاری نئی نئی شادی ہوئی ہے بریرہ۔ اتنے دن یہاں رہو گی تو تمہارا سسرال میں دل کیسے لگے گا؟ پھر جتنے مختلف ماحول میں گئی ہو، تمہیں تو زیادہ کوشش کرنی ہو گی۔ اور اگر کوئی اور بات ہے، کوئی مسئلہ ہے تب بھی تم مجھے بتا سکتی ہو۔ میں تمہیں نصیحت کر سکتی ہوں جیسے تمہاری ماں کرتی۔ ویسے تو مجھے یقین ہے، تم اتنی سمجھ دار ہو کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بلکہ چاہے بڑی بھی بات ہو، اتنا بڑا نہیں بناؤ گی کہ اپنا گھر خراب کر لو۔" وہ کہہ رہی تھیں۔

وہ جس ذہنی اور جذباتی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر وہاں سے نکلی تھی، اس کے بعد تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اسے فون کرتی۔

مگر محب نے بھی اسے ایک فون تو کیا میسج تک نہیں کیا تھا۔

بھابھی نے البتہ فون کیا تھا ایک بار اور انہیں یہ بتانے میں اسے کوئی حرج محسوس نہیں ہوا کہ وہ محب سے جھگڑ کر آئی ہے۔ محب کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ اب اسے کوئی خوش فہمی تھی بھی نہیں۔

اب وہ اس کی جانب سے حتمی فیصلے کی منتظر تھی۔

کھیتوں کی سرسبز قطاریں، مٹی سے اٹھتی بھینی خوشبو، اور درختوں کے سائے — سب پیچھے رہ گئے تھے۔

اس کی گاڑی اب مرکزی شاہراہ پر تھی۔

اسی پل آسمان نے جیسے پلک جھپکی اور پہلی بوند ونڈ اسکرین پر پھسل گئی۔

محب نے سر ذرا سا جھکا کر ونڈ اسکرین کے پار آسمان کی طرف دیکھا۔

خاموش، ڈھکا ہوا، تھوڑا بوجھل... کچھ اس کے دل جیسا۔ اس نے ایکسیلیریٹر پر پیر رکھا، اور گاڑی نے رفتار پکڑ لی۔ ونڈ اسکرین پر بوندوں کی نرم موسیقی بجنے لگی تھی۔ ٹھہر ٹھہر کر، دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہوتی۔ یہ موسم، یہ راستہ... شاید اس لمحے سے بڑھ کر کچھ بھی رومانوی نہ ہوتا — اگر کوئی ہمسفر ہوتا۔

مگر وہ اکیلا تھا۔ اور اسی لیے، اس نے موسم کو محسوس کرنے کے بجائے، راستہ ناپنے پر دھیان دیا۔ وہ اس ادھیڑ بن میں بھی تھا کہ اسے دیکھ کر بریرہ کا ردعمل کیا ہو گا۔ کیا رحمہ اسے اس کے فون کے متعلق بتا چکی ہو گی۔

اس نے رحمہ کو فون کیا تھا اور رحمہ نے یہ کہہ کر اس کے منہ پر فون بند کر دیا۔

"کہ جب تک آپ اپنی آنکھوں سے شک کی پٹی نہیں اتاریں گے، اپنے الزامات واپس نہیں لیں گے اور میری بہن سے معافی نہیں مانگیں گے۔ میں آپ کی اس سے بات نہیں کرواؤں گی۔"

رحمہ کی یہ منطق اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

ویسے بھی یہ ایک سچائی اس کے تمام شکوک وشبہات، غلط فہمیوں اور بدگمانیوں پر بھاری پڑ گئی تھی کہ وہ بریرہ کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

☆☆☆

وہ گہری نیند میں تھی جب کسی غیر مرئی اضطراب نے الارم کی طرح اس کے خوابیدہ حواس کو جھنجھوڑ دیا۔

گردن اور رخسار پر کسی آشنا لمس کی مدھم سی سرسراہٹ نے اس کے جسم وجاں میں جیسے بجلی دوڑا دی، اور وہ تڑپ کر آنکھیں کھولنے پر مجبور ہوئی۔

سامنے ایک سایہ ایستادہ تھا—

کمرے میں پردوں اور بادلوں کی اوٹ سے نیم اندھیرا چھایا ہوا تھا، اور اس کی پشت کھڑکی کی طرف تھی۔

اس کے باوجود بریرہ کو اسے پہچاننے میں ایک

لمحہ بھی نہیں لگا۔

اور وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتے ہوئے خود کو یقین دلا رہی تھی کہ وہ خواب ہے حقیقت نہیں۔

مگر اگلے ہی پل اس کی بھاری آواز نے اسے اس غلط فہمی سے باہر کھینچ نکالا، مکمل حقیقت کی دنیا میں۔

"میری راتوں کی نیندیں حرام ہیں، اور تم دوپہریں بھی سو کر گزار رہی ہو۔"

وہ لائٹس آن کر کے اس کے سامنے آ بیٹھا۔

"گھر چلیں؟" وہ کتنے دنوں بعد اسے دیکھ رہا تھا کہ اب آنکھیں اس کے چہرے سے ہٹنے سے انکاری ہو گئی تھیں۔

کچی نیند سے آنکھوں میں بکھرے ڈورے اور لو دیتا چہرہ۔ وہ خالی اور کھوئی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

نیند پوری طرح کافور نہیں ہوئی تھی۔

"تم ابھی تک نیند میں ہو کیا؟" محبت نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھاما۔ "جاگ جاؤ۔"

"جاگ گئی ہوں۔" اس نے پلکیں جھپکتے ہوئے اس کے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی۔

"تو بتاؤ... میں نے کیا کہا؟" محبت نے اس کی کٹورہ آنکھوں میں دیکھا۔

"میں نہیں جاؤں گی۔" وہ چیختے ہوئے لہجے میں بول اٹھی۔

اس نے بے اختیار ایک گہری سانس لی۔ وہ پہلے سے جانتا تھا کہ یہ آسان نہیں ہوگا۔ "جانا تو پڑے گا۔"

"کیوں۔ آپ کا شک دور ہو گیا؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے نا کہ میں یہاں آ کے طٰہٰ سے ملاقاتیں کر رہی ہوں۔" استہزائیہ انداز میں کہتی اس کے لہجے میں عجیب سی کاٹ تھی۔

"بکواس مت کرو۔" وہ ناگواری سے اسے ٹوک گیا۔

"یہ بکواس نہیں... وہی خیالات ہیں، جو میرے یہاں آنے پر شاید آپ کے دل میں گونجتے رہے ہے، میں تو بس انہیں آواز دے رہی ہوں۔" وہ آج خوفزدہ نہیں برہم تھی بے خوف اور تلخ۔

"میرے ایسے خیالات کبھی نہیں رہے۔" اس نے سر ہلایا۔ "میں جیلس اور ان سیکیور تھا مگر میں نے اس طرح سے کبھی نہیں سوچا۔"

"آپ ان سیکیور کیوں تھے؟ میں آپ کی بیوی تھی، گرل فرینڈ نہیں۔" حیرانی سے پوچھتے ہوئے اس کی آواز نم ہوئی۔

وہ چند لمحے تذبذب میں رہا پھر بولا۔

"تمہیں ایسے سمجھ میں نہیں آئے گی، شروع سے بتاتا ہوں۔

تمہاری طرف سے یہ شادی بھلے ہی ارینج میرج ہو، میری طرف سے لو میرج تھی۔"

بریرہ ساکت ہوئی۔ آنکھوں میں بے یقینی کی لہریں موجزن ہوئیں۔

"میں نے ہی چچی سے کہا تھا، اپنا مقدمہ لڑنے کو۔ میں نے ہی ان سے کہا تھا، چاہے جیسے بھی ہو، وہ یہ رشتہ کروائیں۔ چاہو تو ان سے تصدیق کر سکتی ہو۔" محبت نے اس کی ہکا بکا صورت پر نظر ڈالی۔

"شادی کی رات تمہاری باتیں سن کر میرے دل میں کوئی شک نہیں آیا تھا۔ میرے حساب سے بھی تب وہ کمرا تمہارے شایانِ شان نہیں تھا۔ اس وقت تک مجھے یہی لگ رہا تھا کہ تمہارا غصہ اسی بات پر ہے۔ مگر پھر جب میں طٰہٰ سے ملا اور اس نے وہ بات کی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں الٹی کھوپڑی کا ہو سکتا ہوں۔ ہاں تم اسے میرا احساس کمتری بھی کہہ سکتی ہو، میری ان سیکیورٹی۔ کہ وہ تمہارے لیے ہر لحاظ سے موزوں تھا، اس کے باوجود تمہاری شادی مجھ سے ہوئی تو یقیناً اس شادی میں تمہاری مرضی شامل نہیں رہی ہوگی۔ اور اس کے بعد میں تمہاری ہر بات، ہر انداز کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے لگا۔"

"شک والے زاویے سے۔" بریرہ دھیرے سے بڑبڑائی۔ وہ حیرت کے ابتدائی جھٹکے سے سنبھل گئی تھی۔

"سوچو تو میں اس میں اتنا قصوروار بھی نہیں۔ وہ تمہارا کزن تھا۔ تم ساتھ ساتھ پلے بڑھے، تمہارے بیچ

دوستی تھی۔ اور میں ٹھہرا بالکل باہر کا بندہ، سیدھا سادہ دیہاتی پینڈو۔"

بریرہ کی رنگت متغیر ہوئی اس بات پر۔

اس نے بات جاری رکھی۔ "پھر چچی نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ تمہاری خالہ تمہیں اپنی بہو بنانا چاہتی تھیں۔ مجھے تو یہی لگا کہ میں تم دونوں کے بیچ میں آ گیا ہوں۔"

"تو آپ میری بات کا یقین کر سکتے تھے۔ میں کتنا کہتی رہی، آپ نے میری ایک نہیں سنی۔ ہم اتنے دقیانوسی نہیں ہیں۔ اور نہ ہی میں اتنی مجبور اور لاچار قسم کی لڑکی۔ کہ پسند کسی اور کو کرتی اور شادی آپ سے کر لیتی۔ بابا نے مجھے بٹھا کر پوچھا تھا اور میں نے خود اس رشتے کے لیے اپنی رضامندی دی تھی۔" اس کے لہجے میں تلخی گھلی۔

"تب بدگمانی کی دھند اتنی گہری تھی کہ مجھے سامنے کی سچائی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔" وہ دھیمے سے بولا۔

"اب کیسے دکھائی دی؟" بریرہ نے بغور اس کا وجیہہ چہرہ دیکھا۔

"اب تمہاری دوری نے سارے کس بل نکال دیے۔ ساری غیر ضروری چیزیں نکال پھینکیں۔ اب کوئی دوسرا خیال نہیں دل و دماغ میں، سوائے تمہارے۔" انگلیوں کی پشت سے اس کے رخسار سہلاتا وہ بوجھل لہجے میں بولا۔

بریرہ کی آنکھیں جھک گئیں۔

"تم کیوں چلی آئیں۔ اس طرح اچانک۔ میں مانتا ہوں میرا رویہ غلط تھا مگر۔"

اس نے بات اُدھوری چھوڑ دی۔

"ہاں آپ کا رویہ غلط تھا۔ بہت غلط۔ میں آپ کا شک، آپ کے طعنے برداشت کر رہی تھی۔ مگر اس رات آپ نے جو بات کی اس نے میرا دل بھی توڑا اور ہمت بھی۔ میں سمجھ گئی۔ کچھ بھی کر لوں، آپ کو اپنا یقین نہیں دلا پاؤں گی۔ اس وقت میری ذہنی حالت کیا تھی، چاہوں بھی تو آپ کو نہیں بتا سکتی۔"

اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ لہجہ بھرا گیا۔

"آئم سوری۔ آئم سوری۔" محب نے بے اختیار اس کے ہاتھ اپنے لبوں سے لگائے۔ "مجھے ایک موقع دو۔ تمہیں دی گئی ہر تکلیف کا ازالہ کر دوں گا، میرا وعدہ ہے۔ تمہیں اتنی محبت دوں گا کہ تمہیں بھی خود سے محبت کرنے پر مجبور کر دوں گا۔ میں پاگل ہوں بریرہ۔ تم ابھی یہ نہیں جانتیں۔" اس کے آنسو اپنی پوروں میں جذب کرتے اس کی سرمئی آنکھوں میں کئی جذبے دہکے تھے۔

عشق، تڑپ، التجا، ندامت۔

وہ چونک سی گئی اس کی بات پر۔

"میں تو اتنی ڈھیٹ ہوں۔ آپ کے اتنا ذلیل کرنے کے باوجود آپ سے محبت کر بیٹھی۔ جب محبت دیں گے تو پتا نہیں کیا حال ہوگا۔" ذہن میں ابھری یہ سوچ الفاظ میں نہیں ڈھال پائی تھی۔

"بولو۔ چلو گی میرے ساتھ؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا سوال کر رہا تھا۔

وہ خاموشی سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔

ان نیم شب کے دھند میں لپٹی گہری آنکھوں میں وہ اپنے لیے محبت کا ایک خاموش، بے کنار سمندر دیکھ رہی تھی۔

اب کیسے وہ انکار کرتی؟

کیسے اتنی بڑی نعمت کو ٹھکراتی؟

اس کا سر، لاشعوری طور پر، اثبات میں ہل گیا۔

"چلو۔ ابھی رحمہ سے حساب کرنا باقی ہے۔" وہ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اٹھا۔

"کیوں؟"

"میری اپنی بیوی سے بات نہیں کروا رہی تھی، کہہ رہی تھی۔ پہلے معافی مانگو۔" محب کے لہجے میں شرارت تھی۔

"سچ میں؟" اس کی ہنسی کھنکی تھی۔

اسی پل باہر کہیں بارش برسنے لگی۔ جیسے آسمان بھی پاکیزگی سے بھیگی اس صبح پر اپنی مہر لگا رہا ہو۔

☆☆

ارم ہانی

اجنبی سا دیوانہ

(دوسرا حصہ)

"یہ دیکھیں میرے نکاح کا جوتا۔ بالکل سوٹ سے میچ ہو رہا ہے۔" خوشی خوشی اس نے ایک ہینڈ بیگ سے ڈبہ نکال کر امی جان کے سامنے کیا۔ وہ دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

"اللہ پہننا نصیب کرے۔" وہ اس کی ہر چیز پہ اسے یہی دعا دیتیں۔

"اب میری شاپنگ اینڈ ہو گئی ہے لیکن آپ نے ابھی تک اپنے لیے کچھ نہیں لیا۔" وہ منہ پھلائے انہیں دیکھ کر کہہ رہی تھی۔

"تمہاری تیاری ہو گئی تو سمجھو، میری بھی ہو گئی ویسے بھی میرے پاس کئی جوڑے پڑے ہیں جو ابھی تک پہنے نہیں گئے۔ ان میں سے کوئی بھی پہن لوں گی۔"

"آپ خوش ہیں نا امی جان؟" ان کے پیروں کے پاس فرشی کشن رکھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ امی جان نے اس کا سر تھپکا اور اس کی خوشیوں کے دائمی ہونے کی دعا کی۔

ان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو خاتون بڑے کروفر سے رشتہ لے کر آئی تھیں۔ ناک بھوں چڑھاتے انہوں نے ان کے خاندانی بیک گراؤنڈ کے بارے میں پوچھا تھا اور بنا کچھ کھائے یے وہاں سے چلی بھی گئی تھیں، وہ مان جائیں گی۔ لیکن اللہ نے ہی شاید واسع اور بیا کا ساتھ لکھا تھا جو اب نکاح ہونے جا رہا تھا۔

بیا کو ساتھ لے جا کر واسع نے خود ساری شاپنگ کروائی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے جو چاہے خرید لے۔

"امی جان۔" دروازہ بجا کر مزمل سامنے چہرہ موڑے کھڑا تھا۔ بیا ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی اور صوفے پہ رکھا دوپٹہ اپنے کندھے پہ اچھی طرح پھیلا لیا۔ اسے اس کی یہی بات بہت اچھی لگتی تھی کہ وہ کبھی گھر کی دہلیز پہ اپنی موجودگی کا احساس دلائے بغیر اندر داخل نہیں ہوتا تھا تاکہ گھر کی خواتین جس بھی حلیے میں ہیں، اسے درست کر لیں۔ وہ ان کے پردے کا بہت خیال رکھتا تھا۔ امی جان تو عموماً گھر میں بھی سر پہ دوپٹہ رکھتی تھیں لیکن وہ گھر میں داخل ہوتے ہی دوپٹہ صوفے پہ اچھالتی اور سکون سے گھومتی رہتی۔

"آجاؤ مزمل۔" امی جان نے کہا تو وہ اندر داخل ہوا۔ انہیں سلام کرتے اس نے بیا کو مکمل نظر انداز کیا جو اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

"کیٹرنگ والوں سے بات ہو گئی ہے۔ ان ہی کے پاس ڈیکوریشن والا بھی تھا جو ایک دن پہلے آ کر سارا ڈیکور کر جائے گا۔ جو بھی آپ نے آرڈر کیا تھا۔ وہ سب ہو جائے گا۔ اور کچھ؟"

"یہ سب کام تم نے ہی دیکھنا ہے مزمل! جو تمہیں ٹھیک لگے، وہ تم کر لو۔ میں تو اب تمام معاملات نہیں سنبھال سکتی۔ ہمت بھی نہیں رہی کہ سب کچھ سنبھال سکوں۔" امی جان اس پہ آنکھیں بند کر کے بھروسا کرتی تھیں اور وہ اس بھروسے کی لاج ہمیشہ رکھتا تھا۔

"آپ بےفکر رہیں۔ سب کچھ ہو جائے گا اور ویسا ہی ہوگا جو آپ چاہتی ہیں۔" وہ تابع داری سے کہہ رہا تھا۔

"اور یہ موصوف کیا پہن رہے ہیں میرے نکاح پہ؟" بیا نے کچھ خفا خفا سے انداز سے اسے دیکھا اور امی جان سے مخاطب ہوئی۔ امی جان نے اس کی طرف دیکھا کہ وہ جواب دے تو وہ نظریں چرا گیا۔ "میرا کیا ہے، کچھ بھی پہن لوں گا امی جان۔"

"کیوں کچھ بھی پہن لوں گا۔ میرا نکاح ہے اور تم کچھ بھی پہن لو گے؟" بیا خفگی سے کہتے ہوئے اس سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتی تھی۔

"نکاح آپ کا ہے، میرا نہیں کہ یہ اہم ہو کہ میں کیا پہن رہا ہوں۔" وہ جب سے جوانی کی دہلیز پہ پہنچے تھے، مزمل اسے آپ ہی کہہ کر بلاتا تھا۔ بیا اسے کتنی بار منع کر چکی تھی لیکن وہ باز نہیں آتا تھا۔

"اچھا تو میرا نکاح تمہارے لیے اہم نہیں ہے کہ اس پہ کچھ خاص پہنا جائے۔ یعنی وہ ایک عام سا دن ہے جس پہ کوئی بھی روٹین کے کپڑے چل جائیں گے۔"

مزمل نے اسے ایک نظر دیکھا اور نظریں چرا لیں۔ وہ کم ہی اس سے نظریں ملا کر بات کرتا تھا۔ حالانکہ بیا اس سے بہت بے تکلف تھی۔ بچپن میں وہ دونوں ساتھ کھیلے تھے، بہت دوستی تھی دونوں کے درمیان لیکن جوانی کی دہلیز پار کرتے ہی وہ خود بخود ہی محتاط ہو گیا تھا۔ اپنی حد میں رہ کر اس سے بات کرنے لگا تھا۔ خواہ مخواہ بے تکلف ہونے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔

"جسے دیکھو، ایسے ہی جواب دے رہا ہے کہ کچھ بھی پہن لوں گا۔ امی جان بھی کچھ بھی پہن لیں گی۔ مزمل صاحب بھی کچھ بھی پہن لیں گے۔ لگتا ہے کوئی خوشی نہیں ہے کسی کو میرے نکاح کی۔" وہ مصنوعی خفگی دکھا رہی تھی۔ وہ خاموش ہی رہا۔ امی جان مسکرانے لگیں۔

"اللہ ساتھ خیریت کے تمہاری رخصتی کا دن لائے تو سب تیار بھی ہوں گے اور دھوم دھڑکا بھی کریں گے۔ ابھی تو نکاح کی تقریب سادگی سے ہو



رہی ہے۔ تم تیار ہو گی تو تمہیں دیکھ کر ہم خوش ہو جائیں گے۔'' امی جان کی بات پہ وہ کچھ کچھ شرما سی گئی۔ مزمل نے اسے ذرا کی ذرا دیکھا اور نظریں پھیر لیں۔ وہ اس کی خوشیوں کو اپنی نظر لگ جانے سے ڈرتا تھا۔

''امی جان! میں جاؤں؟'' امی جان نے سر ہلا دیا تو وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

''یہ کچھ زیادہ ہی خاموش نہیں ہو گیا۔ پہلے تو کچھ بول لیتا تھا اب تو کچھ عرصے سے بالکل ہی برائے نام بات کرتا ہے۔'' اس کے جاتے ہی بیا نے تبصرہ کیا۔

''جاب کی وجہ سے کچھ پریشان ہے۔ اچھی خاصی وہ کال سینٹر کی جاب تھی۔ چھوڑ کر یہ ڈیجیٹل مارکیٹنگ کا کام سیکھنے لگ گیا۔ اب نوکری پھر سے مل نہیں رہی۔''

''بہت انٹیلی جنٹ ہے امی جان! بھلے پڑھائی میں اس کا دل نہیں لگا لیکن اس کی کمپیوٹر میں اسکلز بہت زبردست ہیں۔ دیکھیے گا کتنی ترقی کرتا ہے۔ اور ڈیجیٹل مارکیٹنگ میں تو وہ فری لانسنگ کے طور پہ بھی کام کر سکتا ہے۔ مل جائے گا کام بھی۔ وقت لگتا ہے اور ابھی اس کا وقت نہیں ہے۔''

وہ ہمیشہ مزمل کی ذہانت سے متاثر کچھ نا کچھ ایسا کہتی ہی رہتی تھی۔ امی جان کو اس کی پڑھائی ادھوری چھوڑ دینے کا قلق تھا لیکن بیا انہیں سمجھاتی کہ وہ پڑھائی نہ کر کے بھی بہت آگے جائے گا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا دماغ ٹیکنالوجی میں کتنا چلتا ہے۔ گھڑے کھڑے موبائل، لیپ ٹاپ ٹھیک کر دیتا تھا۔ بنا کسی کورس کے بھی بہت اچھی ویڈیو ایڈیٹنگ کر لیا کرتا تھا۔ بیا تو جھٹ سے متاثر ہو جاتی تھی۔ اسی کے حوصلہ دلانے پہ اس نے ڈیجیٹل مارکیٹنگ کا کام سیکھا تھا۔

''چلو، اپنی شاپنگ کا سامان اٹھاؤ اور اندر کمرے میں رکھو اور ہاں، یہ واسع سے اب ملنا جلنا بند ہے۔ شاپنگ مکمل ہو گئی تو رابطہ ختم۔''

وہ ہنستے ہوئے سامان سمیٹ رہی تھی۔ امی جان تو اکٹھے شاپنگ کے بھی خلاف تھیں اگر واسع کی ممی ساتھ نہ جا رہی ہوتیں تو وہ کبھی اجازت نہ دیتیں۔

''اور بہتر ہو گا کہ موبائل پہ بھی کم ہی بات کرو اب جب نکاح ہو جائے گا تو ہی بات کرنا۔'' وہ کمرے میں جا رہی تھی جب امی جان نے پیچھے سے کہا۔

''جی امی! آج کے بعد بالکل بند۔'' وہ اپنے دل کی ہر بات بلا دھڑک ان سے کہنے کی عادی تھی۔ وہ اس کی بہترین دوست تھیں۔

☆☆☆

واسع اور وہ یونیورسٹی فیلوز تھے۔ پہلے سمسٹر میں دونوں کے درمیان ہیلو ہائے تک نہیں تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ کلاس کے ٹاپرز میں سے تھا۔ خاص طور پہ میتھس میں اس کا دماغ بہت چلتا تھا۔ دوسرے سمسٹر میں جب پروفیسر احمد نے انہیں ایک اسائنمنٹ دیا تو ساتھ میں گروپس بھی خود ہی بنا دیے جس میں واسع اور بیا گروپ پارٹنر تھے۔ اس اسائنمنٹ پہ انہیں مل کر کام کرنا تھا۔ کلاس کے بعد واسع خود اس کے پاس آیا تھا۔ وہ اپنی دوستوں کے ساتھ ہی بیٹھی برگر اڑا رہی تھی جب واسع عین اس کے سر پہ پہنچ کر کھنکھارا تھا۔

''مس ثوبیہ۔ ہمیں ساتھ میں اسائنمنٹ کرنا ہے تو کیوں نہ کچھ ڈسکشن کر لیں۔ وقت کم ہے۔''

بیا کا چلتا منہ رکا اور وہ ہونقوں کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی پیچھے بیٹھی دوستیں کھی کھی کرنے لگیں۔ پڑھائی میں ثوبیہ کی دلچسپی کتنی تھی وہ بخوبی جانتی تھیں اور واسع پڑھائی کو لے کر کتنا سنجیدہ تھا یہ بھی انہیں پتا تھا۔

''میں یہ کھا لوں پھر آتی ہوں۔'' اس نے آرام سے کہا۔ واسع نے ناگواری سے اس کے برگر کو دیکھا اور پھر گھڑی دیکھی۔ انگلیوں سے پانچ منٹ کا اشارہ کرتے سامنے والی بینچ پہ بیٹھ گیا۔

"کیا مصیبت ہے یار! یہ کیا بندہ میرے ساتھ کر دیا سر احمد نے۔ میں تو مارے باندھے پڑھتی ہوں اور اس کا پڑھائی میں جو حال ہے، وہ سب جانتے ہیں۔" وہ جلدی جلدی اب برگر کھا رہی تھی۔

"اب تو وہ تمہیں ٹاپ کروا کر ہی دم لے گا۔ آخر اس کے اپنی جی پی اے کا بھی تو معاملہ ہے۔" پانچ منٹ سے پہلے وہ اس کے پاس پہنچ چکی تھی جو سامنے کتابیں کھولے بیٹھا تھا۔

"پلیز بیٹھیں اور یہ دیکھیں۔ میں نے لائبریری سے کچھ بکس ایشو کروائی ہیں۔" اتنی موٹی کتابیں دیکھ کر بیا کا سر چکرانے لگا۔

"اچھا آپ نے کروا بھی لیں۔ ویری فاسٹ۔" وہ کھسیاتے ہوئے کتابیں دیکھ رہی تھی۔ کتابوں کا حجم ہی اسے ڈرا رہا تھا۔

"جب آپ کینٹین برگر لینے جا رہی تھیں تو میں لائبریری سے بکس ایشو کروا رہا تھا۔" اس نے جتایا۔

"کھانا پینا کوئی ایسی بری بات تو نہیں ہے جو آپ میرے کھانے کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔" بیا نے برا سا منہ بنایا۔

"میں نے کب کہا کہ یہ بری بات ہے۔ لیکن ہم یہاں پڑھائی کرنے آئے ہیں۔ دوستوں سے گپیں اور کینٹین میں وقت برباد کرنے نہیں۔ سو پڑھائی پہ فوکس کیا جائے تو بہتر ہے۔"

اب وہ کتابیں سامنے کھولے اہم نکات ڈسکس کر رہا تھا جو وہ سر ہلاتے غائب دماغی سے سن رہی تھی۔ اس اسائمنٹ کے ٹاپک کے سوا اسے اس بارے میں کوئی معلومات نہیں تھیں۔ ایف ایس سی میں وہ اسی ٹاپک سے متعلق چیپٹر چھوڑ چکی تھی کیونکہ اسے یہ کبھی سمجھ میں ہی نہیں آسکا تھا۔ سو سر ہلانے کے علاوہ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

"اب یہ کتاب آپ لے کر جا رہی ہیں اور اس میں سے ان دو چیپٹرز کو ڈیٹیل سے پڑھ کر کل اسائمنٹ کے فرسٹ فائیو کوئسچن سالو کر کے لائیے گا

میں اس بک سے دو چیپٹرز پڑھ کر باقی سوالوں پہ کام کروں گا۔ پھر ہم دونوں ان دونوں نوٹس کو اکٹھا کریں گے۔" بیا نے لاچاری سے سر ہلایا۔
"کوئی سوال؟" اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ بیا نے تھوک نگلا۔
"پیرابولا اور ہائپر بولا میں فرق کیا ہوتا ہے؟"
"واٹ؟" واسع نے شاکڈ سا ہو کر اسے دیکھا۔
"آپ کو اتنا بیسک نہیں پتا؟" بیا نے جلدی سے سر نفی میں ہلایا۔
"تو آپ میتھس میں کیا کر رہی ہیں؟"
"پڑھ رہی ہوں اور کیا کر رہی ہوں؟ اب سارا میتھس پیرابولا اور ہائپر بولا تو نہیں ہے۔ اور بھی بہت کچھ ہے میتھس میں پڑھنے کے لیے۔ ایف ایس سی میں بھی یہ چیپٹر میرے سر سے گزر گیا تھا اور میں نے چوائس پہ چھوڑ دیا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ یہاں اسی ٹاپک پہ پورا اسائنمنٹ مل جائے گا۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔
واسع نے گہری سانس لی۔ اسے اسائنمنٹ ساری خود بنانے میں کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن سر نے ان سے اسی اسائنمنٹ کا وائیوا بھی تو لینا تھا۔ وہ تو نکل جاتا۔ پھنس تو بیا جاتی۔ اور جب وہ پھنس جاتی تو لازمی بات تھی کہ بطور گروپ ان کے مارکس کم آتے جو وہ نہیں چاہتا تھا۔
"اسائنمنٹ میں سولو کر لوں گا۔ لیکن پھر آپ کو مجھ سے یہ سارے کانسیپٹ سمجھنا ہوں گے۔" بیا نے برا سا منہ بنایا۔
"وائیوا کے لیے ضروری ہے مس ثوبیہ کہ آپ کے کانسیپٹ کلیئر ہوں۔" ہونٹ لٹکا کر اس نے واسع کو دیکھا۔ اسے سمجھائے بنا وہ سکون سے بیٹھنے والا نہیں تھا۔
"دونوں بکس میں لے کر جا رہا ہوں۔ ان شاء اللہ اسائنمنٹ آپ کے سامنے ہوگی۔ پھر بیٹھ کر ڈسکس کریں گے۔"

بیا نے جان چھوٹنے پہ گہری سانس لی۔ کل کی تو کل دیکھی جائے گی۔ ابھی تو وہ واپس گروپ میں جا کر اپنی چاٹ کی پلیٹ انجوائے کرے جو وہ جلدی میں روما کو دے کر آئی تھی کہ میں ابھی جا کر آتی ہوں۔

☆☆☆

اگلے دن وہ پوری اسائنمنٹ ہاتھ سے لکھ کر لایا تھا اور سر احمد کی کلاس کے بعد وہ ہال سے نکلتے ہی سیدھا اس کی طرف آیا تھا۔
"مس ثوبیہ! چلیں؟" بیا نے بے چارگی سے اپنے گروپ کو دیکھا جو بہ مشکل ہنسی کنٹرول کیے کھڑا تھا۔ اسے سخت بھوک لگی تھی لیکن اس وقت وہ یہ کہنے کی پوزیشن میں بالکل نہیں تھی کہ میں کچھ کھا کر آتی ہوں۔ اس نے سر ہلایا اور چپ چاپ اس کے پیچھے چل دی۔
دونوں لائبریری کے سامنے والے گراؤنڈ کی سیڑھیوں پہ جا کر بیٹھے تھے۔ اس حصے میں پڑھنے والوں کا ہی رش ہوتا تھا۔ اسی لیے خاموشی ہوتی تھی۔
اسائنمنٹ بیا کے سامنے تھی اور آنکھیں اس کی پھٹی ہوئی تھیں۔ اتنی لمبی اسائنمنٹ وہ ایک رات میں مکمل کر لایا تھا۔
"ساری رات آپ یہی کرتے رہے ہیں؟" اسائنمنٹ کو سرسری سا دیکھ کر اس نے پوچھا۔
"جی۔ صبح تین بجے سویا ہوں۔" بیا نے گہرا سانس لیا۔
"تھینکس۔ آپ نے تو میرے حصے کا کام بھی کر دیا۔" وہ اب کچھ شرمندہ ہوئی۔
"اب آپ یہ سب سمجھ لیں۔ یہ بہت ضروری ہے اگر ہم وائیوا میں فل مارکس چاہتے ہیں تو کیونکہ وہ جسٹ میں نے نہیں دینا۔"
بیا نے سر ہلایا۔ کتنی دیر وہ اسے بٹھا کر بالکل بنیادی معلومات سمجھاتا رہا۔ پھر مشکل سوالات کو حل کر کر کے اسے دکھایا۔ پیٹ میں چوہے دوڑنے کی وجہ سے وہ بڑی مشکل سے اپنی توجہ مرکوز کر پا رہی تھی

لیکن سمجھنا ضروری تھا۔
"آپ سمجھ رہی ہیں؟"
"تھوڑی دیر بریک لے لیں۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔" اسے لگا تھا کہ اب وہ گری کہ گری۔
"کیوں روزے نہیں رکھتیں آپ جو بھوک برداشت نہیں کر سکتیں؟" اس نے اسے باقاعدہ گھورا۔
"روزے میں صبر آجاتا ہے۔ ابھی تو روزہ نہیں ہے نا۔" اتنی مسکین صورت پہ واسع کو ہنسی آنے لگی لیکن اس نے کنٹرول کیا۔
"سمجھیں روزہ ہی ہے، اور صبر کریں۔" بیا کا منہ مزید لٹک گیا۔ وہ کتنی دیر اسے سمجھاتا رہا تھا لیکن اس کا سر درد کرنے لگ گیا تھا۔
"آج کے لیے اتنا کافی ہے۔ باقی بعد میں کرتے ہیں۔" اگلی کلاس کا ٹائم ہوا تو اس نے اسے جانے دیا۔ خود وہ سیدھا لیکچر لینے جا رہا تھا جبکہ بیا کا رخ کینٹین کی جانب تھا۔ اسے کینٹین کی طرف جاتا دیکھ کر واسع نے سر ہلایا۔
"لگتا ہے بس کھانے کے لیے ہی یونی آتی ہے۔"

☆☆☆

اسائنمنٹ جمع ہو چکی تھی۔ اب وہ دونوں وائیوا کی تیاری کر رہے تھے۔ کلاس ختم ہوتے ہی وہ اسے اپنے ساتھ بٹھا کر سارا کچھ سمجھاتا۔ اسے سوالات حل کرنے کے لیے بھی دیتا جو اس سے حل نہیں ہوتے۔ اتنا سمجھانے اور سر کھپانے پہ بھی وہ بنیادی سوال نہیں حل کر پا رہی تھی۔ کب تک وہ صبر کرتا، ایک دن پیمانہ لبریز ہو ہی گیا۔
"کیا کھوتے کا دماغ ہے تمہارا، جو کوئی بات سمجھ میں ہی نہیں آتی یا دماغ میں بھوسہ بھرا ہے؟ میتھس پڑھنے آ گئی ہو اور میتھس کی الف بے ہی نہیں آتی۔"
مسلسل ایک ہی سوال تیسری بار غلط ہونے پہ واسع نے کتابیں وہیں پٹخیں اور پھٹ پڑا۔ بیا کی آنکھیں یکدم بھر آئیں اور پھر اس نے پھپک کر رونا شروع کر دیا۔
واسع لب بھینچے دور گراؤنڈ میں دیکھنے لگا۔ ارد گرد کے چند اسٹوڈنٹس نے دونوں کو دلچسپی سے دیکھا اور پھر خود میں مگن ہو گئے۔ واسع کتنی دیر خاموشی سے دور دیکھتا رہا۔ بیا روتی رہی۔ اس کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں اور واسع کے پچھتاوے میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اسے اتنی بری طرح پیش نہیں آنا چاہیے تھا۔ اتنے سخت جملے اس کے منہ سے نجانے کیسے پھسل گئے تھے۔ ہر کسی کا حساب اس جتنا اچھا ہو، یہ ضروری تو نہیں تھا۔ لڑکیاں تو ہوتی بھی حساب میں کمزور ہیں۔ اسے کچھ نرمی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔
"آئی ایم سوری مس توبہ۔" اسے بالآخر کہنا پڑا اب بیا کی سسکیاں دم توڑ چکی تھیں۔ اس نے چہرہ گھٹنوں سے اٹھایا جو رونے کی وجہ سے سرخ پڑ رہا تھا۔ بیگ سے ٹشو نکال کر چہرہ پونچھا۔ واسع کا دل کیا خود کو رکھ کر ایک لگا دے۔ کیا کر دیا تھا اس نے۔؟ کچھ کنٹرول کر لیتا۔
"آپ کو کس نے حق دیا کہ آپ مجھ سے ایسے بات کریں؟" بیا نے ناک پونچھی۔
"مجھے سچ میں یہ حق نہیں تھا۔" وہ نظریں جھکا گیا۔ اس کا متورم چہرہ، سرخ آنکھیں، ناک اسے بے حد شرمندہ کر رہی تھیں۔
"کھوتے کا دماغ نہیں ہے میرا واسع عبداللہ اور نہ دماغ میں بھوسہ بھرا ہے۔ لیکن ہر چیز ہر ایک کی سمجھ میں آ جائے یہ ضروری نہیں ہوتا۔ میتھس مجھے ایک حد تک پسند ہے لیکن میتھس میں جو کچھ ہوگا، وہ سب مجھے فر فر آ جائے، یہ کہاں لکھا ہے۔؟ یہ سبجیکٹ رکھنا میری مجبوری تھی کیونکہ یہاں اس یونیورسٹی میں بی ایس کا جو کامبی نیشن تھا اس میں میتھس رکھنا لازمی تھا۔ دوسرا آپشن آرٹس تھا جو میں رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اب میرا قصور یہ ہے کہ میں اس اسائنمنٹ میں آپ کے ساتھ پھنس گئی ہوں جس کی مجھے سرے سے کچھ

میں نہیں آسکی۔ آپ کو فل مارکس لینے کا کریز ہے، مجھے نہیں۔ میں تو یہاں پاسنگ مارکس لینے آئی ہوں مر مر کر پاس ہونے آئی ہوں۔ ٹاپ کرنے کا کوئی جنون نہیں ہے مجھے۔"

"میں جا کر سر احمد سے بات کر لیتی ہوں کہ میری نالائقی پہ وہ آپ جیسے لائق اسٹوڈنٹ کے مارکس نہ کاٹیں۔ نکمی میں ہوں تو سزا مجھے ملنی چاہیے آپ کا کیا قصور؟"

وہ اٹھی اور وہاں سے چلی گئی۔ واسع نے لب کچلتے ہوئے اسے جاتے دیکھا اور خود کو کوسا۔

"کیا ضرورت تھی اتنا آپے سے باہر ہونے کی؟"

اس لڑکی کا ایک ایک لفظ اس کے دماغ میں بار بار گردش کرنے لگا تھا۔ اس نے اگلے لیکچرز میں وہ اسے کلاس میں دکھائی نہیں دی تھی اور اس بات نے مزید اسے ڈسٹرب کر دیا تھا۔

لاسٹ لیکچر کے بعد جب وہ گھر جانے کے لیے پارکنگ کی طرف جا رہا تھا تب ہی ماجد اس کے پیچھے بھاگتا ہوا آیا تھا۔

"واسع! تمہیں سر احمد اپنے آفس میں بلا رہے ہیں۔" یہ معمول کی بات تھی کہ سر احمد اسے بلاتے رہتے تھے۔

وہ سر احمد کے آفس پہنچا تو وہ اسی کے منتظر تھے۔ ان کا بیگ ٹیبل پہ دھرا تھا اور کوٹ وہ پہن چکے تھے جس کا مطلب تھا کہ وہ بس نکلنے ہی والے تھے۔

"آؤ یار۔ کب سے لڑکے تمہیں بلانے کے لیے بھیجے ہوئے ہیں۔ میں بس نکلنے ہی والا تھا اگر تم نہ آتے تو۔" وہ ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ سر احمد مام کے فرسٹ کزن تھے۔ ایک تو رشتے داری اور دوسرا وہ ان کا پسندیدہ شاگرد تھا۔ اسی لیے وہ بہت بے تکلف ہو کر ان کے آفس میں بیٹھ جاتا تھا۔

"یہ کیا تم نے اپنے نمبروں کے پیچھے اس بچی کو خوار کیا ہوا ہے؟" ان کے اس سوال پہ وہ ساری بات سمجھ گیا۔ اب اس کی ٹھیک ٹھاک کلاس ہونا تھی جس کا وہ حق دار بھی تھا۔

"میں شرمندہ ہوں۔" وہ کوئی وضاحت نہیں دینا چاہتا تھا۔ سچ یہی تھا کہ وہ نادم تھا اور اسے اسی کا اظہار کرنا تھا۔

"ایک کلاس میں ہر طرح کا اسٹوڈنٹ ہوتا ہے اور ہم ٹیچرز سب کو اکٹھا لے کر چلتے ہیں واسع! کیونکہ ہم یہ نہیں کر سکتے کہ جو ذہین ہے وہ تو پڑھنے کا حق رکھتا ہے اور جو کمزور ہے وہ کلاس سے نکل جائے۔ استاد ایک لیڈر ہوتا ہے اور اس کا کام کلاس کو اکٹھے چلانا ہوتا ہے۔ اسی طرح جب گروپ ورک ہوتا ہے تو ہمیں اپنے کمزور ساتھیوں کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے نا کہ انہیں ایک طرف کر کے خود کو سامنے کرنا ہوتا ہے۔ ذہانت صرف ڈگریاں اور نمبر حاصل کرنے کا نام نہیں ہوتا بلکہ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کیسے چلتے ہیں، میرے نزدیک یہ ذہانت کی اعلا قسم ہے۔ یونیورسٹی میں گروپس اسی لیے بنائے جاتے ہیں تاکہ آپ کو ٹیم ورک کرنا آسکے۔ پریکٹیکل لائف میں کوئی تمہارے نمبر نہیں پوچھے گا۔ سب تمہاری ٹیم مینج منٹ کو دیکھیں گے۔ ورنہ رٹے لگا کر نمبر تو ایک طوطا بھی حاصل کر سکتا ہے۔ پھر ایک انسان اور رٹو طوطے میں کیا فرق رہا واسع؟"

وہ خاموش رہا تھا۔ اس سے غلطی ہوئی تھی۔ وہ میتھس میں جینئس تھا اور اپنی اسی برتری کو اس نے دوسرے کی کمتری پہ چسپاں کر ڈالا تھا۔

"بلاشبہ تمہاری اسائنمنٹ بہترین ہے۔ مجھے ثوبیہ نے ایمان داری سے بتایا کہ وہ تمہاری اپنی بنائی ہوئی ہے کیونکہ اسے میتھس کی یہ فیلڈ سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے۔ اب وائیوا کے لیے تم خوامخواہ اس بچی کو پریشان مت کرو۔ جتنا تمہیں آتا ہے، تم جواب دینا اور جتنا اسے آتا ہوگا وہ جواب دے گی۔ حالانکہ وہ مجھے صاف کہہ چکی ہے کہ اس کے نکمے پن کی وجہ سے تم سفر نہ کرو۔ میں اسے بھلے فیل کر دوں لیکن تمہارے نمبر کم نہ ہونے دوں۔ مجھے اس کے بڑے پن اور تمہارے چھوٹے پن پہ افسوس ہے۔"

"آئی ایم رئیلی سوری سر۔ میں ثوبیہ سے بھی معافی مانگ چکا ہوں اور ایک بار پھر سے مانگ لوں گا۔" اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی سر اونچا کرنے کی۔

"معافی تو تمہیں اس بچی سے مانگنی ہی چاہیے۔ مجھے خوشی ہوگی کہ تم لوگ ایک ٹیم ورک کی طرح کام کرو۔ اب تم جا سکتے ہو۔" وہ باہر نکل کر اپنے ڈیپارٹمنٹ میں اسے تلاش کرنے لگا۔ شاید وہ جا چکی تھی تب ہی اسے وہ کسی لیکچر میں دکھائی نہیں دی۔

☆☆☆

اس دن یونیورسٹی سے لوٹنے کے بعد وہ امی جان کی گود میں سر رکھ کر خاموشی سے لیٹی رہی۔ امی جان قرآن کی تلاوت کر رہی تھیں اور وہ خاموشی سے ان کے گھٹنے پہ سر رکھے گم صم سی تھی۔

"کیا بات ہے بیا! بہت خاموش ہو؟" قرآن پڑھنے کے بعد انھوں نے ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"امی جان! مجھے یہ سبجیکٹ نہیں رکھنے چاہیے تھے۔ میں سادہ سا بی اے کر لیتی ہے کسی کالج سے وہ بہتر تھا۔ پتا نہیں مجھے کیا پڑی تھی خود کو اس مشکل میں ڈالنے کی۔" سارے رستے وہ یہی سوچتی رہی تھی۔

"ارے ایسے کیوں کہہ رہی ہو۔ تم نے بہت اچھے نمبروں سے ایف ایس سی کیا تھا تو کیوں نا اچھے مضامین پڑھتیں؟"

"کیونکہ یہ مضامین میری سمجھ ہی میں نہیں آ رہے۔ ؟ میں یونہی اپنا وقت اور آپ کا پیسہ برباد کر رہی ہوں۔ ایسے مر مر کر پاس ہونے سے کیا کمال کر ڈالوں گی میں؟" گود سے سر اٹھا کر اس نے امی جان کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خود سے خفگی اور بیزاری کو وہ اچھی طرح پڑھ سکتی تھیں۔

"کسی نے کچھ کہا ہے تم سے بیا؟ تم خود سے کبھی ایسا نہیں سوچ سکتیں۔"

"کسی نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن انسان کو ہی کچھ کرنا چاہیے جس میں اس کی دلچسپی ہو۔ مزمل کو دیکھیں۔ اس نے ٹھیک کیا کہ پڑھائی چھوڑ دی۔ اب کمپیوٹر سیکھنے میں لگا ہوا ہے۔ کم از کم وقت برباد نہیں کر رہا۔ کہیں نہ کہیں پہنچ جائے گا۔"

اسی وقت دروازے پہ دستک ہوئی تو بیا نے جلدی سے پاس پڑا اپنا دوپٹہ اوڑھ لیا۔ امی جان نے اسے اندر آنے کی اجازت دی۔

سلام کے بعد وہ امی جان سے دودھ والے کا حساب کر رہا تھا۔ بیا اسے دیکھتی رہی کہ شاید وہ اس کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اس سے پوچھ لے کہ اسے کیا ہوا ہے لیکن جب تک وہ اسے دیکھتی رہی وہ سر جھکائے بس امی جان کو حساب ہی دکھاتا رہا حتی کہ بیا نے اپنا رخ موڑ لیا۔ اسے بھلا اب اس کی فکر کہاں تھی۔ وہ دوستی کا رشتہ بھلا چکا تھا۔

مزمل نے اس کی نظروں کو خود پہ سے ہٹتا محسوس کر کے اسے دیکھا تو پژمردہ سی بیا سامنے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں متورم دیکھ کر وہ جان گیا تھا کہ وہ روتی رہی ہے۔ اسی خیال نے اسے پریشان کر ڈالا کہ وہ کیوں روتی رہی ہوگی۔ یونہی بے چینی سے اس نے واپس رخ کیا۔

شام میں جب وہ پودوں کو پانی دینے لان میں گیا تو وہ ایک کیاری کے پاس نیچے گھاس پہ بیٹھی کتابوں کو بس دیکھ رہی تھی۔ ذہن کہیں اور تھا۔

"کوئی مسئلہ ہے کیا؟" بیا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی نظروں میں شکوہ دیکھ کر وہ نظریں چرا گیا۔

"تمہیں میرے مسئلے دکھائی دیتے ہیں حیرت ہے مزمل۔ مجھے تو لگتا تھا کہ تمہیں اب اس گھر میں میں نظر ہی نہیں آتی۔ بس یہ در و دیوار ہیں اور امی جان ہیں۔ تم تو جانتے ہی نہیں کہ کوئی بیا نام کی لڑکی بھی یہاں رہتی ہے جس سے تمہاری دوستی تھی۔ جس کا سارا بچپن تمہارے ساتھ کھیلتے، لڑتے جھگڑتے گزرا تھا۔" وہ اکثر ایسے ہی اس پہ طنز کرتی، اسے اس کی بے رخی جتاتی تھی۔ جواباً وہ خاموش رہتا تھا۔

"کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتائیں۔"

"بتاؤ۔ کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں تم سے عمر میں چھوٹی ہوں مزمل۔ مجھے یوں احترام دے دے کر بات مت کیا کرو۔ تم جانتے ہو تمہارے اس اجنبیت بھرے انداز سے مجھے شدید چڑ ہے۔" وہ تپ گئی۔ مزمل خاموش رہا۔

"جب تم مجھے دوست نہیں سمجھتے تو مجھ سے پوچھ کیوں رہے ہو کہ مجھے کیا ہوا جو بھی مسئلہ ہے تمہیں اس سے کیا۔" وہ چاہتی تھی کہ وہ کہے کہ ہم اب بھی دوست ہیں بیا۔ لیکن اس نے خاموشی کو ہی جواب بنایا ہوا تھا۔ اس کی خاموشی اسے مزید تاؤ دلا گئی۔

"مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے مزمل۔ تم جاؤ یہاں سے۔ جب تم خود کو میرا دوست سمجھو تو آنا مجھ سے میرے مسائل جاننے۔ تب میں وہی بیا بن جاؤں گی جو بچپن میں ذرا سی چوٹ لگنے پہ مزمل مزمل کرتی تمہارے پاس بھاگی آتی تھی کیونکہ اسے یقین ہوتا تھا کہ مزمل اس کو ہر مسئلے سے نکال سکتا ہے۔"

وہ اپنا رخ موڑ چکی تھی۔ مزمل نے اسے دیکھا جو اس سے خفا تھی۔

وہ چاہتا تھا کہ اس کے پاس بیٹھ کر اسے منا لے۔ اس سے پوچھے کہ بتاؤ پیاری لڑکی کس نے تمہیں رلایا۔ کس نے تمہیں کچھ ایسا کہا کہ تم جب سے لوٹی ہو، اداس ہو لیکن وہ نہیں کہہ سکا۔ مزمل اب بھی تمہیں ہر مسئلے سے نکال سکتا ہے۔ لیکن کسی کے کہے الفاظ اس کے پاؤں کی زنجیر تھے۔ وہ اس زنجیر کو نہیں کھول سکتا تھا۔ وہ اسی طرح لوٹ گیا۔ اسے جاتا دیکھ کر بیا کو مزید برا لگا۔ اس نے کتابیں سمیٹنا شروع کیں۔

"بیا مر بھی رہی ہو گی تو تمہیں کیا۔ تم بس اس گھر کے کام کرتے رہنا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

اگلے دن پہلی کلاس گیارہ بجے تھی۔ یونیورسٹی پہنچ کر پہلا کام ہی بیا کو تلاش کرنے کا کیا۔ پوری رات وہ ٹھیک سے سو نہیں سکا تھا۔ اس کا احساس جرم اسے سونے ہی نہیں دے رہا تھا۔ اسی لیے اب بیا کو تلاش کرنا لازمی تھا۔

وہ ڈیپارٹمنٹ کے آخری سیڑھیوں پہ اسے اکیلی بیٹھی مل گئی۔ اپنی کل کی بنک کی گئی کلاسز کے لیکچر نوٹ کر رہی تھی۔

"ثوبیہ پلیز۔ میری بات سن لیں۔" وہ اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

"سر سے بات ہو گئی تھی میری۔ وہ آپ کے مارکس نہیں کاٹیں گے۔ آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ کل سارا دن تو اس کا بھی اس کے کہے الفاظ کے زیر اثر گزرا تھا۔

"میں کیسے یقین دلاؤں کہ میں کتنا شرمندہ ہوں۔"

"ضرورت نہیں ہے یقین دلانے کی۔ بس یہ اطمینان رکھیں کہ میری وجہ سے آپ کے مارکس کم نہیں آئیں گے۔ مستقبل میں بھی سر بھی میرا آپ کے ساتھ گروپ نہیں بنائیں گے۔ آپ کے ساتھ کیا کسی بھی لائق فائق اسٹوڈنٹ کے ساتھ نہیں بنائیں گے کہ میری وجہ سے کوئی ٹاپر ٹاپ کرنے سے رہ نہ جائے۔"

"پلیز اور کتنا شرمندہ کریں گی آپ مجھے، میں پہلے ہی کل سارا دن نادم رہا ہوں۔" وہ اس کے پاس سیڑھی پہ بیٹھ گیا۔

"میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا نہیں ہے۔ سوری اگر آپ کو ایسا لگا ہو تو۔ بات ختم ہو گئی ہے۔"

"اگر بات ختم ہو گئی ہے تو چلو ایک کپ چائے پیتے ہیں۔ چاٹ کی پلیٹ کے ساتھ۔ وہ بھی میری طرف سے۔" بیا نے کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"اگر آپ کو چاٹ نہیں کھانی تو کچھ اور بھی کھا

سکتی ہیں۔"

"کلاس شروع ہونے والی ہے۔" واسع نے وقت دیکھا۔

"ابھی بیس منٹ پڑے ہیں۔ جلدی چلیں اب۔" بیا کچھ دیر سوچتے ہوئے اپنی ساری چیزیں سمیٹ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔

کینٹے ٹیریا میں آرڈر اسی نے دیا تھا کیونکہ کیا چیز کس کوالٹی کی ہے، وہ اچھی طرح سے جانتی تھی۔ وہ بہت کم ہی کینٹے ٹیریا جاتا تھا۔

"یہاں کا شامی انڈہ برگر زیادہ اچھا ہوتا ہے۔" وہ اتنی معصومیت سے سب بھول بھال کر دوبارہ سے پہلے جیسی ہوگئی تھی۔ اس کے رویے میں کہیں شائبہ تک نہ تھا کہ وہ خفا ہے۔ واسع نے اسے بغور دیکھا۔ وہ عام لڑکیوں کی نسبت بہت سادہ تھی۔ اس نے اتنے عرصے میں اسے کسی اوٹ پٹانگ قسم کے فیشن میں مبتلا نہیں دیکھا تھا نہ ہی وہ بہت زیادہ تیار ہوکر یونی آتی تھی۔

"آپ کے فادر کیا کرتے ہیں؟" یونہی بے ساختہ وہ پوچھ بیٹھا۔

"ان کی ڈیتھ ہوچکی ہے۔" اس نے اسی سادگی سے کہا۔

"اوہ سوری۔ میرے فادر کی بھی ڈیتھ ہوچکی ہے۔"

"لیکن میری مدر کی بھی ڈیتھ ہوچکی ہے۔ آپ کی مدر یقیناً آپ کے پاس ہوں گی۔" اس کی بات پہ وہ ایک دم شاکڈ سا اسے دیکھنے لگا۔

"اللہ کا شکر ہے کہ میری مام زندہ ہیں۔ لیکن آپ کے پیرنٹس کی ڈیتھ کیسے ہوئی؟"

"جب میں آٹھ سال کی تھی تو وہ دونوں حج کرنے گئے تھے۔ رمی کے وقت بھگدڑ مچی اور اسی میں دونوں شہید ہوگئے۔ امی جان نے بھی کہا کہ اس پیاری زمین پہ وفات ہونا قسمت کی نشانی ہے۔ اس لیے وہیں دفنا دیا جائے۔ بس وہیں دفنا دیا گیا اور میں یہاں امی جان کے پاس اکیلی رہ گئی۔"

"امی جان کون؟" اس نے گم صم پوچھا۔

"میری دادی ہیں۔ میرے بابا انہیں اسی نام سے بلاتے تھے۔ انھوں نے ہی مجھے پالا ہے والدین نہیں رہے۔ تو امی جان ہی میرے لیے اب سب کچھ ہیں۔ ماں بھی، باپ بھی۔" امی جان کا نام لیتے اس کے لبوں پہ پیاری سی مسکراہٹ تھی۔

"بہت افسوس ہوا آپ کی اتنی ٹریجک اسٹوری سن کر۔ زندگی بڑی عجیب چیز ہے۔" بیا پھیکا سا مسکرائی۔

"بس جو قسمت میں لکھا ہو، وہ تو ہو کر ہی رہتا ہے۔"

"تو آپ کے بہن بھائی نہیں ہیں؟" بیا نے سر نفی میں ہلایا۔

"میں اکلوتی ہوں۔ میرے بابا بھی اکلوتے تھے، اسی لیے امی جان کے پاس اب میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔"

"کوانسیڈنٹ۔ میں بھی اکلوتا ہوں۔" تب تک ان کی چائے اور برگرز آچکے تھے۔

"ماننا پڑے گا کہ برگر بہت ٹیسٹی ہے۔" پہلا لقمہ لے کر ہی اس نے داد دی تو بیا مسکرانے لگی۔ یہ ان دونوں کے درمیان امن کا قیام تھا۔

☆☆☆

اس اسائنمنٹ کے بعد ان کو اکٹھے کام کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن دونوں میں اچھی سلام دعا ہوگئی تھی۔ بیا کو اکثر میتھس میں کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا تو وہ مدد کے لیے واسع کے پاس چلی جاتی۔ اس کے بعد سے واسع نے کبھی اسے نہیں جتایا کہ وہ میتھس میں نکمی ہے۔ وہ اکثر اسائنمنٹس میں اس کی مدد کردیا کرتا تھا۔ اپنے نوٹس بھی اسے دے دیتا تھا۔

"بی ایس کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے؟" واسع نے اسے میتھس کے سوالات سمجھانے کے بعد اس کا رجسٹر بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی تو نہیں سوچا۔ شاید ماسٹرز کروں۔"

"میتھس میں تو نہیں کریں گی؟" اس نے

شرارت سے کہا۔ بیا جانتی تھی، وہ اسے چھیڑ رہا ہے۔
"کیا پتا میتھس میں ہی کرلوں۔" اس نے بھی ویسے ہی جواب دیا۔ دونوں ہنس دیے۔
"کیوں اب آپ کو نہیں لگتا کہ میں میتھس میں کچھ بہتر ہوگئی ہوں؟"
"کچھ بہتر ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ماسٹرز کرلیا جائے۔ اب پلیز مائنڈ مت کریئے گا۔ بی ایس میں یہ سبجیکٹ رکھنا مجبوری تھی کیونکہ آپ کو اکنامکس کے ساتھ یہی مضمون آفر ہو رہا تھا لیکن ماسٹرز تو انسان کو اسی میں کرنا چاہئے جس میں اس کا انٹرسٹ ہو۔" بیا نے سر ہلایا۔
"ڈونٹ وری۔ ماسٹرز میں نے کیا بھی تو اکنامکس میں ہی کروں گی۔ آپ کی جان کھانے نہیں آؤں گی میتھس سمجھنے۔" وہ اب اپنی کتابیں بیگ میں ڈال رہی تھی۔
"اور یہ کس نے کہا کہ میں میتھس میں ماسٹرز کرنے جا رہا ہوں؟" وہ چونکی۔
"کیا مطلب۔ آپ میتھس کے جینئس ہیں۔ آپ میتھس میں ماسٹرز نہیں کریں گے تو کس میں کریں گے؟"
"جینئس تو میں اکنامکس اور کمپیوٹر میں بھی ہوں۔ تو ان دونوں میں کیوں نہیں کر سکتا۔" بیا نے سر ہلا کر اقرار کیا۔ یہ تو سچ تھا کہ وہ سب ہی مضامین میں بہت شان دار پرفارمنس دیتا تھا۔ لیکن میتھس میں وہ باقی کلاس کی نسبت زیادہ ذہین تھا۔
"تو پھر؟" واسع نے شانے اچکائے۔
"شاید میں اکنامکس رکھوں یا ایم بی اے۔ ہمارا ٹیکسٹائل کا فیملی بزنس ہے تو مام چاہتی ہیں کہ میں اسے سنبھالوں کیونکہ بابا کی ڈیتھ کے بعد سے مام ہی اسے دیکھ رہی ہیں۔ اس کے لیے بہتر ہے کہ میں ایسے سبجیکٹ میں ہی ماسٹرز کروں جس کا مجھے کچھ فائدہ بھی ہو۔"
بیا کچھ مرعوب ہوئی۔ اس سے پہلے اس نے کبھی ذکر نہیں کیا تھا کہ ان کا فیملی بزنس ہے۔

"پڑھنا میرا شوق تھا۔ مام بالکل نہیں چاہتی تھیں کہ میں اسٹڈیز پہ اتنا فوکس کروں۔ میرے بابا کی فیملی میں زیادہ تر لڑکے ایف اے پاس کر کے بزنس سنبھالنے لگ جاتے ہیں۔ میں خاندان میں پہلا ہوں جو یونی ورسٹی آیا ہوں۔"
"بٹ آئی مسٹ سے کہ آپ جتنے ذہین ہیں، آپ کو تو بہت آگے تک پڑھنا چاہیے۔" واسع مسکرایا۔ یہ بات وہ اکثر مام سے کہتا تھا لیکن ان کی طرف سے اب اسے پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ جلد از جلد اس کو آفس کی ذمہ داری سونپنا چاہتی تھیں۔
"تھینکس فار دس کمپلیمنٹ۔"

اس دن آخری پیپر دے کر جب وہ ہال سے باہر نکلی تو وہ اپنا بیگ کاندھے پہ لیے دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے اس کا ہی منتظر کھڑا تھا۔
"آپ کو پیپر نہیں آتا تھا کیا؟" وہ فکرمندی سے پوچھنے لگی کہ وہ ڈیڑھ گھنٹے میں پیپر دے کر باہر جا چکا تھا۔
"پورا پیپر کیا ہے۔"
"تو اتنی جلدی کیوں ہال سے نکل گئے؟"
"کیونکہ پیپر ہوگیا تھا میرا۔" وہ مسکرایا۔
"ڈیڑھ گھنٹے میں ہی ہوگیا؟" وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔
"ظاہر ہے۔ ہوگیا تو ہی دے کر نکلا۔"
"مجھ سے تو آخر میں سر خورشید نے پیپر کھینچ لیا۔ ابھی بھی ایک پارٹ رہتا تھا۔" وہ منہ لٹکا کر بولی۔
"ابھی بھی رہتا تھا۔ تین گھنٹے بعد بھی۔" بیا نے منہ بناتے سر ہلایا۔
"چلو اب تو جو ہونا تھا ہوگیا۔ کیفے چلتے ہیں۔"
"میری فرینڈز؟" اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن کوئی بھی کاریڈور میں دکھائی نہیں دی۔
"وہ بھی وہیں کیفے میں ہیں۔ میں یہاں آپ کو ہی لینے کے لیے کھڑا تھا۔" اب تک اس کی بے تکلفی بیا کی باقی دوستوں سے بھی ہوگئی تھی۔ دونوں

اکٹھے کیفے آئے تھے۔ ایک کونے والی ٹیبل پہ اس کی دوستوں کا گروپ تھا۔ جب وہ قریب پہنچی تو میز کے بیچ میں ایک کیک اور چند گفٹس دکھائی دیے۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو بیا۔" اس کی ساری دوستوں نے یک آواز ہو کر کہا اور ساتھ کھڑے واسع نے یک دم اس پہ پارٹی پاپس پھوڑے تو وہ اپنی جگہ ہل گئی اور پھر اپنے اوپر گرنے والی افشاں میں کھڑی مسکرانے بھی لگی۔ اسے لگا تھا کہ اس کی سالگرہ پیپر کی ٹینشن میں کسی کو بھی یاد نہیں ہوگی لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ نہ صرف انہیں یاد تھی بلکہ وہ سب اسے سیلیبریٹ کرنے بھی موجود تھے۔

سب دوستوں کے درمیان بیٹھ کر اس نے کیک کاٹا۔ سب کو چکھایا اور واسع کے سامنے اس نے پلیٹ کر دی۔ واسع نے مسکراتے ہوئے کیک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔

"تھینک یو سو مچ یارو۔ تم سب کو یاد تھا۔" وہ کیک کاٹ کر اب ڈسپوزیبل پلیٹس میں ڈالنے لگی۔

"یاد صرف روما کو تھا۔ ہم تو پیپر کی ٹینشن میں بھول ہی گئے۔ اور یہ سب واسع نے کیا ہے۔ اس میں ہمارا کوئی کریڈٹ نہیں ہے۔" بیا چونک کر سیدھی ہوئی۔ وہ سامنے کرسی پہ بیٹھا سادگی سے دھیما سا مسکرا رہا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ کبھی اس نے اپنی تاریخ پیدائش کا ذکر کیا ہو پھر بھی اسے یاد تھا یہ بات اس کے لیے حیران کن تھی۔

کیک کھانے کے بعد ان سب نے بیا کا من پسند انڈہ شامی برگر آڈر کیا تھا۔ فرینڈز کی طرف سے روما ہی گفٹ لائی ہوئی تھی اور دوسرا گفٹ واسع کی طرف سے تھا۔ اس میں پرفیوم تھا۔ اس نے مسکرا کر اسے تھینکس کہا تو وہ سر کو خم دیتا ہوا کیفے سے نکل گیا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ دال میں کالا ہے کچھ۔ لیکن ہماری بیا بیگم نہیں مانتیں۔" نتاشا نے کھنکار کر کہا۔ بیا نے اسے گھورا۔

"وہ ایک اچھا دوست ہے اور بس۔"

"کوئی دوست اتنا خیال کہاں کرتا ہے؟ ہم نے تو کبھی نہیں دیکھا۔" نتاشا اسے اکثر ہی واسع کا نام لے کر چھیڑتی لگی تھی لیکن وہ اسے دوستی کا نام دے کر ٹال دیتی تھی لیکن اس وقت واقعی واسع نے اسے حیران کیا تھا۔

"نتاشا۔ ہی از آ گڈ فرینڈ۔ ہمارے درمیان آج تک کبھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی۔ جہاں تک کیئر کی بات ہے وہ تو تم لوگوں کی بھی کرتا ہے۔ تم سب کو بٹھا کر کتنے ٹاپکس سمجھا چکا ہے۔ جب روما گری تھی اور فریکچر ہوا تھا تو اسے اپنی گاڑی میں ڈال کر ہسپتال کون لے کر گیا تھا۔ اس دن تو میں یونیورسٹی آئی بھی نہیں تھی۔ وہ تم سب کا بھی اسی طرح خیال رکھتا ہے۔"

"صرف تمہاری وجہ سے۔ کیونکہ ہم تمہاری فرینڈز ہیں۔" نتاشا نے دوبدو جواب دیا۔ بیا نے سر ہلایا کہ تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔ وقت دیکھا تو جلدی جلدی چیزیں سمیٹنے لگی۔

"تھینکس فار دا ٹریٹ۔ اب رزلٹ آنے پہ ملتے ہیں۔" گفٹ اٹھا کر اس نے بیگ میں ڈالے اور نکل گئی۔ اس کی بس کا وقت ہو رہا تھا اور اسے اس سے پہلے بس میں جگہ بنانی تھی۔

وہ تیزی سے بس اسٹینڈ کی طرف جا رہی تھی جب اچانک ایک طرف سے نکل کر واسع اس کے سامنے آ گیا۔ اپنی جگہ وہ اچھل ہی پڑی کہ وہ بالکل اس بات کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ واسع مسکرا دیا۔

"اتنا سا دل ہے تمہارا۔ فوراً ڈر جاتی ہو۔" بیا نے اسے خائف نظروں سے دیکھا۔

"مجھے ایسے حملوں کی عادت نہیں ہے۔" دور بس نے ہارن دیا تو بیا نے بس کی طرف دیکھا۔ باہر دروازے تک لٹکے ہوئے دکھائی دیے۔

"اوہ۔ میری بس جا رہی ہے۔"

"جانے دو۔" بیا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی سنجیدہ تھا۔

"میں کیسے جاؤں گی گھر؟ اور کوئی بس اس روٹ کی نہیں ہے۔"

"میری گاڑی حاضر ہے۔ جس روٹ پہ کہو گی چھوڑ دے گی۔" وہ مزید حیران ہوئی۔ پھر بس کو دیکھا۔

"مجھے کچھ بات کرنی ہے بیا۔ پلیز رک جاؤ۔" یہ پہلی بار تھا کہ وہ نک نیم سے پکار رہا تھا۔ بیا سے مزید قدم نہیں اٹھائے گئے۔ بس سرکنے لگی تھی لیکن وہ ہل نہیں سکی۔ واسع مسکرادیا۔

"کیا ہم یہیں کھڑے رہیں گے۔ چلو لائبریری کے سامنے والی سیڑھیوں پہ چلتے ہیں۔ اس وقت وہاں کوئی رش نہیں ملے گا۔" وہ آگے بڑھا تو بیا اس کے پیچھے تھی۔

سیڑھیوں پہ واقعی رش نہیں تھا۔ زیادہ تر ڈیپارٹمنٹ کے سیشن ختم ہو چکے تھے۔

"یہ وہ سیڑھیاں ہیں جہاں میں نے تمہیں پہلی بار ڈانٹا تھا۔"

"ذلیل کیا تھا۔" بیا نے تصحیح کی۔ واسع نے کان پکڑے۔ وہ جب سوچتا تھا شرمندہ ہوتا تھا۔

"لیکن اس واقعے نے میرے دل میں جو سافٹ کارنر پیدا کیا، وہ وقت کے ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ اور اب جو مقام تمہارا ہے، وہ کسی کا نہیں ہے۔" وہ بیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا اور بیا کنفیوز ہو کر سامنے دیکھنے لگی۔ دل تیز دھڑک رہا تھا۔

"میرے چار سال تمہارے سامنے رہے ہیں بیا! اس دوران میں کس قسم کی عادات کا حامل رہا، کن ایکٹیویٹیز میں انوالو رہا، تم نے سب دیکھا۔ کیا تم نے مجھ میں کوئی برائی دیکھی سوائے اس کے کہ میں اپنی اسٹڈیز کو لے کر کریزی ہوں؟" وہ یہ کیوں پوچھ رہا تھا وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

"کیا تمہیں لگتا ہے کہ میرے جیسا انسان اگر تمہارے ساتھ زندگی گزارنا چاہے تو تمہاری زندگی بری گزرے گی؟" بیا دھک سے رہ گئی۔ وہ اسے باقاعدہ پرپوز کر رہا تھا۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ ہم ساتھ میں بہت اچھی زندگی گزار سکتے ہیں۔" وہ اپنے خیالات بتا رہا تھا۔

کوئی پسندیدگی کا اظہار نہیں۔ کوئی محبت کا دعوا نہیں۔ سیدھا سیدھا پرپوز۔ بیا کے گال گلال ہونے لگے۔ کانوں کی لوئیں سرخ پڑنے لگیں۔

"میں مام سے جلد بات کرنے والا ہوں۔ پھر تمہیں بتاؤں گا۔ تو کیا کہتی ہو، بات کرلوں نا؟" وہ تھوڑا آگے جھک کر اس کے جھکے چہرے کو دیکھتے پوچھ رہا تھا۔ اس کا دل کیا وہاں سے بھاگ جائے۔

"پتا نہیں۔" اس نے جلدی سے کہا اور اٹھ کر چل دی۔

"کہاں جا رہی ہو۔ تمہیں میں نے ہی ڈراپ کرنا ہے۔" اس کے پیچھے سے چلانے پہ احساس ہوا کہ اس کی بس تو جا چکی تھی۔

اب دونوں پارکنگ لاٹ کی طرف جا رہے تھے۔ واسع نے اپنی گاڑی کا ڈور اس کے لیے کھولا جو بیا کو اندر ہی اندر اچھا لگا۔ یہ احساس ہی اتنا خوب صورت تھا کہ ایک انسان آپ کو پسند کرتا ہو، آپ کی کیئر کرتا ہو، وہ اب آپ کو اپنا لائف پارٹنر بنانے کے لیے سیریس ہو۔

"مجھے رستہ بتا دینا۔" ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر وہ سائیڈ مرر سیٹ کرتے ہوئے بولا۔

"ویسے مجھے نہیں پتا تھا کہ تم شرماتے ہوئے اتنی کیوٹ لگو گی۔" گاڑی گیٹ سے باہر نکالتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا اور بیا پھر سے شرم سے دہری ہو رہی تھی۔ واسع کھل کر مسکرا دیا۔

گاڑی اس نے ایک جوس کارنر کے سامنے روک دی تھی۔

"گرمی بھی ہے اور تمہارے چھوٹتے پسینے دیکھ کر میرا خیال ہے، ٹھنڈا پی لیا جائے۔" اپنے ماتھے کے پسینے کو بیا نے ٹشو سے صاف کیا۔

"مینگو یا اورنج؟"

"کچھ بھی۔"

اس نے اپنا آرڈر بک کروایا اور اس کی طرف گھوم کر بیٹھ گیا تو وہ مزید خود میں سمٹ گئی۔

"بیا آن دا سیریس نوٹ، ہم دونوں میچور ہیں۔

میں تمہارے لیے سیریس ہوں اسی لیے تم سے تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں بیا کہ کیا تمہیں اس بات پہ کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟" بیا نے اب اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جو اپنائیت اور محبت تھی نادانستہ ہی سر نفی میں ہلایا تو وہ جیسے پر سکون ہو گیا۔

"تھینک یو بیا۔ ورنہ میں ڈر رہا تھا کہ اگر تم نے منع کر دیا تو میں کیا کروں گا۔"

"اور اگر میں منع کر دیتی تو؟ تو کیا کرتے؟"

"تو۔ تو میں تمہیں منانے میں ہر ہنر آزمالیتا۔"

بیا مسکرا دی۔

☆☆☆

رات کھانے پہ وہ مام کے ساتھ بیٹھا نیوز دیکھ رہا تھا۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے نیوز دیکھنے کی عادی تھیں۔

"لاسٹ پیپر کیسا ہوا؟" کھاتے ہوئے انھوں نے پوچھا۔

"زبردست۔ ہمیشہ کی طرح۔"

"اب کیا کرنے کا سوچا ہے۔"

"مام، میں سوچ رہا ہوں کہ آفس آنا شروع کر دوں۔"

یوں تو وہ اکثر آفس کا چکر لگا تا رہتا تھا اور سارے اسٹاف سے بھی واقف تھا لیکن اب اسے باقاعدہ جوائن کرنے کا وقت تھا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تمہیں اپنی ذمہ داری کا احساس ہے۔" ذرا کی ذرا خبروں سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔

"ویل۔ بابا کے بعد آپ کیسے یہ سارا بزنس رن کرتی رہی ہیں، میں جانتا ہوں مام۔ اب آپ کو ریسٹ کرنا چاہئے۔ میں سب دیکھ لوں گا۔" مسز عبداللہ نے بہت متاثر نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔

"گریٹ۔ مجھے خوشی ہو رہی ہے یہ سب سن کر۔ واسع! تمہیں میرا احساس ہے۔ اپنے بابا کے محنت سے چلائے بزنس کا احساس ہے۔" وہ انہیں کیسے بتاتا کہ اسے احساس ہے لیکن وہ اپنے شوق اور فطرت کے ہاتھوں مجبور ہے۔ اس کا دماغ بزنس سے زیادہ کتابوں میں لگتا تھا۔

"مام! مجھے آپ کو کچھ بتانا بھی تھا۔" انھوں نے سر ہلایا اور نظریں نیوز سے ہٹا کر اس پہ جما دیں۔

"میری ایک کلاس فیلو ہے۔ میں اس کے لیے سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں۔" مسز عبداللہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"اس سے پہلے تم نے کبھی نہیں بتایا واسع۔" ان کا بیٹا اتنا اہم فیصلہ انہیں بتائے بنا کیسے کر سکتا تھا۔ بے یقینی تھی۔

"مام! کوئی ایسی بات تھی ہی نہیں جو بتائی جاتی۔ ایک کلاس فیلو ہی تھی جیسے سب ہوتی ہیں۔"

"سب کی طرح ہوتی تو تم یہاں بیٹھے یہ بات نہ کر رہے ہوتے۔" ان کے چہرے پہ کچھ ناگوار تاثرات ابھرے تھے۔

"ہاں ٹھیک ہے، وہ سب جیسی نہیں ہے۔ لیکن ہے کلاس فیلو ہی۔ ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہے ہمارے درمیان جو آپ کو لگ رہا ہے۔"

"کیا فیملی بیک گراؤنڈ ہے اس کا؟ کس خاندان کی ہے؟ فادر کیا کرتے ہیں؟" وہ کھانا چھوڑ چکی تھیں۔ اب سارا دھیان اسی ایک بات پہ تھا کہ جوان اور اکلوتا بیٹا اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ اب تک اس کے سارے فیصلے خود لیتی آئی تھیں۔ ان ماؤں میں سے تھیں جو اولاد کے لیے دن میں پہنے جانے والے کپڑے تک خود چنتی ہیں۔ ایک یونی ورسٹی میں ایڈمیشن اس نے اپنی مرضی سے، بہت ضد کر کے، بھوک ہڑتال کر کر کے لیا تھا اور اب یہ دوسری ضد سامنے آ رہی تھی جو انہیں سخت کھل رہی تھی۔

"اس کے پیرنٹس کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ دادی نے اسے پالا ہے۔ فادر اس کے گورنمنٹ آفیسر تھے۔ بس اس سے زیادہ میں نہیں جانتا۔"

"اور اتنا جان لینا تمہیں کافی لگا۔" وہ سیٹ کی

پشت سے ٹیک لگا کر ابرو چڑھائے کر اسے طنزیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

"مام! میں اسے جانتا ہوں کہ وہ کیسی ہے؟ مجھے اس کی فیملی کو جان کر کیا کرنا ہے؟"

"شادی کے لیے فیملیز دیکھی جاتی ہیں واسع۔ میں اپنی فیملی میں کیا جواب دوں گی کہ کون لڑکی اپنے بیٹے کے لیے لا رہی ہوں؟"

"اور آپ کے اس فیملی اسٹیٹس کے پیچھے میں کسی بھی ایسی لڑکی سے شادی کر لوں جس کو میں پسند نہ کر سکوں۔ لائف میری ہے اور گزارنی مجھے لوگوں کے مطابق ہے۔ یہ کہاں لکھا ہے مام؟" مسز عبداللہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"تم ہر بار اس قسم کی بحث کر کے کیوں یہ ثابت کرتے ہو کہ میں تمہاری ماں نہیں دشمن ہوں جو تمہارے بارے میں غلط فیصلے لیتی ہوں۔ شاید بھول گئے ہو کہ میں وہی ماں ہوں تمہاری جس نے تمہارے باپ کے جانے کے بعد گھر سے نکل کر اس کا سارا بزنس رن کیا۔ سب نے کہا تھا کہ تیس سال میں بیوہ ہو گئی ہو، دوسری شادی کر لو لیکن صرف تمہارے لیے میں نے اپنے اندر کی عورت کو مار دیا اور ماں بن کر سوچا کہ نہیں مجھے دوسری شادی نہیں کرنی۔ مجھے اپنے بیٹے اور شوہر کے بزنس کو دیکھنا ہے۔ اب تم بڑے ہو گئے ہو تو بات بات پہ مجھے جتاتے ہو کہ میں نے تو کچھ کیا ہی نہیں۔ میرے تو فیصلے ہی غلط ہیں۔"

"مام پلیز۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ میں ایک مجبور انسان ہوں کوئی پانچویں کلاس میں پڑھنے والا بچہ نہیں ہوں۔ کیا اپنی لائف کے اہم فیصلے خود نہیں کر سکتا۔؟ مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے آپ جانتی ہیں۔ آپ کے کہنے پہ میں نے فارن جا کر نہیں پڑھا کہ آپ اکیلی ہو جائیں گی ورنہ مجھے اسکالرشپ پہ وہاں ایڈمیشن مل رہا تھا۔ آپ کے لیے میں اپنا بزنس سنبھالوں گا حالانکہ آپ جانتی ہیں کہ میں آگے پڑھنے کا شوق رکھتا ہوں۔ اب اگر شادی جیسا اہم فیصلہ میں خود کرنا چاہتا ہوں تو اس میں اتنا ایشو کیوں بن رہا ہے۔ کیا یہ فرض ہے کہ مجھے اپنا اکلوتا بیٹا ہونے کا تاوان چکانا ہو گا اور ہمیشہ آپ کے فیصلوں پہ سر جھکانا ہو گا۔"

"میں اس موضوع پہ فی الحال بات نہیں کرنا چاہتی واسع۔" انھوں نے ٹی وی کا والیوم اونچا کر کے رخ بدل لیا۔ واسع نے تیزی سے کرسی پیچھے گھسیٹی اور اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ مسز عبداللہ لب بھینچے اس کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھتی رہیں۔

رات وہ اپنے کمرے میں صرف اسی بے چینی میں سو نہیں سکیں کہ جوان اولاد کو کیسے اس فیصلے سے باز رکھ سکیں۔ ساری زندگی دوسروں پہ مرضی تھوپ تھوپ کر عادت ہو جاتی ہے ان کی زندگی خود جینے کی اور اب جب وہ اپنی زندگی خود جینا چاہتے ہیں تو ایسے لوگوں کو اپنی موت واقع ہوئی لگتی ہے۔

☆☆☆

واسع نے کہا تھا کہ وہ اسے اپنی مام سے بات کر کے بتائے گا لیکن اس کی تو کوئی خبر ہی نہیں تھی کہ وہ کہاں ہے؟

تین دن ہو چکے تھے۔ نہ اس کا کوئی میسج آیا تھا نہ کوئی کال۔ یونیورسٹی میں وہ اسے اکثر میسج کرتا رہتا تھا اور وہ خود سے بھی میسج کر دیتی لیکن وہ میسجز پڑھائی سے متعلق ہوتے تھے۔ اب تو پڑھائی کا بہانا بھی ختم ہو گیا۔ سوائے بس صبر کرنا تھا۔

یہ صبر اسے چڑچڑا اور بے چین کر رہا تھا۔ وہ امی جان سے تو ٹھیک سے بات کر لیتی لیکن وہ بات بات پہ مزمل پہ بگڑ رہی تھی۔ اس کے کیے ٹھیک کام بھی اسے برے لگ رہے تھے۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

"یہ کتنا فضول فروٹ لائے ہو؟ کچے سیب اور کیلے حد سے زیادہ پکے ہوئے۔ کون کھائے گا انہیں۔"

وہ کچن سے فروٹ باسکٹ لاتے ہوئے امی

جان کے پاس کھڑے مزمل پہ برس پڑی۔ امی جان نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔ مزمل سر جھکائے کھڑا رہا۔

"مزمل! تم جاؤ۔ بعد میں بات کرتے ہیں۔" اس کے جانے کے بعد امی جان نے بیا کو گھورا۔

"دماغ خراب تو تم دوسروں کا کر رہی ہو جب سے یونیورسٹی ختم ہوئی ہے۔ اب جب تک گھر میں رہو گی ایسی ہی رہو گی کیا؟ کبھی کسی پہ چڑھائی تو کبھی کسی پہ۔"

"تو گھر چھوڑ دیتی ہوں اگر آپ کہتی ہیں تو۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کہہ گئی۔ امی جان حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔ وہ چڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"کیا ضرورت تھی امی جان سے الجھنے کی۔" کمرے میں جا کر کافی دیر بعد اس نے خود کو لتاڑا۔ وہ اپنی جھنجلاہٹ پہ قابو نہیں رکھ پا رہی تھی۔

"وہ کدھر رہ گیا۔ مجھے کال کیوں نہیں کر رہا۔ کیا اس نے مجھ سے مذاق کیا تھا۔ کیا وہ میرے جذبات سے کھیل رہا تھا۔ مجھے بے وقوف بنا رہا تھا۔ فلرٹ کر رہا تھا کہ میں کتنی آسانی سے اس کا شکار ہو جاتی ہوں۔" اسے رونا آنے لگا۔

لیکن اس کی نظر اپنے اسٹیٹس پہ پڑی۔ واسع نے اس کا اسٹیٹس چیک کیا تھا۔ وہ دھک سے رہ گئی۔ اس نے یہ اسٹیٹس لگایا ہی اس کے لیے تھا جسے وہ دس منٹ پہلے دیکھ چکا تھا۔

"اس نے پھر بھی مجھے کوئی ریپلائی نہیں کیا۔" اس کا دل ڈوبنے لگا۔ آخر وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟

☆☆☆

ادھر واسع نے پچھلے چار دن سے خود کو کمرے تک محدود کر لیا تھا۔ غصہ، جھنجلاہٹ، بے چینی و اضطراب تھا جو اسے کسی پل سکون نہیں لینے دے رہا تھا۔

"بیا کیا سوچ رہی ہو گی کہ میں کہاں رہ گیا۔ کیوں اس سے رابطہ نہیں کیا؟ مگر رابطہ کر کے اس سے کیا کہوں۔ کیا تسلی دوں۔" موبائل اٹھا کر اس نے بیا کا نمبر دیکھا۔ اس نے کوئی اسٹیٹس لگا رکھا تھا۔

"کچھ لوگوں کا نہ ہونا ہی زندگی کو اداس کر دیتا ہے۔" واسع نے لب بھینچ کر موبائل ایک طرف رکھ دیا۔

اسے ابھی اور اسی وقت مام سے بات کرنا تھی۔ وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکلا۔ لان میں ہی پڑی کرسیوں پہ بیٹھ گیا۔

"مام کو اس بار میری ماننی ہو گی۔" آخری سوچ اس کے ذہن میں یہی آئی تھی۔

اتنے میں مام کی گاڑی ڈرائیو وے پہ آ کر رکی وہ گاڑی سے اتریں تو نظر اس پہ پڑی۔ چار دنوں میں وہ کمرے میں ہی قید تھا۔ کھانا بھی ان کے ساتھ نہیں کھا رہا تھا۔

"تو نکل آئے تم اپنے کمرے سے۔ یاد آ گئی ماں کی؟ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم کسی لڑکی کے لیے ماں کو یہ ایٹی ٹیوڈ دکھاؤ گے۔"

"کسی بھی لڑکی کی نہیں ہے وہ مام اور نہ ہی میں اس کے لیے آپ کو یہ ایٹی ٹیوڈ دکھا رہا ہوں۔ بات صرف اتنی ہے کہ اب مجھے کچھ تو اپنے فیصلے لینے کا اختیار ہونا چاہیے۔ کہیں تو میری زندگی پہ میری مرضی بھی چل سکے۔ آپ کیوں نہیں سمجھتیں کہ اب میں بچہ نہیں ہوں کہ آپ مجھے بتائیں واسع آج تمہارے لیے یہ شرٹ نکالی ہے، واسع میں تمہارا اسکول چینج کروا رہی ہوں، واسع فلاں لڑکے کے ساتھ مت کھیلو وہ اچھا نہیں ہے۔ میں اب خود دیکھ سکتا ہوں کہ کیا اچھا اور کیا برا ہے۔ اپنے فیصلے لے سکتا ہوں مام۔ اگر کوئی پسند ہے تو اس کو زندگی میں شامل کرنے میں کیا مسئلہ ہے۔ آپ نے کہیں تو شادی کروانا تھی تو میری پسند سے کیوں نہیں ہو سکتی؟"

"تم ایک لڑکی کے لیے اپنی ماں کو اتنی باتیں سنا رہے ہو؟" وہ شاکڈ میں آ گئی تھیں۔

"مام۔ اگر آپ اسے قبول نہیں کر سکتیں تو مجھے

آپ کی پسند کی گئی کوئی لڑکی بھی قبول نہیں ہے۔ یہ ٹاپک کلوزڈ سمجھیں۔" وہ تیزی سے اندر چلا گیا۔ مسز عبداللہ خاموش کھڑی رہ گئیں۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے بیا کو ایک میسج کر دیا۔

"زندگی میری بھی اداس ہے۔ مام کو منا نہیں پارہا اس لیے خاموش ہوں۔ دعا کرو، وہ مان جائیں۔"

وہ اسے مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا میسج دیکھ کر بیا کی جان میں جان آئی۔ پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پہ عود کر آئی کہ شکر وہ اسے یاد تھی۔ پھر دل سے دعا کی کہ واسع کی مام مان جائیں۔

☆☆☆

اگلے دو دن وہ کمرے سے بالکل نہیں نکلا۔ نوکروں نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ اس نے کھانا تک نہیں کھایا۔ بالآخر انہیں اس کے کمرے کا دروازہ کھلوانے کے لیے کہنا ہی پڑا۔

"پلیز واسع! باہر نکلو۔ کھانا کھالو۔ ماں کو یوں مت ستاؤ۔ تم جہاں لے کر جانا چاہتے ہو، میں چلوں گی۔ اس وقت باہر نکل کر کھانا کھالو۔" تب ہی اس نے دروازہ کھول دیا۔

اس کی بڑھی ہوئی شیو، آنکھوں کے گرد پڑے حلقے انہیں بے چین کر گئے۔

"چلو کھانا کھاؤ اور یہ اپنا حلیہ درست کرو۔ پتا نہیں کیا بنے پھر رہے ہو۔" اس کی ضد کے سامنے جھکنا ان کی انا کے خلاف تھا لیکن وہ اسے ایسے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

واسع نے کمرے سے نکلنے سے پہلے بیا کو میسج کیا۔

"مام مان گئی ہیں۔ وہ کل تمہاری طرف آرہی ہیں۔ امی جان کو بتادو۔" میسج پڑھ کر بیا نے سب کچھ امی جان کو بتانے کا فیصلہ کیا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن مسز عبداللہ واسع کے بتائے وقت کے عین مطابق پہنچ گئیں۔ ساڑھی میں ملبوس، بالوں کا جوڑا بنائے، فل میک اپ اور نازک سی جیولری میں وہ خاتون کسی سلطنت کی ملکہ لگتی تھیں۔ بیا نے کھڑکی سے انہیں دیکھا اور دم بخود رہ گئی۔ وہ واسع کی مام نہیں اس کی بڑی بہن لگتی تھیں۔ ان کی پرسنالٹی میں عجیب طرح کا طلسم تھا جس کے سامنے بیا کو اپنا آپ اور اپنا گھر سب بودا لگ رہا تھا۔ مزمل انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر گیا تھا اور تب تک وہ اس کے گھر کے در و دیوار کا جائزہ لیتی رہیں۔

امی جان نے تو بہت پرتپاک انداز میں ملنا چاہا لیکن وہ اپنی جگہ سے کھڑی تک نہیں ہوئیں۔ امی جان کو ان کا یہ انداز برا لگا تھا۔ جب رشتہ جوڑنے ہی آئی تھیں تو اتنا تکبر کیسا۔

"بیا نے مجھے کل ہی بتایا ہے واسع کے بارے میں۔" امی جان نے بہت اپنائیت سے کہنا شروع کیا۔

بیا نے بھی بس اتنا بتایا تھا کہ اس کا ایک کلاس فیلو اپنی مام کو رشتے کے لیے بھیجنا چاہتا تھا۔ واسع کا ذکر کئی بار بیا کے منہ سے بطور کلاس فیلو سن چکی تھیں لیکن انہیں کبھی نہیں محسوس ہوا تھا کہ معاملہ اس نہج پہ پہنچ جائے گا۔

"اچھا!!!!" مسز عبداللہ نے کچھ طنزیہ انداز سے کہا۔ جتنا ان کا بیٹا بے چینی دکھا رہا تھا یہ کوئی چلتی پھرتی پسند نہیں تھی۔ وہ بالکل یقین نہیں کر سکتی تھیں۔

"واسع نے مجھے بتایا تھا کہ ثوبیہ کے فادر گورنمنٹ آفیسر تھے۔ کس گریڈ میں تھے؟" انہوں نے امی جان سے پوچھا۔

"سیونٹین گریڈ میں تھا سلیمان جب شہید ہوا۔ بیا کے دادا بھی ریٹائرڈ آفیسر تھے۔ یہ گھر انہوں نے ہی بنایا تھا۔"

"تو ثوبیہ کے کوئی اور تایا چاچا۔ میرا مطلب ہے آپ کے کوئی اور بیٹے یا بیٹی؟"

"اکلوتا تھا سلیمان۔ ثوبیہ ہی میری کل کائنات ہے۔" انہوں نے سر ہلایا۔

"وہ لڑکا جو مجھے اندر لایا۔ وہ ملازم تو نہیں لگتا۔کوئی رشتے دار ہے؟" ان کا اشارہ مزمل کی طرف تھا۔

"وہ میری بھتیجی کا بیٹا ہے۔اس کے والد فوت ہو گئے اور ماں کے دوسرے شوہر نے اسے رکھنے سے انکار کر دیا تو میں نے ہی اسے پالا ہے۔بس یہ دونوں بچے اس گھر کی رونق ہیں۔"

"آپ نے تو ٹھیک ٹھاک یتیم خانہ کھول رکھا ہے۔" ان کے لہجے کی حقارت پہ امی جان بری طرح چونکیں۔اس سے پہلے کہ کچھ کہتیں تب ہی بیا تیار ہو کر، چائے کی ٹرالی لیے اندر داخل ہوئی اور انہیں سلام کیا۔

انہوں نے سر ہلا کر جواب دیا اور سر تا پیر اس کا جائزہ لینے لگیں کہ یہ ان کے بیٹے کی پسند تھی اور انہیں اس کی اس پسند میں کچھ ایسا خاص نظر نہیں آیا۔ وہ ایک مڈل کلاس کی معمولی سی لڑکی تھی۔

وہ ان کے سامنے چائے رکھنے لگی تو انہوں نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے واپس آفس پہنچنا ہے۔بڑی مشکل سے وقت نکال کر آئی ہوں۔ سارے آفس کی ذمہ داری مجھ پہ ہے۔واسع کو تو ان معاملات کا پتا بھی نہیں ہے۔" وہ فوراً کھڑی ہو گئیں ۔امی جان انہیں روکنے لگیں۔بیا کے تو ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔

"لیکن بنا کچھ کھائے پیے تو نہیں جا سکتیں۔ کچھ تو لیجیے۔"

"میں بس آپ سے ملاقات کرنا چاہتی تھی۔ وہ ہو گئی۔" اپنا بیگ اٹھائے وہ تیزی سے نکلتی چلی گئیں۔الوداعی سلام کرنے کی بھی زحمت نہیں کی۔

"عجیب خاتون تھیں۔اپنی ذات کے زعم میں ہی گرفتار لگیں مجھے۔ہمیں تو کچھ سمجھ ہی نہیں رہی تھیں ۔رشتہ کیا کریں گی؟" امی جان نے چپ چاپ سی بیا کو دیکھا جو ٹرالی کے سامنے ہی بت بنی بیٹھی تھی۔

"واسع تو ایسا نہیں ہے۔" اس کا دل واقعتاً برا ہوا تھا۔واسع نے تو کہا تھا کہ وہ مان گئی ہیں لیکن ان کے انداز سے تو نہیں لگتا تھا۔امی جان نے اس کا سر تھپکا۔وہ اس سے کچھ بھی کہہ کر اس کا دل مزید برا نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

☆☆☆

مسز عبداللہ رستے میں تھیں جب واسع کی کالز پہ کالز انہیں جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھیں۔اس کی بے چینی انہیں سخت بری لگ رہی تھی۔آخر اس لڑکی میں ایسا تھا ہی کیا کہ ان کا بیٹا اتنا پاگل ہوا جا رہا تھا۔ انہوں نے جان کر اس کی کال اٹینڈ نہیں کی۔گو انہیں آفس جانا نہیں تھا لیکن وہ بلاوجہ آفس چلی گئیں۔

رات گھر بھی دیر سے لوٹیں تو واسع بے چینی سے لان میں ہی بیٹھا تھا۔جست لگا کر ان کے پاس آیا۔

"مام! آپ کو میں نے کتنی کالز کیں لیکن آپ نے نہیں اٹھائیں۔ادھر بیا کو بھی کالز کرتا رہا وہ بھی نہیں اٹھا رہی تھی۔سب ٹھیک تو رہا نا؟" وہ اس کی بے چینی، اس کا اضطراب سب دیکھ رہی تھیں۔

"سب ٹھیک تھا۔" جواب دے کر وہ اندر بڑھ گئیں۔

"آپ کو بیا کیسی لگی؟" ان کے پیچھے پیچھے چلتے اس نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" جواب کوئی ایسا حوصلہ افزا نہیں تھا۔

"مام! وہ بہت اچھی ہے۔کیا وہ آپ کو پسند نہیں آئی؟" وہ اس کی طرف مڑیں اور سنجیدگی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"اگر میں کہوں کہ نہیں تو کیا تم اپنا فیصلہ بدل لو گے؟" اس کا چہرہ تاریک ہوا تھا۔

"آپ منع کریں گی تو میں فیصلہ بدل لوں گا مام! لیکن پھر کسی سے بھی شادی نہیں کروں گا۔" وہ کتنی دیر اس کا اترا چہرہ دیکھتی رہیں اور پھر مسکرا دیں۔

"میں مذاق کر رہی تھی۔اچھی لڑکی ہے بیا۔"

ان کے جملے نے جیسے واسع میں جان بھر دی تھی۔

"مام، آپ نے تو میری جان نکال دی۔" وہ خوشی سے آگے بڑھ گیا۔

"اور تم نے میری۔" وہ زیر لب بڑبڑائیں اور چہرہ پھر سے سپاٹ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

دو ہفتے بعد سیدھا نکاح کی تاریخ کے لیے مسز عبداللہ نے ہی کہا تھا۔ گو وہ دوبارہ سے بیا کے گھر نہیں گئی تھیں اور انہوں نے امی جان سے فون پہ ہی معاملات طے کر لیے تھے۔ اپنی آفس کی مصروفیات کا بہانا بنا کر وہ ایک طرف ہو گئی تھیں اور واسع کو بیا کے ساتھ شاپنگ پہ لگا دیا تھا کہ بچے اپنی پسند سے سب خود دیکھ لیں۔ امی جان سے ملنے واسع گھر گیا تھا۔ انہیں واسع پسند آیا تھا۔ بس دل میں مسز عبداللہ کو لے کر ذرا سا دھڑکا تھا لیکن بیا کی خوشی کے لیے وہ خاموش ہو گئیں۔

"تمہیں واسع کیسا لگا مزمل؟" اس دن جب بیا واسع کے ساتھ شاپنگ کے لیے نکلی تھی تو امی جان مزمل کے ساتھ بیٹھی نکاح کے اخراجات لکھ رہی تھیں۔

"اچھا لڑکا ہے۔" اس کا انداز سپاٹ تھا۔

"اچھے تو تم بھی بہت ہو مزمل! پھر تم کیوں نہیں؟" انہوں نے بغور اسے دیکھا۔ وہ اپنی جگہ ٹھٹکا۔

"لیکن تم نے بیا کو کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔" اس نے نظریں جھکا لیں۔ وہ انہیں کیا بتاتا کہ اس چھت تلے اس کا وجود ایک ایسے انسان کا تھا جو ان کے احسانوں تلے دبا ہوا تھا۔ جسے اس کی ماں بچپن سے بار بار ایک بات ہی کہتی تھی کہ مزمل میری! پھپھو نے تمہیں سہارا دیا ہے، کچھ ایسا بھی مت کرنا کہ میرا سر شرم سے ان کے سامنے جھک جائے۔ اس نے ماں کے کہے کا ہمیشہ مان رکھا اور سر جھکائے ہی رکھا۔ خود کو اس گھر کے فرد سے اس نے نوکر بنا ڈالا تھا جس کا کام بس جی حضوری کرنا تھا۔ وہ کیسے گھر کا فرد ہو سکتا تھا۔ وہ بھلا بیا کی تمنا کیسے کر سکتا تھا۔

"میں ہمیشہ سے سوچتی تھی کہ تم اور بیا ہمیشہ ساتھ رہو گے جیسے بچپن میں ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔" وہ پہلی بار یوں اس سے دل کی بات کہہ رہی تھیں۔

"میرا اس سے احترام کا رشتہ ہے امی جان!" انہوں نے اسے بغور دیکھا۔

"تم دونوں تو بہترین دوست تھے۔"

"وہ بچپن تھا جو گزر چکا ہے۔" اس نے جلدی سے کلکولیٹر سے جمع تفریق شروع کر دی۔ امی جان نے سر ہلایا۔ شاید بچپنا ہی تھا جو وہ ایسی خواہش رکھتی تھیں۔

☆☆☆

"بس یہیں روک دو۔" گھر سے چند قدم کے فاصلے پہ ہی واسع نے گاڑی روک لی۔ گلی دو دن سے ایک طرف سے کھدی ہوئی تھی۔ پائپ لائنز بچھائی جا رہی تھیں۔

"یہاں کیوں؟ آگے پیدل جاؤ گی کیا؟"

"مجھے عادت ہے واسع عبداللہ پیدل چلنے کی لیکن آپ کی مہنگی قیمتی گاڑی ان مٹی کی پہاڑیوں پہ چڑھ کر جائے گی تو گندی ہونے کے ساتھ ساتھ خراب بھی ہو جائے گی۔ پھر آپ دو ہفتے تک مجھے باتیں ہی سناتے رہیں گے کہ آپ کی پیاری لاڈلی گاڑی میری وجہ سے خراب ہو گئی۔" وہ اپنا بیگ گود میں رکھ کر اترنے کے لیے تیار تھی۔

"اب اتنا بھی ظالم نہیں ہوں۔" وہ مسکرانے لگا۔

"چلو یہ تو مانتے ہو کہ تھوڑا سا ظالم تو ہو۔" مسکراتے ہوئے دروازے کا لاک کھولنے لگی۔

"سنو۔" بیا نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"فون پر بات کرو گی نا؟" بیا ہنس دی۔

"امی جان نے سن لیا تو رخصتی تک بات چیت بالکل بند ہو جائے گی۔"

"اتنا پاگل نہیں ہوں کہ ان کے سامنے کچھ کہوں گا۔" بیا نے مسکراتے ہوئے بائے کیا۔

"اچھا سنو تو۔ آئی لو یو۔" بیا اس اظہار پہ تھوڑا

جھینپی۔

''بائے واسع۔'' وہ پیچھے سے چلایا۔

''جواب تو دیتی جاؤ۔'' بیا نے ہاتھ لہرایا اور گلی میں داخل ہو گئی۔ سامنے مٹی کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں تھیں لیکن اتنی بڑی نہیں کہ ان پہ گاڑی نہ چڑھ سکتی۔ واسع مسکراتے ہوئے گاڑی موڑ رہا تھا جب اس نے دیکھا کہ ایک وین تیزی سے اس مٹی کی ڈھیریوں پہ چڑھتی ہوئی بیا کے قریب سے گزری ۔ آن کی آن میں اس کا دروازہ کھلا اور دو ہاتھوں نے بیا کو تیزی سے اندر کھینچا اور یہ جا وہ جا۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ واسع کچھ دیر تو سمجھ ہی نہیں سکا کہ ہوا کیا تھا اور جب پتا چلا تو وین گلی کے اندھیرے میں گم ہو گئی تھی۔

''بیا۔ او مائی گاڈ۔ بیا۔ نو۔ نو۔ نو۔ نو۔'' اس کے ہاتھ پیر پھول رہے تھے۔ اس نے جلدی سے گاڑی موڑی۔ مٹی کی ڈھیریوں پہ سے گاڑی چڑھاتے ہوئے اسی سمت بھگائی جہاں وہ وین غائب ہوئی تھی۔ کتنی دیر وہ گاڑی بھگاتا رہا لیکن وین نجانے کہاں غائب ہوئی تھی کہ پھر اس کا سراغ نہیں مل سکا۔ آگے گلی کئی ذیلی گلیوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ شاید وین ان میں سے کسی گلی میں چلی گئی تھی۔ اس سے آگے مین روڈ تھی۔

واسع نے گاڑی مین روڈ پہ ڈال کر بھگائی کہ شاید وہ وین اسے کہیں دکھائی دے جائے لیکن نہیں۔ وہ اب بیا کے موبائل پہ کال کرنے لگا۔ موبائل پہ بیل جا رہی تھی لیکن لی نہیں گئی۔ پاگلوں کی طرح گاڑی بھگاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھتا رہا کہ شاید وین دکھائی دے جائے لیکن نجانے وہ اتنی جلدی کہاں غائب ہو گئے تھے۔

اگلی دفعہ بیا کا نمبر ملانے پہ نمبر بند جا رہا تھا۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ سردیوں میں تو یوں بھی رات جلدی ہو جاتی تھی۔

''مام۔'' اس کے ذہن میں آیا کہ اسے ماں سے رابطہ کرنا چاہیے۔ وہ اس کی ضرور کچھ نہ کچھ مدد کر سکتی تھیں۔

ان کے موبائل پہ بیل جا رہی تھی لیکن انھوں نے اٹینڈ نہیں کی۔ گاڑی گھر کی طرف بھگا دی۔ اسے جلد از جلد گھر پہنچ کر مام کو سب بتانا تھا تاکہ وہ اپنے کانٹیکٹ استعمال کر کے پولیس کو مطلع کر سکیں۔ ابھی وہ آدھے رستے میں تھا کہ بیا کے گھر کے نمبر سے کال آنے لگی۔

''اونو۔ میں ان کو کیا کہوں؟'' یقیناً وہ امی جان تھیں جو بیا کا نمبر بند ہونے کی صورت میں اسے کال کر رہی تھیں۔

واسع نے موبائل بجنے دیا۔ اس میں انہیں بتانے کی ہمت نہیں تھی کہ بیا اغوا ہو چکی تھی۔

گھر پہنچتے ہی وہ مام کے کمرے کی طرف دوڑا۔ وہ کمرے میں نہیں تھیں اور موبائل کمرے میں ہی تھا۔ انہیں آوازیں دیتا ہوا وہ اسٹڈی میں گیا۔ وہ مزے سے بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔

''مام! وہ بیا۔'' اس کے چہرے کا اڑا ہوا رنگ اور چھوٹتے پسینے دیکھ کر مسز عبداللہ کچھ حیران ہوئیں۔

''بیا؟ کیا ہوا بیا کو؟'' اپنی کتاب بند کرتے وہ پوری طرح الرٹ ہو گئیں۔

''مام پلیز! آپ پولیس سے کانٹیکٹ کریں۔'' سب کچھ بتانے کے بعد وہ رو دینے کو تھا۔

''کول ڈاؤن۔ میں بات کرتی ہوں ڈی ایس پی کرامت سے۔ اپنے آپ کو سنبھالو واسع! کچھ نہیں ہو گا بیا کو۔ میں اسے کچھ نہیں ہونے دوں گی۔'' وہ اٹھیں اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف گئیں۔ رات کے گیارہ ہو رہے تھے لیکن اس بات کی پرواہ کیے بغیر وہ اور ڈی ایس پی کرامت کو کال ملانے لگیں جن سے ان کے پرانے فیملی ٹرمز تھے۔

واسع کے موبائل پہ پھر سے بیا کے گھر سے کال آنے لگی۔ آخر اتنی رات ہو گئی تھی۔ وہ کب تک بیا کی دادی سے یہ سب چھپا سکتے تھے۔

''ہیلو۔'' بہت ہمت کر کے واسع نے کال اٹھا لی۔ دوسری طرف امی جان کے بجائے مزمل تھا۔

''واسع! امی جان فکر مند ہیں کہ رات بہت ہو گئی ہے اور بیا ابھی تک باہر ہے۔ آپ اسے کب تک گھر چھوڑیں گے۔؟''

''مزمل۔ میری بات غور سے سنو۔ بیا کو میں نے گھر کے باہر اتارا تھا لیکن وہ گھر کے باہر سے کیڈ نیپ ہو گئی ہے۔'' مزمل اپنی جگہ اچھلا۔

''واٹ؟''

''مجھے نہیں پتا کہ اس معاملے کو تم کیسے ہینڈل کرو گے لیکن امی جان کو کچھ اس طرح بتاؤ کہ وہ ریلیکس رہیں۔ میں اور مام پولیس سے بات کر رہے ہیں۔ وہ جلد مل جائے گی۔ ہم اس کا نمبر ٹریس کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پلیز تم وہاں ہینڈل کر لینا۔'' اس سے زیادہ اس سے کچھ کہا نہیں گیا اور اس نے کال کاٹ دی۔

''میری ڈی ایس پی کرامت سے بات ہو گئی ہے۔ امید ہے کہ جلد پتا لگ جائے گا۔ اب ان لوگوں کی طرف سے رابطہ ہو تو کچھ پتا چلے کہ ان کا مقصد کیا ہے۔''

''آپ کو لگتا ہے کہ رینسم (تاوان) کے لیے وہ کال کریں گے؟'' واسع نے ماں کی صورت دیکھی جو کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔

''اور کیوں کیڈ نیپ کیا ہوگا؟ بھلا بیا سے انہیں اور کوئی فائدہ ہو بھی کیا سکتا ہے؟''

''آپ جانتی ہیں آج کل لوگوں کا اور مقصد کیا ہو سکتا ہے؟'' وہ اس کی بات کی تہہ تک پہنچیں اور شاکڈ سی اسے دیکھنے لگیں۔

''دعا کرو کہ ایسا کچھ نہ ہو۔ پیسے دے کر کسی کو چھڑایا جا سکتا ہے مگر ایک بار عزت چلی جائے تو۔'' انھوں نے جھرجھری لی۔ واسع نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ اس کی ہونے والی بیوی تھی کوئی دوست یا محبوبہ نہیں کہ وہ اس پہلو کو نظر انداز کر دیتا۔ ایک مرد کے لیے یہ سوچنا بھی عذاب ہے۔

☆☆☆

دوسری طرف مزمل کتنی دیر فون ہاتھ میں لیے کھڑا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ امی جان کو کیا بتائے اور کیا بہانا کرے۔

''امی جان۔ واسع کی مام کی کال تھی۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ بیا آج رات ان کی طرف رک رہی ہے۔'' فوری طور پہ اسے یہی سمجھ آسکا۔

امی جان تو بارے حیرت کے گنگ رہ گئیں۔

''دماغ تو نہیں خراب ہو گیا اس لڑکی کا۔ وہ وہاں کیسے رک سکتی ہے۔؟'' وہ غصے سے دھاڑیں۔

''اصل میں واسع کے کچھ کزنز باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ وہ سب مل کر رات میں کوئی مووی دیکھنا چاہتے ہیں۔ ابھی بھی وہاں کوئی پارٹی چل رہی ہے تو اسی لیے واسع کال نہیں اٹھا رہا تھا اور بیا کا موبائل بھی ڈیڈ ہے۔ مسز عبداللہ نے کہا کہ سب بچے اکٹھے ہیں تو انھوں نے بیا کو بھی روک لیا۔ واسع کے انکل آنٹی بھی آئے ہوئے ہیں۔ سب ہیں امی جان، اسی لیے آنٹی نے بیا کو بھی روک لیا۔''

''بالکل ممکن نہیں ہے یہ کہ جوان لڑکی رات کو گھر سے باہر رہے۔ تم انہیں کال ملاؤ۔ میں بات کروں گی کہ بیا کو گھر چھوڑ کر جائیں۔ ہمارے خاندان میں ایسا نہیں ہوتا۔''

''امی جان۔ آنٹی نے اسے روکا ہے۔ اب وہ آنٹی کو کیسے منع کرے۔ وہ اس کی ساس ہیں۔ اور واسع کوئی غیر تو نہیں ہے نا۔ پرسوں نکاح ہے ان کا۔ اس نے اسی گھر میں رخصت ہو کر جانا ہے۔ ان لوگوں کی عزت ہے اب وہ۔''

''ارے کیسے عجیب لوگ ہیں۔ مادر پدر آزاد۔ ایسا کہاں ہوتا ہے کہ لڑکی شادی سے پہلے سسرال میں جا کر رات ٹھہر جائے۔ اور بیٹا! ابھی وہ رخصت ہو کر گئی نہیں ہے۔ اسی لیے ابھی ہمیں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہوگا۔ ایک بار رخصت ہو گئی تو جو جی میں آئے کرے۔'' ان کی تو جان اٹکی ہوئی تھی۔ مزمل نے ان کا ہاتھ تھاما۔

''امی جان! آپ مت پریشان ہوں۔ کل وہ اسے چھوڑ جائیں گے آنٹی نے وعدہ کیا ہے۔ جو کچھ

بھی ہے، وہ اس گھر کی ہونے والی بہو ہے۔ اگر وہ اس پہ اپنا حق جتاتے ہیں تو ہم انہیں منع نہیں کر سکتے۔ میرے خیال میں ہمیں ان لوگوں پہ اتنا بھروسا تو کرنا پڑے گا۔" امی جان بے چین تھیں۔ انہیں یہ سب معاملہ بالکل ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔

"میں اب جلد از جلد رخصتی کا کہتی ہوں مسز عبداللہ سے۔ یہ طور طریقے مجھے پسند نہیں ہیں۔ اپنی امانت جتنی جلدی ہو لے جائیں۔ اس طرح میں اسے یہاں نہیں رکھ سکتی۔" وہ اٹھیں تو مزمل انہیں ان کے کمرے تک چھوڑنے ساتھ گیا۔

اس نے لاؤنج کی لائٹ آف کر دی تاکہ امی جان اسے جاگتا دیکھ کر پریشان نہ ہوں لیکن وہ بے چینی سے لاؤنج کی کھڑکی کے آس پاس ہی منڈلا رہا تھا۔ واسع کی طرف سے کوئی کال نہیں آئی۔ بے چینی بڑھ گئی تو اس نے میسج کر دیا۔

"بیا کا کچھ پتا چلا؟" دوسری طرف سے میسج نہیں دیکھا گیا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔

رات دو بجے کے قریب اسے واسع کا جواب آیا تھا۔

"ابھی تک کچھ نہیں پتا چلا۔ سرچ آپریشن جاری ہے۔ دعا کرو۔" اور وہ اسے کیا بتاتا کہ وہ تو سراپا دعا بنا ہوا تھا۔ واسع اور بیا کا ساتھ تو یونی ورسٹی کے چند سالوں پہ محیط تھا لیکن وہ اور بیا تو بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ بیا کا اسے نہیں پتا تھا لیکن وہ بیا کے بغیر ادھورا تھا اور اس بات کو وہ خود سے بھی جھٹلاتا تھا۔

صبح کے پونے چھ ہو رہے تھے۔ دسمبر کی صبح تھی تو ابھی باہر اندھیرا ہی تھا لیکن وہ پھر بھی اپنا سویٹر پہنتا ہوا باہر نکلا۔ امی جان بیٹھی قرآن کی تلاوت کر رہی تھیں انہوں نے اسے باہر جاتے دیکھ کر کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ ان کے گھر میں نہیں رہتا تھا۔ اس کے لیے گھر کے اوپری حصے میں ایک کمرہ مختص تھا جس کا راستہ پیچھے سیڑھیوں سے تھا۔

گیٹ کے پاس پڑے اخبار اٹھاتے ہوئے اسے گیٹ کے نیچے سے کچھ دکھائی دیا۔ کچھ غور کرنے پہ اس کی سانس اٹک گئی۔ یہ کپڑے، وہ ان کو اچھی طرح سے پہچانتا تھا۔ اس نے لپک کر گیٹ کھولا تو گیٹ کے بالکل سامنے بنی سلوپ پہ بیا پڑی تھی۔ مزمل بالکل شاکڈ رہ گیا۔ اتنی ٹھنڈ میں نجانے وہ کب سے وہاں بے ہوش پڑی تھی۔

"بیا۔ بیا۔" اس نے اسے سیدھا کیا اور اس کے گال تھپکے۔ اس کے چہرہ کے ایک طرف ہلکا سا زخم تھا اور جسم پہ موجود لباس ایک طرف سے پھٹا ہوا تھا۔ گرم کپڑوں کے نام پہ بس ایک چادر تھی جو ایک طرف پڑی تھی۔ اس نے جھٹ سے وہی اس پہ اوڑھا دی اور ارد گرد دیکھنے لگا۔ گلی سنسان تھی۔ پیلی اسٹریٹ لائٹس جل رہی تھیں۔

"بیا۔ اٹھو بیا۔" وہ اسے سہارا دینے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ بالکل ساکت تھی۔ مزمل نے اس کی نبض چیک کی اور طمانیت بھرا ایک سانس خارج کیا۔ پھر اپنی پوری طاقت لگا کر اسے اٹھایا اور گیٹ سے اندر لایا۔ سامنے پڑی لان کرسیوں پہ اسے بٹھانے کی کوشش کی اور بھاگ کر گیٹ بند کر دیا۔ صد شکر تھا کہ لاؤنج کی کھڑکیوں پہ پردے تھے ورنہ ان جہازی سائز کھڑکیوں سے باہر کا منظر دیکھ کر امی جان پہ کیا گزرتی۔

اب وہ بیا کو اس حال میں اندر کیسے لے کر جاتا۔ امی جان کی نظروں سے بچا کر اسے کیسے اس کے کمرے تک پہنچاتا۔ اس کا حل صرف ایک ہی تھا۔

بیا کو دوبارہ سے اسی طرح اٹھا کر اوپر جاتی سیڑھیوں پہ چڑھنا شروع کیا جو اس کے کمرے تک جاتی تھیں۔ اپنے بیڈ پہ اسے لٹا کر وہ اپنا لحاف اس پہ ڈال چکا تھا۔ وہ اب بھی مکمل بے ہوش تھی۔ مزمل نے اس کے گال تھپکے اسے کئی بار آوازیں دیں لیکن شاید وہ سکون آور ادویات کے زیر اثر تھی اسی لیے اس کا کوئی ریسپانس نہیں تھا۔ اس کا دل سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا کہ نجانے اغوا کاروں نے اس کے ساتھ کیا کیا ہو۔

وہ اسے سوتا چھوڑ کر نیچے آیا تھا۔ امی جان ہنوز قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھیں۔

"جیسے ہی کچھ روشنی ہو، مسز عبداللہ سے کہو کہ بیا کو گھر بھجوا دیں۔" تلاوت سے فارغ ہو کر انھوں نے مزمل کو دیکھتے ہوئے کہا جو چوری چھپے بیا کے کمرے سے اس کا سویٹر نکالنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ امی جان سے بات کرتے اس نے سویٹر پیچھے چھپا لیا۔

"جی۔ میں بات کرتا ہوں۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔" امی جان نے ادھر ادھر دیکھا۔ قرآن پاک کے بعد وہ اخبار پڑھا کرتی تھیں۔

"اخبار نہیں لائے۔" باہر سے اخبار اٹھا کر لانا اس کی ذمہ داری تھی۔ بیا کے چکر میں وہ اخبار اٹھا کر اندر لانا بھول گیا تھا۔

"میں لاتا ہوں۔" وہ تیزی سے باہر لپکا مبادا امی جان کہیں اس کے ہاتھ میں سویٹر دیکھ ہی نہ لیتیں۔

سویٹر وہ وہیں باہر چھوڑ کر اخبار امی جان کے حوالے کر کے اوپر کمرے میں چلا گیا۔ وہ ابھی تک اسی طرح بے سدھ پڑی تھی۔ مزمل نے اس کا سویٹر وہیں رکھا اور الجھا ہوا سا اپنا فون لیے نیچے آیا۔ اب کیا کروں، کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

تب ہی اس کے موبائل پہ ایک نامعلوم نمبر سے ویڈیو موصول ہوئی جسے کھولتے ہی اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ گھر کے سامنے ایک وین رکی اور اس میں سے دو نقاب پوشوں نے بیا کو اٹھا کر گھر کے سامنے پھینکا اور وین لے کر چلے گئے۔ کون تھے یہ لوگ اور ان کا کیا مقصد تھا۔ وہ کوئی بلیک میلرز تھے اور نجانے ان کے پاس بیا کی کیسی ویڈیوز ہوں۔ اس کا دل لرزنے لگا تھا۔ اللہ نہ کرے کہ ایسا کچھ بھی ہو۔ اس کو ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔

☆☆☆

مسز عبداللہ آفس کے لیے معمول کے مطابق تیار ہو کر ڈائننگ ٹیبل پہ آئیں تو سامنے صوفے پہ واسع نڈھال سا پڑا تھا۔ شاید وہ ساری رات ادھر ہی لیٹا رہا تھا۔

"واسع! تم سوئے نہیں ہو؟" اس کی سرخ ہوتی آنکھیں انہیں پریشان کر رہی تھیں۔

"مام! آپ کی بات ہوئی ایس پی کرامت سے؟" وہ ماں کو دیکھ کر ان کی طرف بڑھا تھا۔

"تم سکون سے ناشتہ کرو۔" انھوں نے اسے بیٹھنے کو کہا۔

"مام۔ بیا غائب ہے اور آپ کہہ رہی ہیں، میں ناشتہ کروں۔ میں ٹھیک سے سو نہیں سکا۔ حلق سے پانی نہیں اتر رہا میرے۔" مسز عبداللہ نے اپنی پلیٹ میں سلائس نکالے اور ان پہ مکھن لگانے لگیں۔

"وہ گھر پہنچ چکی ہے۔" واسع اپنی جگہ اچھل پڑا۔

"آپ کو ایس پی کرامت نے بتایا ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے نا؟ وہ اسے چھڑا کر لائے ہیں۔" اپنے سامنے رکھی پیالی میں مسز عبداللہ نے چائے نکالی اور ساتھ پڑا موبائل اس کے سامنے کر دیا جہاں ایک ویڈیو تھی۔ اسے دیکھتے ہی واسع اپنی جگہ سے ہل نہیں سکا۔

"یہ اب تم اسی سے پوچھو کہ وہ ٹھیک تو ہے؟ رات کی تاریکی میں ایک لڑکی کو چند بدمعاش گیٹ کے سامنے چھوڑ جاتے ہیں۔ انھوں نے رات بھر اسے اپنے پاس رکھا۔ یہ تو وہی بتا سکتی ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔" ان کے الفاظ کی سفاکی پہ واسع تڑپ اٹھا۔

"مام پلیز، یوں مت کہیں۔"

"ابھی میں کہہ رہی ہوں۔ کل ساری دنیا کہے گی تو کس کس کے منہ بند کرو گے۔"

"مام۔" وہ ساکت سا ماں کو دیکھنے لگا۔ وہ اب سکون سے ناشتہ کرنے لگیں لیکن واسع کا سارا سکون برباد ہو گیا تھا۔

☆☆☆

مزمل نے نجانے کتنی بار اس ویڈیو کو دیکھا تھا۔

گو اس میں ایسا کچھ نہیں تھا لیکن یہی ویڈیو اگر وائرل کر دی جاتی تو سب جان جاتے کہ بیا اغوا ہوئی تھی اور آگے کیسے سوالات ہونے تھے، سوچ کر اسے جھرجھری آگئی۔ تب ہی اسے واسع کے نمبر سے کال آنے لگی تھی۔

"بیا گھر آگئی ہے؟" واسع نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ مزمل نے ہوں کہا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ ایسی کوئی گفتگو گھر میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"اس کی حالت ٹھیک ہے؟" مزمل نے گہرا سانس لیا۔

"ابھی بے ہوش ہے۔ صرف ماتھے پہ ہلکا سا زخم ہے جیسے کسی چیز سے ضرب لگائی ہو۔" یکدم وہ ٹھٹکا۔

"آپ کیسے جانتے ہیں کہ وہ گھر آگئی ہے؟"

"مجھے کسی ان نون (نامعلوم) نمبر سے ایک ویڈیو آئی ہے جس میں دو لوگوں نے ماسک پہنا ہوا ہے اور وہ بیا کو گھر کے سامنے اتار رہے ہیں۔" مزمل نے کرب سے آنکھیں موندیں۔ تو وہ ویڈیو واسع کو بھی گئی تھی۔

"انھوں نے اسے کیوں اغوا کیا تھا مزمل؟" مزمل چونکا۔ بھلا وہ کیسے بتا سکتا تھا کہ اغوا کاروں کا ارادہ کیا تھا۔

"نہ کوئی تاوان؟ نہ مطالبہ۔"

"اور پھر ایک رات رکھ کر چھوڑ گئے۔" واسع جیسے کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں تھا۔

"کہنا کیا چاہتے ہو؟" اسے یکدم غصہ آگیا۔

"کیا تم نہیں سمجھ رہے کہ کسی لڑکی کو اگر ایک رات کے لیے کڈنیپ کیا جائے تو کڈنیپرز کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔" مزمل اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔

"واسع ایسا کچھ نہیں ہے۔" واسع نے کچھ کہے بنا کال کاٹ دی۔ یہ کیا ہو گیا تھا۔ کل تو اس کا نکاح تھا۔ اور یہ کیا ہو گیا تھا؟ سب کچھ جیسے ریت کی طرح مٹھی سے پھسل گیا تھا۔ اپنا موبائل بیڈ پہ پٹخ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

☆☆☆

مزمل اوپر کمرے میں گیا تو بیا لحاف گردن تک تانے اس میں چھپی بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ اس کی طرف بھاگی اور لپٹ کر رونے لگی۔ مزمل نے اسے رونے دیا۔ اس وقت اسے ایک کندھے کی ضرورت تھی۔ وہ ڈری ہوئی تھی۔ حواس باختہ تھی۔ رونا چاہتی تھی۔ ایسے میں مزمل اس کے لیے مضبوط سہارا تھا۔

"بیا۔ یہاں بیٹھو اور مجھے بتاؤ کہ وہ کون لوگ تھے اور کیا چاہتے تھے؟"

اس وقت وہ بالکل اس کے لیے وہی مزمل بن گیا تھا جیسا وہ بچپن سے اس کے ساتھ تھا۔ اجنبیت کی دیوار جو اس نے قائم کی تھی، وہ گر چکی تھی۔ اسے بیڈ پہ بٹھا کر وہ اس کے سامنے نیچے گھٹنوں پہ بیٹھا تھا۔ وہ روئے جا رہی تھی اور وہ اس کی سسکیاں سنتے، لب بھینچے بیٹھا تھا۔

"پلیز کچھ تو بولو، ان کا کوئی مقصد جس کے لیے انھوں نے یہ سب کیا؟" بیا نے سر نفی میں ہلایا۔

"میں نہیں جانتی۔ وہ مجھے بے ہوش کر کے کہیں لے گئے تھے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک کرسی کے ساتھ بندھی تھی۔ کمرہ تاریک تھا۔ میرے منہ میں کپڑا تھا، ہاتھ پاؤں بندھے تھے۔ ساری رات میں اسی طرح بیٹھی رہی۔ پھر فجر کی اذان کے ساتھ دو لوگ کمرے میں آئے، ان کے منہ ڈھکے ہوئے تھے۔ مجھے انجیکشن لگایا اور کمرے سے چلے گئے۔ مجھے فوراً نیند آگئی۔ اب جاگی ہوں تو یہاں ہوں۔ میں نہیں جانتی وہ لوگ کون تھے اور کیا چاہتے تھے؟ میں انہیں نہیں جانتی۔ مزمل مجھے نہیں پتا۔"

وہ پھر سے چہرہ ہاتھوں میں گرائے رونے لگی۔

"ٹھیک ہے ریلیکس ہو جاؤ۔ کچھ نہیں ہوا ہے۔ ہم دیکھ لیں گے ان لوگوں کو۔" بیا کو یک دم خیال آیا کہ وہ اس کے کمرے میں ہے۔

"امی جان کہاں ہیں مزمل؟"

"وہ کچھ نہیں جانتیں۔ میں نے انہیں بس یہی کہا کہ واسع کی مام نے تم کو رات وہیں روک لیا ہے

آپ ان کے سامنے کچھ نہیں کہو گی۔ اس عمر میں انہیں ایسا صدمہ ملنا ٹھیک نہیں ہے۔" بیا نے روتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔ مزمل نے اسے ٹشو باکس تھمایا اور خود باہر چلا گیا۔ وہ واسع کو کال ملا رہا تھا لیکن واسع نے کال اٹینڈ نہیں کی۔ وہ لب بھینچے نیچے چلا گیا۔

☆☆☆

دوپہر تک بیا بہتر محسوس کر رہی تھی۔ مزمل نے اسے اب نیچے چلے جانے کو کہا کیونکہ امی جان اس کی غیر موجودگی سے خاصی پریشان تھیں۔ گو مزمل انہیں سمجھاتا رہا تھا کہ مسز عبداللہ سے اس کی بات ہو چکی ہے اور وہ تھوڑی دیر میں آ جائے گی لیکن ان کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ بیا کو سامنے دیکھ کر وہ جیسے جی اٹھیں۔ پہلے اسے گلے لگایا اور پھر ڈانٹنے لگیں۔

"انھوں نے روک لیا اور تم رک گئیں۔ تمہیں نہیں پتا تھا کہ ہماری فیملی میں اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔"

"مجھے معاف کر دیں۔" اسے یک دم رونا آ گیا۔ وہ جان جاتیں کہ اس پہ کیا بیت چکا ہے تو وہ تو برداشت ہی نہ کر پاتیں۔

"اچھا اب روؤ تو نہیں۔" اس کے رونے پہ وہ یک دم نرم پڑ گئیں۔

"اور یہ کیا ہوا؟" اس نے اپنا سر اچھی طرح سے ڈھانک رکھا تھا لیکن ماتھے کے پاس ہلکی سی چوٹ کا نشان تھا جو چادر کے سرکنے سے دکھائی دے رہا تھا۔

"کچھ خاص نہیں۔ سر ٹکرا گیا تھا کچن کاؤنٹر سے۔ میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔" وہ اپنی چادر درست کرتی کمرے کی طرف چلی گئی۔ امی جان کچھ پریشان سی اسے جاتا دیکھنے لگیں۔ وہ انہیں گھبرائی اور کچھ عجیب سی لگی تھی۔ ان کا دل ہولنے لگا جیسے کہیں کچھ ہوا ہو۔

بیا نے واسع سے رابطہ کرنے کی کئی بار کوشش کی لیکن بیل جانے کے باوجود وہ کال نہیں اٹھا رہا تھا۔ اس نے بالآخر میسج کیا۔

"واسع! میں خیریت سے واپس آ گئی ہوں۔ پتا نہیں وہ کون لوگ تھے اور کیا چاہتے تھے لیکن انہوں نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ مجھے اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔ پلیز مجھ سے بات کرو۔" میسج بھیج کر وہ بستر پہ لیٹ گئی۔ کل رات سے سارا کچھ اس کے ذہن میں ایک فلم کی طرح چلنے لگا تھا۔ آنسو خود بخود بہنے لگے تھے۔

واسع نے اس کا میسج پڑھا لیکن وہ بس خاموشی سے اسے پڑھتا ہی رہا۔ اس کی کال اٹینڈ کرنے اور اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ ایک مرد تھا اور مرد کا دل میلا ہو جائے تو وہ میل مشکل سے ہی جاتا ہے۔

☆☆☆

مسز عبداللہ آفس میں تھیں جب انہیں واسع کی کالز پہ کالز آنے لگیں۔ دو بار انھوں نے نظر انداز کیا اور تیسری بار تلملا کر انہیں کال اٹھانا ہی پڑی۔

"واسع! میں ضروری پراجیکٹ پہ کام کر رہی ہوں۔ کیا ہم بعد میں بات کر سکتے ہیں؟"

"آپ آفس چلی گئی ہیں۔ آپ کیسے آفس جا سکتی ہیں مجھے یوں چھوڑ کر۔ یہاں مجھ پہ کیا بیت رہی ہے مام! کیا آپ نہیں جانتیں۔ کل نکاح ہے میرا۔" وہ جیسے بے یقینی اور بے بسی کی ملی جلی کیفیات کا شکار تھا۔

مسز عبداللہ بالکل خاموش ہو گئیں اور اسی خاموشی سے کال کاٹ دی۔ اپنے تئیں وہ یہ چیپٹر ختم کر چکی تھیں لیکن لگ رہا تھا کہ واسع اتنی آسانی سے سب نہیں جانے دے گا۔

ابھی وہ گھنٹہ بھی سکون سے کام نہیں کر پائی تھیں کہ واسع دروازہ دھاڑ سے کھول کر اندر داخل ہوا۔ ان کی سیکرٹری بھی پیچھے سے اسے روکتی ہوئی آئی جسے مسز عبداللہ نے اشارہ کر کے واپس لوٹا دیا۔

"کیا چاہتے ہو واسع؟ اب کیا چاہتے ہو؟ کیوں نہ خود سکون سے بیٹھ رہے ہو نہ مجھے بیٹھنے دے

رہے ہو؟"

"کل نکاح ہے میرا امام اور میں کس عذاب کا شکار ہوں، آپ سمجھ نہیں رہیں۔ بیا مجھے میسجز کال کر رہی ہے۔ اسے کیا کہوں؟ کیسے سامنا کروں اس کا؟"

"واسع! تم نے اپنی پسند بتائی تو میں نے اسے پورا کرنے کے لیے وہاں تمہاری بات طے کر دی۔ نکاح تک طے کر دیا۔ اب اچانک یہ حادثہ ہو گیا۔ میں نے اس پہ بھی تمہارا ساتھ دیا۔ ڈی ایس پی کرامت کو اس کیس کی انویسٹی گیشن کرنے کا کہا۔ اب وہ لڑکی ایک رات باہر رہ کر گھر آئی ہے۔ پھر ایک ویڈیو بھی کسی انجان نمبر سے ہمارے موبائل پہ ملتی ہے جس کا صاف مطلب ہے کہ کوئی ہمیں بلیک میل کرنا چاہ رہا ہے۔ میں کیسے اس لڑکی کے ساتھ اب بھی تمہارا رشتہ کرنے کا سوچ سکتی ہوں واسع؟ کیا تمہیں لگتا ہے کہ میری اس شہر میں دو کوڑی کی بھی عزت نہ رہے۔"

"مام! میں اسے بہت چاہتا ہوں۔" وہ روہانسا ہو گیا۔ بڑی مشکل سے تمام خدشوں اور واہموں کو ایک طرف کر کے آیا تھا۔ اب اس کی ماں پھر وہی سب دہرا رہی تھیں۔

"واسع! وہ لڑکی ایک رات کے لیے اغوا رہی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اس ایک رات میں اس کے ساتھ کیا ہوا۔ ؟ کون لوگ تھے جو اٹھا کر لے گئے اور ان کا مقصد کیا تھا۔ ایک عدد ویڈیو ہم دیکھ چکے ہیں۔ نجانے اور کتنی ویڈیوز ان کے پاس ہوں گی۔ میں ایسی لڑکی کو کیسے اپنے خاندان کا حصہ بنا سکتی ہوں۔؟ کل کو ایسی کوئی بھی ویڈیو سامنے آ گئی تو کیا عزت رہ جائے گی ہماری؟ اور تمہاری غیرت کہاں ہے جو ایسی لڑکی کو کھلے دل سے اپنی زندگی میں شامل کرنے پہ راضی ہو۔ محبت عزت سے آگے نہیں ہوتی۔ جب بھی دنیا تمہاری بیوی پہ باتیں کرے گی، سوال اٹھائے گی تو محبت کہیں زہر کھا کر مر کھپ جائے گی۔ پھر اسی لڑکی کی صورت سے تمہیں نفرت ہونے لگے گی۔"

ان کی بات پہ وہ سامنے پڑے صوفے پہ ڈھے گیا۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس آئیں۔ جگ سے پانی گلاس میں انڈیل کر اس کی طرف بڑھایا۔

"میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ تمہاری ماں ہوں اور ہمیشہ تمہاری بہتری کی ہی بات کرتی ہوں۔ تم وقتی خوشی کا سوچ رہے ہو لیکن میں بہت آگے کا سوچ رہی ہوں۔ میں نے دنیا دیکھی ہے، لوگوں کو پرکھا ہے۔ ایسے واقعات لوگ کبھی نہیں بھولنے دیتے۔ اور واسع! عزت کے بغیر تو انسان کسی سے کیا اپنے آپ سے نظریں بھی نہیں ملا سکتا۔ وقتی تکلیف تمہیں مستقل تکلیف سے بچا لے گی۔" وہ بہت پیار سے اس کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھیں۔

"بہتر ہے کہ تم اس لڑکی سے اب کوئی رابطہ مت کرو۔ میں خود ہی انہیں انکار کہلوا دیتی ہوں۔ جتنا تم اس کے سامنے جاؤ گے، وہ تمہیں ایموشنل بلیک میل کرے گی۔ ایسی جذباتی باتیں کر کے تمہارا دل نرم کرنے کی کوشش کرے گی۔ ہمیں اس وقت جذبات کے بجائے ہوش سے کام لینا ہے۔"

واسع کچھ دیر سر جھکائے آنسو بہاتا رہا پھر اٹھ کر سر ہلاتا آفس سے نکل گیا۔ مسز عبداللہ نے سکون کا سانس لیا اور اپنے نمبر سے بیا کے پی ٹی سی ایل کا نمبر ملانے لگیں۔

کال مزمل نے اٹھائی تھی۔

"مجھے حشمت بیگم سے بات کرنی ہے مزمل! فون انہیں دو۔" امی جان موبائل استعمال نہیں کرتی تھیں ورنہ وہ سیدھا انہیں ہی فون کر ڈالتیں۔

"امی جان سو رہی ہیں۔" مزمل نے ان کے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل ابھی قیلولہ کرنے گئی تھیں۔

"جو بھی کچھ ہوا، اس کا ہمیں افسوس ہے لیکن اب تم خود بتاؤ کہ ایسی لڑکی جو رات بھر باہر رہی ہو، اس کو کون اپنے گھر کی عزت بنائے گا؟ ہماری کچھ لوگوں میں عزت ہے، کیسے اس کو داؤ پہ لگا دیں۔" وہ

بڑے سکون اور اطمینان سے بات کر رہی تھیں۔

''کہنا کیا چاہتی ہیں آپ؟'' وہ چاہتا تھا کہ وہ کھل کر بات کریں بجائے پہیلیاں بجھوانے کے۔

''ہم یہ رشتہ نہیں کر سکتے۔ ہماری طرف سے معذرت ہے۔'' مزمل کا ایک لمحے کو سانس رک گیا۔

''کیا واسع یہ سب جانتا ہے؟''

''واسع نے ہی تو مجھے یہ سب کرنے کے لیے کہا ہے۔ غیرت مند ہے میرا بیٹا، محبت کے مقابلے عزت کو ہی چنے گا۔'' مزمل سن رہ گیا۔

''تو بیا سے کہنا کہ میرے بیٹے کا پیچھا چھوڑ دے۔ اسے میسج کر کے مت پریشان کرے۔ اب وہ سونے کی بھی بن کر آجائے گی تو میرے بیٹے کو اور مجھے قبول نہیں ہے۔'' انھوں نے کال کاٹ دی۔

مزمل کتنی دیر سناٹے کی حالت میں کھڑا رہا۔ کل اس لڑکی کا نکاح تھا جس کی تیاریاں اس نے بہت شوق سے کی تھیں اور آج یہ رشتہ ختم ہو گیا تھا۔ وہ کیسے اس خبر کو بیا کو سنائے گا۔ کیا کہے گا؟

اس نے بیا کے کمرے کے دروازے پہ ہلکی سی دستک دی۔ اندر سے اجازت ملنے پہ وہ داخل ہوا۔ سر اسی طرح جھکا ہوا تھا جیسے ہمیشہ ہوتا تھا۔

''کیا بات ہے مزمل؟'' وہ پچھلے کئی سالوں سے کبھی اس کے کمرے تک نہیں آیا تھا۔

''کچھ کہنا تھا مجھے۔ پلیز آپ بیٹھ جائیں۔'' بیا اپنے کل کے جوڑے کو الماری سے نکال کر سامنے لٹکا رہی تھی۔ وہ بستر پہ بیٹھ گئی۔ مزمل نے تکلیف سے اس لٹکے ہوئے جوڑے کو دیکھا اور پھر بیا کو۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تاثر تھا کہ بیا چونکی تھی۔

''مسز عبداللہ کی کال آئی تھی۔'' بیا چونکی۔ مزمل نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ وہ اس کے چہرے پہ تکلیف دہ تاثر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

''وہ لوگ یہ رشتہ ختم کر رہے ہیں۔'' سب کچھ تھم گیا تھا۔ سانس بھی۔

''سب کچھ واسع کی مرضی سے ہوا ہے بیا۔ وہ ہم سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا چاہتے کیونکہ ان کی عزت یہ بات آگئی ہے۔'' وہ بالکل چپ چاپ سب سنے گئی۔ مزمل نے اسے بالکل ساکت دیکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ شاکڈ تھی۔ ایک بت کی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ یک دم وہ کھڑی ہوئی۔ یوں جیسے کوئی بٹن دب گیا ہو اور اس کے سارے اعضا حرکت میں آگئے ہوں۔

''مجھے واسع سے ملنا ہے مزمل۔ میرے ساتھ چلو۔'' وہ جلدی سے اپنا دوپٹہ سر پہ اوڑھنے لگی۔

''بیا انھوں نے تمہیں واسع سے دور رہنے کے لیے کہا ہے۔''

''مجھے اس سے ملنا ہے۔ ابھی اور اسی وقت۔ تم چلو گے یا میں اکیلی چلی جاؤں۔'' مزمل کھڑا ہوا اور اس کے پیچھے نکلا۔ امی جان کو بتاتے بتاتے وہ نکل گئے۔ سارا رستہ وہ دونوں خاموش تھے۔ بیا ٹیکسی کی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ بار بار آنکھوں میں آئے آنسو سختی سے پونچھتی رہی۔ وہ اسے تسلی کیا دیتا، خود اس صورت حال سے پریشان تھا۔

اسے گیٹ پہ کسی نے نہیں روکا تھا لیکن اسے یوں اندر آتا دیکھ کر مسز عبداللہ ہڑبڑا کر اٹھیں۔ انہیں نہیں پتا تھا کہ وہ یہاں چلی آئے گی۔

''میں نے تمہیں جب بتا دیا کہ ہم کوئی رشتہ نہیں رکھنا چاہتے تو پھر تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''مجھے واسع سے بات کرنی ہے۔ واسع کہاں ہے؟'' وہ پاگلوں کی طرح اسے آوازیں دینے لگی۔

''واسع سے کیا بات کرنی ہے؟ وہ اب تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ کیا تمہیں سمجھ نہیں آتیں۔ اپنی تو عزت کی کوئی پرواہ نہیں ہے تمہیں۔ کم از کم ہماری چار لوگوں میں عزت رہنے دو۔''

''آنٹی پلیز، میرا یقین کریں میں ان لوگوں کو نہیں جانتی۔ نہ انہوں نے مجھے کوئی نقصان پہنچایا ہے۔ پھر آپ لوگ کیوں میرے ساتھ یہ کر رہے ہیں۔''

''تو کیا تمھیں گھمانے پھرانے لے گئے تھے رات گاڑی میں ڈال کر؟'' وہ نخوت سے بولیں۔

"میں کچھ نہیں جانتی آنٹی! مجھے واسع سے ملنا ہے۔" اس کا شور سن کر وہ باہر آیا تھا۔ چہرہ ستا ہوا تھا جیسے روتا رہا ہو۔

"واسع۔ واسع میری بات سنو۔ یہ آنٹی کیا کہہ رہی ہیں۔ تم یہ رشتہ ختم کر رہے ہو۔ تم کیسے یہ سب کر سکتے ہو واسع! کل ہمارا نکاح ہے۔"

وہ واسع کو دیکھتے ہی بے اختیاری سے اس کی طرف لپکی جو لب بھینچے کھڑا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے سے اجتناب کر رہا تھا۔

"نکاح تھا بیا۔ اب نہیں ہے۔" بہ مشکل اس نے یہ کہا۔

"واسع۔" وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"میں اتنا وسیع القلب نہیں ہوں کہ سب دیکھ کر بھی ان دیکھا کر دوں۔ آئی ایم سوری لیکن مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔"

بیا سن سی اسے دیکھے گئی۔ یہ اس کا واسع نہیں تھا۔ اس کا واسع ایسا نہیں تھا جو اس کا یقین نہ کرتا۔ وہ کوئی اور تھا جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"سن لیا تم نے کہ واسع تم سے رشتہ نہیں رکھنا چاہتا۔ اب پلیز جاؤ یہاں سے۔ مزید تماشا مت کرو۔" مسز عبداللہ آگے بڑھیں۔

مزمل کے لیے بیا کی ایسی توہین برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بیا کو تھام لیا۔

"چلو بیا، یہاں سے۔ جہاں قدر نہ ہو، وہاں رکنا خود کو مزید بے مول کرنا ہے۔" اس نے بیا کو ہاتھ پکڑ کر جو بالکل ساکت سی واسع کو دیکھ رہی تھی۔

"چلو بیا پلیز چلو یہاں سے۔ جو انسان مشکل میں آپ کے ساتھ نہیں کھڑا رہ سکا، وہ زندگی میں ساتھ کیسے چلے گا۔" مزمل نے اسے باقاعدہ گھسیٹا تھا۔ واسع بیا سے نظریں ملائے بغیر ہی پلٹ گیا۔

مسز عبداللہ نے ایک طمانیت بھرا سانس لیا۔ ان کے شاطر دماغ نے ایسا کھیل رچایا تھا جس سے سب کچھ ان کے حسب منشا ہو چکا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ زندگی کا اتنا اہم فیصلہ ان کا بیٹا ان کی مرضی کے خلاف کرتا۔ انھوں نے بیٹے کے سامنے وقتی ہار مان کر اب دائمی جیت حاصل کر لی تھی۔

☆☆☆

بیا! کے تو جیسے جسم میں جان ہی نہیں بچی تھی۔ مزمل اسے کیسے گھر لایا تھا وہ نہیں جانتی تھی۔ انہیں لوٹتا دیکھ کر امی جان حیرت سے انہیں دیکھنے لگیں۔

"تم دونوں کہاں گئے تھے۔؟"

"بیا تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" مزمل اسے منظر سے ہٹا کر امی جان کو اپنے طریقے سے ساری صورت حال بتانا چاہتا تھا۔ بیا کسی خودکار روبوٹ کی طرح چلتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

"سب ٹھیک ہے نا مزمل۔ بیا کو کیا ہوا؟" امی جان کو جیسے کسی انہونی کے جانے کا خوف تھا۔

"امی جان، پلیز میری بات دھیان سے سنئے گا۔ مسز عبداللہ نے یہ رشتہ ختم کر دیا ہے۔ بیا اور واسع کا نکاح نہیں ہو رہا۔" امی جان پھٹی پھٹی نگاہوں سے مزمل کو دیکھنے لگیں۔

"کل رات بیا واسع کے گھر نہیں تھی بلکہ وہ اغوا ہو گئی تھی۔" امی جان کا سانس تھم گیا۔ پھر وہ انہیں سب تفصیل سے بتاتا چلا گیا۔ امی جان وہیں بیٹھے بیٹھے چہرہ چادر میں چھپائے رونے لگ گئیں۔

"کل کی ساری تیاریاں ہو گئیں اور یکدم یہ سب کیا ہو گیا؟"

وہ خاموش تھا۔ کیا کہتا۔ کتنی دیر وہ روتی رہیں اور وہ بے بسی سے انہیں دیکھتا رہا۔ اس کے پاس انہیں تسلی دینے کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ وہ دونوں خواتین اسے بے حد عزیز تھیں شاید امی سے بھی زیادہ۔

"کون لوگ تھے وہ اور کیوں لے کر گئے بیا کو؟ کیا مقصد تھا یہ سب کرنے کا؟"

جب وہ رو کر خاموش ہوئیں تو یونہی سوچتے سوچتے کہہ گئیں۔ مزمل کے دماغ میں کل رات سے یہی چل رہا تھا اور اب حالات جس نہج پہ جا رہے تھے تو اس کی سوچ پختہ ہو چلی تھی۔

''اس سب میں بس ایک انسان کا فائدہ ہوا ہے امی جان اور وہ ہیں مسز عبداللہ جو شروع سے اس رشتے کے خلاف تھیں۔ اب دیکھیں، ان کی مرضی کے مطابق رشتہ ختم ہو گیا۔ وہی سب ہوا جو وہ چاہتی تھیں۔''

امی جان بالکل گم صم سی مزمل کو دیکھتی رہیں۔

''پتا نہیں کیوں مگر مجھے لگتا ہے کہ اس سب کے پیچھے ان کا ہاتھ ہے۔''

''کچھ باتیں قیامت تک کے لیے راز رہتی ہیں بیٹا! ان کو اللہ بھی نہیں کھولتا۔ شاید یہ راز بھی اب قیامت کے دن ہی سامنے آئے گا کہ یہ کس کا کیا دھرا تھا۔ لیکن اس دنیا میں میری بچی تو اب داغ دار ہو گئی۔ اس کا کیا بنے گا؟''

''ایک بار آپ نے مجھ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا امی جان! میں اور بیا۔'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔ امی جان کی آنکھوں میں ایک امید کا دیا ٹمٹمایا۔

''کیا اب بھی وہ ممکن ہے؟'' انہوں نے جلدی سے آنسو پونچھ کر سر ہلایا۔ ان کے چہرے پہ عجب آسودگی تھی۔

''بس پھر مجھ پہ بھروسا رکھیں۔'' انہیں تسلی دیتا وہ اٹھ کر چلا گیا۔ باہر لان میں آکر اس نے امی کو کال ملائی۔ مختصراً انہیں حالات سمجھا کر وہ ان سے کہنے لگا۔

''آپ نے ہمیشہ مجھ سے یہی کہا کہ مزمل! کچھ ایسا مت کرنا کہ مجھے پھوپھو کے سامنے نادم ہونا پڑے اور دیکھیں، میں نے کبھی ایسا کچھ نہیں کیا امی۔ کبھی آپ کا سر جھکنے نہیں دیا لیکن اب مجھے آپ سے ایک اجازت درکار ہے۔ میں بیا کو اپنانا چاہتا ہوں۔ آپ نے ایک بیڑی میرے پیر میں ڈالی تھی، اسے کاٹ ڈالیں امی۔ میں اس گھر کا نوکر یا احسان مند بن کر نہیں ایک فرد بن کر رہنا چاہتا ہوں۔ یا یوں سمجھ لیں کہ جو احسان امی جان مجھ پہ کرتی رہیں، اسے اتارنے کا یہی صحیح وقت ہے۔ مجھے بیا سے کل نکاح کرنا ہے۔ کیا اس کے لیے آپ یہاں آسکتی ہیں۔''

دوسری طرف سے جواب سن کر اس نے کال کاٹ دی اور جب مڑا تو بیا سامنے کھڑی تھی۔ وہ کس وقت اتنی خاموشی سے اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی اسے محسوس ہی نہیں ہو سکا۔

''ترس کھا رہے ہو بیا پہ۔ احسان اتار رہے ہو امی جان کا؟ عزت بچانا چاہتے ہو اس گھر کی۔ سمجھتے کیا ہو خود کو کہ کسی فلم کے ہیرو ہو جو کسی کی زندگی میں سب ٹھیک کر دو گے۔ ہاں۔؟'' اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔ تذلیل کا احساس شدت سے ہو رہا تھا۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو۔''

''میں نے خود سنا ہے مزمل۔ تمہیں مجھ پہ ترس کھانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی امی جان کا کوئی احسان اتارنے کی ضرورت ہے کیونکہ انھوں نے تمہیں اپنا سمجھ کر اپنایا تھا۔ کبھی احسان نہیں کیا ہمیشہ گھر کا فرد سمجھا ہے۔ اس لیے کوئی احسان اتارنے کے لیے اپنے کندھوں پہ میرا بوجھ مت لادو ایسے بوجھ زندگی بھر اٹھانا بڑا مشکل ہوتا ہے میرے لیے اتنی بڑی قربانی مت دو۔ اپنی زندگی خوشی سے، اپنی مرضی سے جیو۔''

''میں نہ تو آپ کا بوجھ لاد رہا ہوں نہ کوئی قربانی دے رہا ہوں۔ اور ابھی تم نے کہا کہ میں اس گھر کا فرد ہوں تو گھر کا فرد ہونے کے ناتے ہی اس گھر کی، آپ کی بھلائی کے لیے یہ قدم اٹھا رہا ہوں۔'' وہ نرمی سے کہتے ایک قدم آگے بڑھا۔

''تمہیں خود پہ یہ جبر کرنے کی ضرورت نہیں ہے مزمل! تم جس لڑکی سے دوستی نہیں کر سکتے، اس سے نکاح کیسے کرو گے؟ جس سے نظریں نہیں ملا سکتے، اسے شریک زندگی کیسے بناؤ گے؟ تم نے مجھے کسی مورت کی طرح ایک مندر میں سجا لیا ہے۔ تم میری پوجا کرتے ہو۔ مجھ سے محبت نہیں کر سکو گے۔ اور میں ایسا کوئی رشتہ نہیں چاہتی جس میں ایک انسان کو اس مقام پہ بٹھا دیا جائے جہاں وہ پوجنے لائق تو رہے لیکن محبت کے لائق نہیں۔''

مزمل کتنی دیر خاموش رہا۔ بیا اس کے سامنے سے ہٹ کر اوپر جاتی گول سیڑھیوں پہ جا بیٹھی۔

وہ اس سے بدظن تھی، اس کا یقین نہیں کر سکتی تھی کیونکہ جس کا اتنا یقین کیا تھا، اس نے بری طرح توڑ دیا تھا۔ یہی وقت تھا کہ وہ چند سچائیوں کا اعتراف کر لیتا۔ مزید دیر نہیں ہونا چاہئے تھی۔ مزید دیر دونوں کا نقصان کرتی۔

''تم بوجھ نہیں ہو بیا۔ نہ یہ کوئی قربانی ہے۔ قربانی تو وہ تھی جو اب تک میں دیتا آیا ہوں، امی کے لیے، اس گھر کی عزت کے لیے اپنی محبت کی قربانی۔'' وہ بیا کے پاس جا کھڑا ہوا۔ بیا نے چونک کر اسے دیکھا۔

''میری امی نے ہمیشہ مجھے یہی احساس دلایا ـــ کہ امی جان کا مجھ پہ بڑا احسان ہے جو مجھ یتیم کو سنبھال لیا۔ بچپن میں یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اسی لیے جو کرتا تھا اپنا حق سمجھ کر کرتا تھا لیکن جوں جوں لڑکپن کی سیڑھی چڑھتا گیا، سمجھ میں آتا گیا کہ امی ٹھیک کہتی ہیں۔ مجھ پہ امی جان کے احسانات ہی تو ہیں جو نہ ہوتے تو نجانے میں کہاں جاتا۔ کل تک تم دوست تھیں، جب احسانوں کی یہ مالا گلے میں پڑی محسوس کی تو دوستی سمٹ گئی اور احترام غالب آ گیا۔ تم اور امی جان میرے محسن تھے اور محسنوں کی عزت کی جاتی ہے، محبت نہیں۔ لیکن میں اس محبت کا کیا کرتا جو تم سے نجانے کب کی ہو چکی تھی۔

اس محبت کو اندر ہی کہیں دبا دیا۔ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی کہے کہ میں نے تمہیں استعمال کیا، تمہاری معصومیت سے فائدہ اٹھایا۔ میں جانتا ہوں کہ امی جان کے دل میں یہ خواہش ایک عرصے سے ہے لیکن میں خود کو اس گھر کے مکینوں کے سامنے اتنا بونا سمجھتا تھا کہ میں اس خواہش کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ تم واسع کو چاہتی تھیں یہ احساس تکلیف دہ تھا لیکن میں نے تمہاری خوشی کے لیے ہر تکلیف سہہ لی بیا! تاکہ تم خوش رہو۔ اب جو حالات ہیں، انہوں نے مجھے یہ فیصلہ کرنے پہ مجبور کیا ہے بیا! لیکن یہ فیصلہ نہ تو بوجھ ہے اور نہ کوئی قربانی۔

یہ اس محبت کو پا لینے کا ایک موقع ہے جو کب سے میرے دل میں تمہارے لیے تھی۔ میں بھلے تمہارا احترام کروں لیکن وہ محبت سے کہیں بہت پیچھے ہے۔ جانتا ہوں تم مجھے نہیں چاہتی ہو لیکن دوست تو سمجھتی ہو نا۔ سنا ہے کہ اچھے دوست اچھے جیون ساتھی بن سکتے ہیں۔ کیا تم مجھ کو یہ ایک موقع دے سکتی ہو؟'' بیا بالکل خاموش رہی۔

''کل تمہارا نکاح واسع سے تھا۔ اب وہی نکاح مزمل سے ہوگا تو کیا تم اس حقیقت کو قبول کر پاؤ گی؟ کیا تم مجھے اس قابل سمجھتی ہو بیا؟'' بیا کی آنکھوں سے آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے۔

''جب جب میں نے چوٹ کھائی، جو پہلا نام زبان پہ آیا وہ تمہارا تھا مزمل! چاہے وہ چوٹ جسم پہ لگی یا دل پہ۔ تم نے میرے ہر برے وقت میں مجھے تھاما ہے۔ کبھی اکیلا نہیں چھوڑا۔ تم اب بھی اس بات کی پروا نہیں کر رہے کہ مجھ سے تعلق کی صورت میں لوگ تمہاری عزت پہ بات کریں گے۔ تم نے کہا تھا کہ جہاں قدر نہ ہو وہاں سے چلے جانا بہتر ہے تو اب میں کہتی ہوں کہ جہاں قدر ہو وہاں سے چلے جانا حماقت ہے۔ اور میں ایسی حماقت نہیں کرنا چاہتی۔''

اس نے اپنے آنسو پونچھے اور اتر کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''بس آئندہ مجھے آپ مت کہنا، مجھ سے نظریں نہیں چرانا اور۔'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''اب یہ مت کہنا کہ میری عزت مت کرنا۔'' وہ ہولے سے مسکرایا۔

''ایک عورت کو مرد سے عزت محبت سے پہلے چاہیے ہوتی ہے۔ بس مجھے مورت بنا کر پوجنا مت۔''

''تو میں امی جان کو بتا دوں کہ امی کل آ رہی ہیں؟''

''اسی لیے کہا تھا کہ میرے نکاح کے لیے اچھا سا سوٹ سلوا لو۔ اب پہننا کوئی بھی سوٹ۔''

وہ مسکراتے ہوئے اندر چلی گئی تو مزمل آسودہ سا ہنس دیا۔

ختم شد

عقیلہ ہاشمی

اور ٹلے کے بدھو

"گھر کے کونوں کھدروں کی صفائی کرلو گوگی باجی آنے والی ہے۔"

"سودا سلف منگوا کے رکھو، گوگی باجی آنے والی ہیں۔"

"بچوں کو تمیز سکھاؤ، گوگی باجی آنے والی ہے۔"

گھر کے ہر فرد کی زبان پر آج کل ایک ہی جملہ تھا گوگی باجی کیا آنے والی تھیں لگتا تھا کوئی طوفان آنے والا تھا جس کے آنے سے پہلے پہلے سب کو تیاری کرنی تھی۔

گھر کا ہر بندہ روٹین کے کام کاج بھی انجام دے رہا تھا اور ساتھ میں گوگی باجی کی متوقع آمد کے لیے بھی خود کو تیار کر رہا تھا۔

گوگی باجی سال میں ایک بار گرمیوں کی چھٹیوں میں اماں کے گھر کا چکر لگاتی تھیں۔ ادھر گرمی جوبن پر ہوتی ادھر گوگی باجی اپنے آدھے درجن بچوں سمیت آن دھمکتیں۔ گھر کا شور وغل ہنگاموں میں بدل جاتا بلکہ چھوٹی چھوٹی جھڑپوں میں تبدیل ہو جاتا۔

رقیہ بیگم کی چاروں بہوویں شوہروں سمیت باجی کے استقبال میں ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جاتیں۔ سارے بھائی اپنی حیثیت سے بڑھ کر گھر کا سودا سلف ڈلواتے، باجی اور اس کے بچوں کو پر سکون نیند مہیا کرنے کے لیے گھر کا سب سے بہترین اے سی والا کمرہ دیا جاتا پھر بھی شکوے تھے کہ باجی کی زبان پر دھرے رہتے۔

"اماں میرے بچوں کو رات میں دودھ پینے کی عادت ہے، دودھ والے سے کہو۔ چار کلو دودھ دے کر جائے۔"

رقیہ بیگم جو اس کے آنے سے پہلے دو کلو دودھ کا اضافہ کر چکی ہوتیں گوگی اس پر بھی اکتفا نہ کرتی۔

"اور بانو بھابھی! ہمارے گھر میں پانی والی چائے کوئی نہیں پیتا، دودھ پتی بنتی ہے۔ دو ٹائم چائے پیتی ہوں میں اور وہ بھی یہ بڑا کپ۔"

وہ بڑی بھابھی کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے کچھ یوں ناگواری کا اظہار کرتی کہ اگلے دن انہیں خالص دودھ میں پتی بناتے بنتی۔

"اے منے! کیا بات ہے تمہارا اے سی ہوا نہیں دیتا کیا۔ اس کی اسپیڈ بڑھاؤ بھیا۔ اور سنو گھر میں بچوں کا رش بھی ذرا کم کرو، اتنے لوگوں کی موجودگی میں کولنگ کیا خاک ہوگی۔"

باجی کی فرمائشیں بڑھتی چلی جاتیں۔

سارے گھر کو ایک ٹانگ پر کھڑا کر کے بھی چین نہ آتا۔ بانو، بشریٰ، نجمہ، فرخندہ (بھابھیاں) چاروں پورا سال جہاں ساس کی چاکری میں گزارتیں تو گرمیوں کی چھٹیاں گوگی باجی کی غلامی کرتے گزر جاتیں۔ ٹی وی پر ان کے بچوں کی اجارہ داری ہوتی کچن میں ان کی پسند کے کھانے بنتے۔

ان کے بچے آتے سارے گھر کے بچوں کو ماں کی طرح آگے لگا لیتے۔ گھر کے بچے جو سارا سال مل جل کر امن امان سے رہتے۔ گوگی کے بچوں کے آتے ہی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے۔

"دیکھ لیا اماں! آپ کے ہوتے ہوئے اس گھر

میں میرے بچوں کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے۔"
ان کے بچے بھلے بھتیجے بھتیجوں کو مار مار کر بھرکس نکال دیتے پھر بھی ان کے شکوے اور نالے ختم نہ ہوتے۔
"میں تو آپ کی محبت میں چلی آتی ہوں ورنہ اپنے گھر کا سکون چھوڑ کر اتنی گرمی میں یہاں ہرگز نہ آتی شوکت تو مجھے کہہ رہے تھے، گوگی اس بار تم لوگوں کو سوات لے چلتا ہوں لیکن میں نہیں مانی۔ نہیں میں تو اپنی اماں کے گھر ہی جاؤں گی اور یہاں یہ عزت ہے میری۔"
ادھر گوگی کی آنکھ سے دکھاوے کے آنسو گرتے ادھر رقیہ بیگم سارے بچوں کو لائن حاضر کر لیتیں۔
"کان کھول کر سن لو تم لوگ یہ تو یہیں پر رہیں گے، کسی کو نہیں پسند تو کہیں اور چلا جائے۔ آئندہ اگر کسی نے انہیں ہاتھ بھی لگایا تو میں ہاتھ توڑ کر تمہاری ماؤں کے ہاتھ میں دے دوں گی۔ مہمان ہیں بے چارے چند دنوں میں چلے جائیں گے تو کیا یاد کریں گے۔"
دادی کو سراسر زیادتی کرتے دیکھ کر مائیں تو چپ چاپ کھڑی سن لیتیں لیکن بچے بول پڑتے۔
"کیوں دادو۔ ہمارے ہاتھوں کے ساتھ ان کے ہاتھ بھی تو توڑیں۔ یہ ہمارے گھر آئے ہیں انہیں یہاں آرام سے رہنا چاہیے۔
مہمان ہیں تو کیا کریں مہمان یوں دوسروں کے ناک میں دم کر کے نہیں رہتے۔"
بچوں کے جواب تو دادی کو لاجواب کرنے کو کافی ہوتے لیکن وہ رقیہ بیگم ہی کیا جو لاجواب ہو جائیں جھٹ سے زبان درازوں کو کان سے جا پکڑتیں۔



"تیری بڑی زبان چلتی ہے۔۔۔چل تجھے تو میں پہلے اس گھر سے نکالتی ہوں پھر باقیوں کو بھی دیکھ لوں گی۔"

کسی ایک کو کان سے گھسیٹتا دیکھ کر باقی سارے ڈر کے مارے سیدھے ہو جاتے۔

پورا مہینہ مائیں ہی نہیں بچے بھی بے چارے سولی پر لٹکے رہتے۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوئیں تو گوگی باجی کسی بھی وقت نازل ہو سکتی تھیں۔

پورے گھر کو چمکایا جا رہا تھا۔ بانو نرگس (کام والی ماسی) سے پچھلے دو ہفتوں سے گھر کی صفائی کروا رہی تھی وہ صبح گھر کو شیشے کی طرح چمکاتی اور دوپہر میں پھر وہی حال ہوتا۔ ماشاء اللہ سے بچوں کی فوج جدھر سے گزر جاتی ساری صفائی کا بیڑا غرق ہو جاتا۔

بشریٰ اور نجمہ نے کوفتے اور کباب بنا کے فریز کر دیے تھے۔ فرخندہ نے مشین لگا کر پورے گھر کی چادریں اور پردے دھو ڈالے گھر کو شیشے کی طرح چمکا دیا گیا تھا۔ نرگس کچن میں برتن دھوتے ہوئے بشریٰ اور نجمہ سے گوگی باجی کی ہی باتیں کر رہی تھی۔ دونوں رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں

"باجی ویسے آپ کی نند تو بالکل وہ ڈرامے والی شمیم آپا کی طرح لگتی ہے جس نے سب کو آگے لگا رکھا تھا۔" نرگس نے مثال تو اچھی دی تھی لیکن کچن کی حدود تک۔ بات اگر باہر رقیہ بیگم کے کانوں تک پہنچ جاتی تو وہ بھی شمیم سے کم نہ تھیں۔

"آہستہ بول۔۔ہماری ساس نے سن لیا تو کان سے پکڑ کر گھر سے باہر کر دیں گی۔"

نجمہ نے اپنی ہنسی دباتے ہوئے اسے اپنی ساس کے خطرے سے آگاہ کیا۔

"ہاں نہیں تو اور کیا۔۔اماں کی لاڈلی بیٹی کی شان میں یہ گستاخی دوبارہ نہ کرنا۔"

بشریٰ نے بھی ڈرایا۔

"آپ ڈرتی ہوں گی دونوں۔۔میں تو بات کرتی ہوں سچی اور کھری۔ چاہے کسی کو بری ہی لگے خالہ جی کا مجھے ڈر نہیں پڑا۔"

وہ برتن دھوتے ہوئے پوری ڈھٹائی سے بولی۔ "ویسے گوگی باجی کب نازل ہونے والی ہے؟"

اسے بھی شاید گوگی باجی کا انتظار تھا تب ہی تو اس کے آنے کا پوچھ رہی تھی۔

"کل آ رہی ہے۔ تم بھی تیار ہو کر آنا پرسوں کام پر۔ یاد ہے پچھلے سال تمہیں بھی سیدھا کر کے گئی تھی باجی......"

بھابھیاں تو بھابھیاں گوگی تو پچھلی بار اس سے بھی الجھ پڑی تھی۔ اسے منٹوں میں کام ختم کر کے جاتا دیکھ کر پکڑ لیا تھا۔

"کیوں بہن...... پیسے کس چیز کے لیتی ہو۔ فرش ایسے دھویا جاتا ہے۔ دیکھو ذرا ساری مٹی اسی طرح جمی ہے۔"

اس کی عادت تھی افراتفری میں پانی کا چھڑکاؤ کیا وائپر لگایا اور بس ہو گئی، بھلے اس پر مکھیاں بھنبھناتی رہیں۔

"گوگی باجی! پہلے سارے بچوں کو آرام سے بٹھا دو پھر میری صفائی پر انگلی اٹھانا۔ جتنے بچے ہیں نہ اس گھر میں یہ مٹی ان کے پیروں سے مڑ مڑ کے آ رہی ہے۔" وہ کسی سے دبنے والی نا تھی فوراً بات منہ پر دے ماری۔

"اور یہ تم کن پیسوں کی بات کر رہی ہو۔ پیسے میں اپنے کام کے لیتی ہوں، کوئی احسان نہیں کرتا میرے اوپر...... محنت کرتے ہیں تو کماتے ہیں۔ بڑی آئیں مجھے باتیں سنانے والی۔"

نرگس کا جواب سن کر گوگی منہ پر ہاتھ رکھ کر رہ گئی۔

"ہا...... ہائے کیسی بدزبان کام والی ہے، میری کام والی ایسے جواب دے تو ابھی کے ابھی فارغ کر دیتی۔"

☆☆☆

دوسرے دن دو بجے گوگی باجی کی ٹرین تپتے پلیٹ فارم پر آن رکی تھی۔ ریلوے اسٹیشن سے انہیں

گھر تک لانے کی ذمہ داری اس بار صفدر بھائی کی تھی، وہ بے چارے آفس سے نکلتے ہوئے تھوڑا لیٹ ہو گئے پھر کیا تھا گھر پہنچتے سب سے پہلی شکایت ان ہی کی گئی۔

"توبہ ہے صفدر بھائی اا تنی گرمی میں پورے دو گھنٹے تپتے ہوئے پلیٹ فارم پر آپ کا انتظار کرنا پڑا"

بات انتظار تک رہتی تو اچھا تھا ان کے بچوں نے تو وہاں کھڑے کھڑے ٹھنڈی کل بہار قلفیوں پر پورے ہزار روپے کا خرچا کروا ڈالا تھا۔

"لو بھلا یہ کیا بات ہوئی، اتنے میں تو ہم رکشہ پکڑ کر اماں کے گھر تک جا سکتے تھے۔"

"اللہ معافی کتنی گرمی ہے یہاں۔"

گرمی میں اب گرمی نہ لگے۔ سردی تو لگنے سے رہی۔

" کیوں ملتان میں کیا آج کل برف باری ہو رہی ہے؟" صفدر جل کر بولا۔

"اے نجمہ! ذرا بچوں کو تو پنکھے سے ہٹاؤ...... ہوا نہیں لگ رہی۔"

وہ ابھی گرمی اور ہوا کا رونا رو رہی تھیں کہ لائٹ چلی گئی۔

"یہاں کیا اتنی لائٹ جاتی ہے۔"

نرگس دوڑ کر ہاتھ والے پنکھے لے آئی۔

"یہ مسئلہ تو اب پورے ملک کا ہے، کوئی کسی کو نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے ہاں لائٹ نہیں جاتی۔ ہمارے گھر تو پچھلے تین دن سے لائٹ نہیں آ رہی"

نرگس کی بات سن کر نجمہ نے ڈر کر اسے گھورا گوگی کا یہ احترام۔ کم از کم لائٹ تو دینی چاہیے تھی۔

☆☆☆

گوگی باجی اس بار بھی آئیں تو مہینے کے لیے تھیں لیکن چند ہی دنوں میں بور ہو گئی تھیں اماں کو اچانک سے اس کے آنے پر آپریشن کا خیال آ گیا تھا۔

"اماں یہ کون سا موسم ہے آنکھوں کا آپریشن کروانے کا۔ آگے تو برسات شروع ہو جائے گی۔ آپ ایسا کریں، موسم بدلتا ہے تو آپریشن کی ڈیٹ لے لینا۔"

اماں نے سوچ رکھا تھا بیٹی گھر آئے گی تو چھٹیوں میں آنکھوں کا آپریشن کروا لوں گی، یہاں تو بہو پکڑائی ہی نہ دے رہی تھی۔

"پورا سال ہوا، ہسپتال کے چکر لگاتے۔ اب کہیں جا کر آپریشن کی ڈیٹ ملی ہے اور تو کہہ رہی ہے اب سردیوں پر بات ڈال دوں۔"

سرکاری ہسپتال میں کافی خواری کے بعد ڈیٹ ملی تھی وہ کس طرح اسے ضائع کر دیتیں۔

"تجھے نہیں جانا تو نہ جا لیکن آپریشن تو میں کروا کے رہوں گی"

اماں کا جواب سن کر مرتی کیا نہ کرتی تیاری کرنی ہی پڑی۔

"اچھا چلتی ہوں غصہ کیوں کرتی ہیں۔۔۔اتنی گرمی میں چاہے میں بے ہوش ہو جاؤں لیکن آپ کا آپریشن ہو کر رہنا چاہیے۔"

وہ کپڑوں کا بیگ بنا کر اماں کے ساتھ ہاسپٹل آ گئی۔

جتنے دن وہ دونوں ہاسپٹل میں رہیں، گھر میں بچوں نے ممانیوں کا ناک میں دم کر ڈالا۔

☆☆☆

گوگی باجی کے جانے میں ابھی ڈھیروں دن پڑے تھے لیکن گھر سے سرور (گوگی کا شوہر) کا فون آ گیا تھا ان کی اماں کی طبیعت خراب تھی وہ انہیں واپس بلا رہے تھے۔

اب تو جاتے بنتی تھی، ساس کی بیماری کا سن کر نہ جاتی تو سرور کے ساتھ ساتھ باقی سب سے بھی باتیں سننے کو مل جاتیں۔

اللہ اللہ کر کے گوگی باجی اپنے گھر کو سدھاریں تو گھر والیوں کی جان میں جان آئی۔ ساس کی بیماری کی بدولت ہی سہی اس بار سب کی جان جلدی چھوٹ گئی تھی۔

" شکر ہے اللہ کا......جان بچی لاکھوں

ہائے..."
منے میاں گوگی باجی کو ریلوے اسٹیشن اتار کر لوٹے تو سب نے سکھ کا سانس لیا۔
"لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔"
نجمہ نے ہنستے ہوئے محاورہ مکمل کیا تو فرخندہ کو چھینک آ گئی۔
"اچھو۔"
"نہ بہن، بدھو کے لوٹنے کی بات مت کرنا۔ کہیں سچ میں بدھو لوٹ کر ہی نہ آ جائیں۔" نجمہ نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے معافی مانگی۔
"ایسی ہی چھینک تم گوگی باجی کے جاتے ہوئے بھی لے چکی ہو، اللہ ہی خیر کرے۔"
ابھی چاروں دیورانیاں جٹھانیاں ہنسی مذاق کر رہی تھیں کہ اچانک صفدر بھائی دوڑتے ہوئے اماں کے کمرے سے باہر نکل آئے۔
"بانو...... بانو...... منا کہاں ہے۔ اسے جلدی سے بلاؤ، اماں اچانک بے ہوش ہو گئی ہیں۔"
وہ ساری صفدر کے پیچھے اماں کے کمرے میں دوڑ پڑیں۔ رقیہ بیگم کو اٹھایا منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تھوڑا پانی پلا کر ہوش میں لایا گیا۔
"اماں! ہوش کریں، کیا ہو گیا ہے۔"
نجمہ نے آگے بڑھ کر سہارا دیا۔
چاروں بہوؤں نے گھیرے میں لے لیا۔ رقیہ بیگم منہ ہی منہ میں آنکھوں سے سب کو گھورتے ہوئے بولیں۔
"گوگی کو بلاؤ۔ میں نہیں بچوں گی...... صفدر جلدی سے بہن کو فون لگاؤ۔ اسے کہو جہاں پہنچی ہے وہیں سے لوٹ آئے۔"
ساس کی بات سنتے سب کے دل بند ہونے کو تھے۔ خوشیوں کے لمحے اتنے مختصر کیوں ہوتے ہیں ابھی تو گوگی باجی کو گئے ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا اور اماں ان کی واپسی کی فرمائش کر رہی تھیں۔
"شوہر کی ماں زیادہ اہم ہوتی ہے کہ اپنی ماں۔ بلاؤ اسے، میں اپنی بیٹی کے بغیر نہیں جی پاؤں گی منے! میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔"
ادھر اماں کی دہائی جاری تھی ادھر دروازے پر ایک دم سے شور کی آواز بلند ہوئی۔ کھلے دروازے پر رکشہ آن رکا تھا۔ سب نے دیکھا گوگی باجی کے بچے دوڑ کر آگے پیچھے گھر کے اندر داخل ہو رہے تھے پیچھے پیچھے گوگی باجی بدحواس سی اندر آ گئی۔
"کیا ہوا۔ خیر تو ہے۔"
سب حیران تھے بنا فون کے گوگی باجی کو کیسے اماں کی بیماری کی اطلاع ہو گئی۔
"جانا کیا خاک تھا، کپڑوں کا بیگ تو یہیں پر رہ گیا تھا۔ وہ تو شکر ہے ٹرین پر سوار ہونے سے پہلے مجھے یاد آ گیا۔"
"اوہو۔" سب کو گوگی باجی کی یادداشت پر جی بھر کر غصہ آیا۔
"اور یہ چھٹکی۔ اسے بھی عین اسی وقت پلیٹ فارم کی بھیڑ میں گم ہونا تھا ڈھونڈتے ڈھونڈتے ٹرین ہاتھ سے نکل گئی سرور سے بات کی تو کہنے لگے تم چھٹکی کو ڈھونڈو، اماں کو میں سنبھال لوں گا، تم چھٹکی اور بیگ کے بغیر نہ آنا، بھلے انہیں ڈھونڈنے میں چھ مہینے لگ جائیں۔"
"ہیں؟"
سرور بھائی کی کہی بات پر جہاں چاروں بھابیاں بے ہوش ہونے کو تھیں وہیں رقیہ بیگم اٹھ کر بیٹھ گئیں۔
"میں صدقے جاؤں...... یہ ہوتی ہے خون کی کشش، ادھر اماں نے پکارا ادھر بیٹی دوڑی چلی آئی۔"
رقیہ بیگم بیٹی کو سینے سے لگائے ماتھا چوم رہی تھیں اور ادھر نجمہ، بانو، بشریٰ اور فرخندہ اس وقت کو کوس رہی تھیں جس منحوس گھڑی چھٹکی گم ہو گئی تھی۔ اب اگلے پندرہ بیس دن تک ان کی جان نہیں چھوٹنے والی تھی۔ چھینک کے ساتھ بدھو لوٹ آئے تھے۔

☆☆☆

نگہت سیما



لاہور کے ذکی دروازے کی سمت بہت شان دار حویلیاں تھیں ان میں سے ایک مرزا جہاں زیب کے دادا مرزا ہمایوں بیگ نے بنوائی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں جدید تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں کی گئی تھیں۔

مرزا جہاں زیب اپنے والد کی اکلوتی اولاد تھے اللہ نے انہیں چار بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا تھا۔

بیٹوں، بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ اوپر والی منزل میں اورنگ زیب بیگ اور ارباب بیگ رہائش پذیر تھے جب کہ خود جہاں زیب بیگ گرائونڈ فلور پر دونوں چھوٹے بیٹوں شاہ زیب اور ظفریاب کے ساتھ رہتے تھے۔

اورنگ زیب کی دو بیٹیاں دو بیٹے تھے۔ ارباب بیگ کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔

ظفریاب کا بیٹا آزین اور شاہ زیب بیگ کی بیٹی زل کا نکاح ہو چکا تھا۔

شاہ زیب بیوی کے مرنے کے بعد گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ظفریاب کچھ سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے گرفتار ہو گئے تھے، وہ بہت برا وقت تھا سب جانتے کیا ہوا کہ ان کی بیوی نے ان کے واپس آنے کے بعد طلاق لے لی۔ ظفریاب دوسری شادی کر کے ملک سے باہر چلے گئے۔

ابرار شاہ ایک بڑے وڈیرے اور سیاست دان کا بیٹا تھا جو صبوحی سے یونی ورسٹی کے زمانے سے محبت کرتا تھا جبکہ وہ شادی شدہ تھا اور اس کے دو بچے تھے۔ ظفریاب جب نگاہوں میں غائب ہوئے تو صبوحی ان کو تلاش کرتے ابرار شاہ سے ملتی ہیں وہ ظفریاب کی رہائی کے بدلے صبوحی سے شادی کرنا چاہتے تھے وہ راضی ہو جاتی ہیں یوں ظفریاب کی رہائی اور تندرستی کے بعد وہ طلاق لے لیتی ہیں اور ابرار شاہ سے شادی کر کے یو کے چلی جاتی ہیں۔

سمیرا ابرار شاہ کی پہلی بیوی کی بیٹی ہے جو بدلہ لینے کی خواہش میں زین اور زل کے بیچ دراڑیں ڈالتی ہے وجدان کو سمیرا کی یہ حرکتیں ناگوار گزرتی ہیں۔ زل اختر بانو کے پاس نومان کی شادی کے سلسلے میں جاتی ہے۔ منیرہ کے گھر جاتے ہوئے رستے میں زل کو اغوا کر لیا جاتا ہے چراغ سائیں اس کی اطلاع اختر بانو کو دیتے ہیں وہ پہلے ہی دل کے عارضے میں مبتلا ہاپنی کانپتی ڈیرے پر آتی ہیں اور جذبات میں شایان کا سچ نکل جاتا ہے کہ وہ ان کا خون ہے۔ شایان اور زل کے لیے یہ انکشاف حیران کن تھا۔ شایان ثمرہ سے اس بابت پوچھ گچھ کرتا ہے اور وہ خوب روتی چلاتی ہے۔ چراغ سائیں کا انتقال ہو جاتا ہے حویلی سے اس کا جنازہ اٹھایا جاتا ہے۔

زل کو لینے مرتضٰی آتا ہے شاہ زیب بیگ نارمل ہو رہے ہیں۔

اقبال بارہ سال ترکی کی جیل کاٹ کر پاکستان لوٹتا ہے اسے یاد آتا ہے کہ اس نے کس طرح ماسٹر عبدالعزیز، زیب النساء اور اس کے شوہر کے بیچ جھوٹ بول کر دوری کروائی اسے یقین ہے کہ زیب النساء کی زندگی خراب کرنے کی اسے سزا مل رہی ہے۔

زین جو اپنی ماں صبوحی سے ناراض تھا، اس کا سچ ابرار شاہ اسے بتاتا ہے۔ زین تمام تر بہکاوں کے باوجود زل سے اپنے دل کی بات کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے کہ اسے زل کے نام جبران کا محبت نامہ مل جاتا ہے اور وہ ہمیشہ

مکمل ناول

کے لیے باہر جانے کا ارادہ کرلیتا ہے۔ شانزہ کو عقیل نے طلاق دینے سے انکار کر دیا۔ سمیرا زل سے ملنے آتی ہے اور اسے جبران کی ناراضی اک بتاتی ہے زل اسے سنبھالتی ہے۔ آزین کے سارے دوست اس کے جانے کی وجہ جاننا چاہتے ہیں لیکن ہزار بدگمانیوں کے باوجود وہ زل اور اپنے رشتے کی نفی نہیں کرتا۔



زیب النساء کی کملی زیتون اختر بانو کے پاس اس کا نکاح نامہ اور تصویر لے جاتی ہے اختر بانو ششدر رہیں۔
وجدان سیرا الیس ناراض ہے وہ اس سے معافی مانگنے آتی ہے کہ وجدان کو گولی لگ جاتی ہے۔
شیخوں بابا شاہ زیب بیگ کے بیٹے ہیں یہ عقدہ کھل جاتا ہے۔

تیئسویں قسط

"وہ منتظم صاحب آئیں تو میرا نام لے کر ساری بات کر لینا۔" وہ چلا گیا تھا اور وہ مدرسے کے احاطے میں پڑے بنچوں پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد ایک بندے نے آ کر بتایا کہ وہ آج نہیں آئیں گے آپ کل آ جائیں۔ اس نے سنا چاچا صفدر اس بندے سے کسی یتیم خانے کا پتا پوچھ رہا تھا۔

"چاچا واپس گھر چلیں۔" مدرسے سے باہر نکل کر اس نے پھر التجا کی تھی۔

"میں آپ کے گھر نہیں رہوں گا۔ اپنے گھر رہوں گا۔ اور روٹیاں، سالن سب تندور سے لے لیا کروں گا۔"

گاؤں کے وسط میں ماسی جیناں کا تندور تھا اور وہ ایک مٹی کی ہانڈی میں کوئی نہ کوئی سبزی یا دال ضرور پکا کر رکھتی تھی۔ آس پاس کے کوٹھوں سے آنے والے مزدور جو کھیتوں میں کام کرتے تھے ماسی جیناں یہ ہانڈی ان کے لیے پکاتی تھی اور وہ وہاں ہی چھپر تلے بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔

صفدر چاچا نے چلتے چلتے رک کر اسے حیرت سے دیکھا تھا اور جان لیا تھا کہ اس نے رات اس کی باتیں سن لی تھیں اور پھر سر اثبات میں ہلایا تھا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا تھا کچھ دیر وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ دو تین گلیوں سے گزر کر وہ ایک گلی میں داخل ہوئے تھے جس کے آغاز میں ہی ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔

"تم یہاں بیٹھو۔ میں نے پیچھے ایک ہوٹل دیکھا تھا۔ وہاں سے کھانا لے آؤں۔ کھانا کھا کر پھر اسٹیشن چلتے ہیں۔"

"مجھے کسی یتیم خانے میں نہیں جانا چاچا۔"

وہ یتیم خانے کے اصل مفہوم سے نا آشنا تھا لیکن اس کی اماں نے کبھی اسے یتیم نہیں کہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے ابا زندہ ہیں۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے تم بیٹھو میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔"

وہ اس کی نم آنکھوں سے نظریں چراتا ہوا تیزی سے ایک گلی میں مڑ گیا اور وہ جو ابھی آنے کا کہہ کر گیا تھا کئی گھنٹے گزرنے کے بعد بھی واپس نہیں آیا تھا۔ اندر کہیں ادراک تھا کہ اب چاچا صفدر واپس نہیں آئے گا لیکن پھر بھی وہ مسجد کی سیڑھیوں سے نہیں اٹھا تھا۔ آتے جاتے کئی لوگوں نے رک کر اس سے پوچھا تھا کہ وہ یہاں کیوں بیٹھا ہے اور اس نے سب کو یہ ہی بتایا تھا کہ وہ اپنے چاچا کے ساتھ ادھر آیا ہے اور وہ ان کا انتظار کر رہا ہے۔

عشاء کی نماز پڑھا کر جب امام صاحب باہر نکلے تو اسے اس طرح بیٹھا دیکھ کر مسجد کے ساتھ بنے اپنے کمرے میں لے گئے تھے۔ کھانا کھلایا تھا۔ مسجد میں اعلان بھی کیا تھا کہ ایک بچہ ملا ہے۔ جس کا ہو آ کر لے جائے لیکن اگر چاچا نے آنا ہوتا تو پھر یوں ایک اجنبی شہر میں اسے چھوڑ کر کیوں جاتا پھر بھی اگلے دو تین دن وہ صبح سویرے اٹھ کر مسجد کی سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ چاچا اسے یہاں ہی چھوڑ کر گیا تھا تو کیا پتا اسے یہاں ہی ڈھونڈنے آ جائے لیکن چاچا نہیں آیا تھا اور وہ ظفریاب کے ساتھ موروں والی اس حویلی میں آ گیا تھا۔

قدرت بعض اوقات آدمی کو خود ہی وہاں پہنچا دیتی ہے جہاں اسے جانا ہوتا ہے وہ بھی اپنے لوگوں

کے درمیان پہنچ گیا تھا اگرچہ وہ اس سے بے خبر تھا۔
بی بی اماں نے اسے اپنی ممتا کے آنچل میں سمیٹ لیا تھا۔ ظفریاب کے کہنے پر بی بی اماں اسے ہانس بازار کے قریب ایک چھوٹے سے پرائیویٹ اسکول میں داخل کروا آئی تھیں۔ اس نے کبھی کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ چک مراد شاہ میں ماسی جنتاں کے گھر میں رہتے تھے۔

اس کوادراک ہوگیا تھا کہ صفدر چاچا جان بوجھ کر اسے چھوڑ گیا تھا اور ظفریاب اگر اسے گاؤں لے گئے تو ماسی زیتون تو خوش ہوگی لیکن صفدر چاچا اس کا گلا گھونٹ کر اسے جنگل میں پھینک دے گا۔ اس کی آنکھوں کی بے رحمی اور سنگ دلی کا تصور کر کے اس کا ننھا سا دل سکڑ جاتا اور وہ اپنے لب سی لیتا تھا۔

یہاں اس حویلی میں رہنے والے سب لوگ ہی مہربان اور شفیق تھے۔ وہ ایک مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔ دل لگا کر پڑھ رہا تھا کہ ظفریاب نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے کسی اچھے اسکول میں داخل کروا دیں گے جلد ہی بس اسے محنت سے پڑھنا ہے اور پھر اماں بھی تو چاہتی تھیں کہ وہ بہت سارا پڑھ کر اپنے ابا کی طرح بڑا افسر بنے ظفریاب باہر چلے گئے تھے لیکن وہ یوں ہی جی لگا کر پڑھتا رہا۔

میٹرک کے داخلے جاری تھے اسکول والوں نے اس سے برتھ سرٹیفکیٹ مانگا تھا۔ تب اس نے بی بی اماں کے دیئے ہوئے ٹین کے بکسے سے کپڑے کے تھیلے سے اپنا برتھ سرٹیفکیٹ نکالا تھا۔ حامد علی ولد شاہ زیب بیگ۔

اسکول میں داخلے کے وقت اس نے یوں ہی تہہ کیا ہوا اپنا پانچویں جماعت پاس کرنے والا سرٹیفکیٹ بی بی اماں کے کہنے پر اس اسکول کے کلرک آفس میں ٹیبل کے پیچھے ادھیڑ عمر کلرک کو دے دیا تھا۔ وہ گلی کے اندر ایک چھوٹا سا پرائیوٹ اسکول تھا انہوں نے فیس لے کر اسے داخلہ دے دیا تھا۔ زیادہ کرید نہیں کی تھی۔ اسے اپنے والد کا نام معلوم تھا۔ اماں نے بتایا تھا ایک بار۔ لیکن اب پہلی بار وہ اس نام کو دھیان سے پڑھ رہا تھا دہرا رہا تھا۔

تمہارے ابا کا نام شاہ زیب تھا لیکن میں انہیں شہزادہ سلیم کہتی تھی۔ ان کی مدھری ہنسی اس کے کانوں میں گونجی اور تصور میں لبوں پر شرمیلی سی مسکان لیے ان کی صورت آئی تو وہ کتنی ہی دیر نم آنکھیں لیے بیٹھا رہا تھا پھر غیر ارادی طور پر اس تھیلے کو الٹ ڈالا تھا اب وہ نکاح نامہ دیکھ رہا تھا۔ شاہ زیب بیگ ولد جہاں زیب بیگ اور پتا تھا۔ موروں والی حویلی نزد روشنی اسکول نزکی دروازہ۔

وہ کتنی ہی دیر ساکت بیٹھا رہا تھا۔ جب بی بی اماں نے اسے اپنے کپڑے رکھنے کے لیے یہ بکسا دیا تھا تو اس نے سب سے نیچے یہ تھیلا اپنا بستہ اور کتابیں رکھ کر اوپر اپنے کپڑے رکھ دیئے تھے۔ اس تھیلے میں اماں کی امانت تھی جسے پڑھ لکھ کر بڑا افسر بن کر اپنے ابا کو ڈھونڈ کر انہیں پہنچانی تھی۔ بی بی اماں کے کمرے میں جس میں وہ رہتی تھیں ایک ہی دیوار گیر الماری تھی جس میں وہ اپنے کپڑے اور ضرورت کا دوسرا سامان رکھتی تھیں۔ سو انہوں نے اسے اپنے کپڑے رکھنے کے لیے یہ بکسا دیا تھا۔ اس کا جی چاہا تھا کہ وہ شاہ زیب بیگ کو بتائے کہ وہ ان کا بیٹا ہے۔ ان کا اور زیب النساء کا لیکن شاہ زیب بیگ تو بہت کم کم گھر آتے تھے۔ وہ آئیں گے تو وہ ان سے لڑے گا شکوہ کرے گا کہ انہوں نے اماں کو بھلا دیا تھا لیکن وہ تو چھ سات ماہ کے لیے کسی دور علاقے میں تعینات ہو گئے تھے۔

کئی بار اس نے سوچا تھا کہ وہ بی بی اماں کو یہ راز بتا دے لیکن پھر بتا نہ پاتا نہیں پہلے وہ ان کو ہی بتائے گا۔ وہ میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوا تو اورنگ زیب بیگ نے بی بی اماں سے کہا۔ یہ تو اب جوان ہے ایک نامحرم لڑکا حویلی کے اندر کیسے رہ سکتا ہے۔ تب بھی اس کا جی چاہا تھا وہ بی بی اماں سے کہے وہ نامحرم نہیں ہے۔

شاہ زیب بیگ کی پوسٹنگ جہلم ہوئی تو وہ ڈیوڑھی میں منتقل ہو چکا تھا۔

وہ چند گھنٹوں کے لیے ہی حویلی آئے تھے اور جہلم چلے گئے۔ کتنے مہینے گزر گئے وہ گھر نہیں آسکے اور جب آئے تو مریم ہسپتال میں تھیں اور پھر مریم کی وفات کے بعد وہ اچانک غائب ہو گئے۔

دو سال بعد وہ ظفریاب کے ساتھ آئے تو اپنے حواسوں میں نہیں تھے۔ سارا دن اپنے کمرے میں وہ خاموش بیٹھے خلاؤں میں تکا کرتے بعض اوقات تو وہ اپنے گھر کے افراد کو بھی نہیں پہچانتے تھے۔ ایسے میں وہ ان کو کیا کہتا تب اس نے سوچا وہ ظفریاب کو اماں کا نکاح نامہ دکھائے وہ آج بھی اس کے لیے مہربان اور شفیق تھے اس کی فکر کرتے تھے لیکن وہ ان سے بات کرنے کا سوچتا ہی رہا اور وہ جو صرف دو ہفتے کے لیے جہاں زیب بیگ کی بیماری کا سن کر آئے تھے واپس چلے گئے۔

☆☆☆

دس مزید سال گزر گئے وہ سمندر کے پاس رہ کر بھی پیاسے تھے۔ تب ہی بیرونی دروازہ کھلا۔ بلال اندر داخل ہوا تو انہوں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"کیا ہوا شیخو بابا طبیعت تو ٹھیک ہے۔" بلال چند لمحوں کے لیے ان کے پاس رکا تھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تو بلال مزید کوئی بات کیے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا انہوں نے بھیگی پلکیں ہاتھوں کی پشت سے پونچھیں۔

جانے کب وہ لمحہ آئے گا جب وہ شاہ زیب بیگ کے سینے سے لگیں گے اور عمر بھر کی تشنگی ختم ہو جائے گی۔ جانے کب۔

غیر ارادی طور پر جھکتے ہوئے انہوں نے چارپائی کے نیچے سے بکسا کھینچ کر نکالا اور بے قراری سے کپڑے کا وہ تھیلا نکالا اور زیب النساء کے لکھے گئے خط نکال نکال کر دیکھنے لگے۔ کئی بار پہلے بھی انہوں نے یہ خط نکال کر دیکھے تھے۔ اس پر اپنے لب رکھے تھے یہ ان کی اماں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے لیکن کبھی پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ یہ اماں کی امانت تھی انہیں پڑھنے کا حق صرف شاہ زیب بیگ کو تھا۔ اماں نے کہا تھا جب ان کے ملنے کی آس نہ رہے نا امید ہو جاؤ تو انہیں ضائع کر دینا۔ لیکن وہ ناامید نہیں ہوئے تھے اور یہ خط آج بھی ان کے پاس موجود تھے زردی مائل کاغذوں پر لکھے لفظوں کی سیاہی بھی پھیکی پڑ گئی تھی وہ ان لکھے ہوئے لفظوں پر اپنی انگلیاں پھیر رہے تھے۔

آنکھوں کے سامنے اماں کی صورت آ رہی تھی۔ دیوار سے ٹیک لگائے گھٹنوں پر رجسٹر رکھے ان کی کاپی سے نکالے گئے صفحات پر لکھتی ہوئی زیب النساء کی پلکیں کبھی بھیگ جاتیں کبھی ہونٹوں پر دلکش سی مسکراہٹ بکھر جاتی۔ وہ کئی سال پہلے ماسی جنتاں کے صحن میں پہنچ گئے تھے اور اپنے سامنے زیب النساء کو مجسم دیکھ رہے تھے اور دل جیسے پگھل کر پانی ہو رہا تھا۔ وہ اس منظر میں اتنے کھوئے ہوئے تھے کہ جب ڈیوڑھی کا اندرونی دروازہ کھول کر شاہ زیب نے انہیں آواز دی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھے اور گود میں رکھے سارے خطوط ڈیوڑھی کے فرش پر گر گئے۔ اور سرہانے رکھے پیڈسٹل فین کی ہوا سے ادھر ادھر اڑنے لگے۔

"جی شاہ بابا...... جی شاہ بابا۔" کہتے ہوئے وہ تیزی سے جھک کر بکھرے اوراق سمیٹنے لگے غیر ارادی طور پر شاہ زیب بیگ ان کی مدد کے خیال سے جھک کر ادھر ادھر ہوا سے اڑتے اوراق اٹھانے لگے تھے۔ ایک ورق اٹھاتے ہوئے ایک غیر اختیاری نظر آخری سطر پر پڑی۔

آپ کی زیب النساء......زیب النساء...... زیب النساء۔

سرگوشی کی طرح ان کے لبوں سے نکلا۔ اب نظریں اوپر والی سطروں پر تھیں۔

"میرے شاہ دل! پتا نہیں کیوں یقین نہیں آتا کہ آپ چلے گئے ہیں۔ ایسی جگہ جہاں سے کوئی پلٹ کر نہیں آتا۔ میرا یہ دل اس بات کو ماننے سے آج تک انکاری ہے۔ آج جب ہمارا بیٹا آٹھ سال کا ہو

گیا ہے آج بھی میرے شہزادے! میرا دل اس لمحے کے سحر سے نکل ہی نہیں سکا جس لمحے میں پانی کا کٹورا لیے آپ کی طرف بڑھا رہی تھی۔ اور پانی میری انگلیوں کی درزوں میں سے اٹھے ہوئے ہاتھوں میں گر رہا تھا۔ آپ اگر ہیں جیسے میرا دل کہتا ہے میرے بادشاہ تو آپ نے کیسے ان لمحوں کو بھلا دیا اور ان لمحوں کو جب دریائے کنہار کے کنارے بیٹھے آپ مجھ سے پھر یہاں آنے کا وعدہ کر رہے تھے۔"

"یہ...... یہ۔"

انہوں نے سر اٹھا کر شینو بابا کی طرف دیکھا جو سارے اوراق اکٹھے کر کے سینے سے لگائے خوفزدہ نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے دل کی دھڑکن تیز اور بے ترتیب تھی۔

"کہاں سے لیے...... یہ یہ تو زیب النساء کے خط ہیں۔" وہ بولے تو ان کی آواز پھٹی ہوئی اور وحشت زدہ تھی۔

"تمہارے پاس کیسے ہیں...... یہ تو۔"

انہوں نے چھیننے کے انداز میں سارے اوراق ان سے لے لیے۔

"یہ...... بولو یہ کیسے آئے تمہارے پاس۔ کیوں چھپا کر رکھا ہوا تھا انہیں۔"

"یہ میری اماں کی امانت ہے انہوں نے مجھے کہا تھا کہ جب تمہارے ابا تمہیں مل جائیں تو انہیں دے دینا۔"

"تمہاری اماں۔"

اب وہ سارے اوراق دائیں ہاتھ سے سینے سے لگائے انہیں مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"میری اماں زیب النساء۔"

اب کچھ بھی چھپانے کا فائدہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر ارسلان نے ابھی زیب النساء کی موت کے متعلق کچھ بھی بتانے سے منع کیا تھا لیکن قدرت خود اب اگر آشکار کر رہی تھی تو وہ بھی یہ بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک گئے تھے۔

"تمہاری اماں اچھا وہ تمہاری اماں ہے تو کہاں ہے لے چلو مجھے وہاں۔"

وہ اب بھی مشکوک سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"میرے نانا جان ماسٹر عبدالعزیز کی وفات کے بعد وہ مجھے لے کر ماسی جنتاں کے پاس چک مراد شاہ چلی گئی تھیں۔ تب بہت چھوٹا تھا میں شاید ڈیڑھ دو سال کا۔"

"میں پوچھ رہا ہوں اب کہاں ہے وہ۔" بائیں ہاتھ سے انہوں نے اس کا بازو جھنجوڑ ڈالا۔

"دس برس کا تھا میں جب اماں۔"

آواز حلق میں پھنس گئی۔ دل اتنی زور سے دھڑکا جیسے ابھی دھڑک کر بند ہو جائے گا۔ اگر شاہ بابا کو کچھ ہو گیا تو۔ اگر وہ پھر پہلے جیسی کیفیت میں چلے گئے تو میں ساری زندگی تشنہ رہوں گا۔ کیا میں بھی ان کے سینے سے لگ کر انہیں بابا نہیں کہہ سکوں گا۔ نہیں میرے اللہ اب نہیں بس اب نہیں میرے اللہ میرے بابا کو کچھ نہ ہو۔

"وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر اس دنیا سے چلی گئیں۔"

انہوں نے آنکھیں زور سے بھینچ لی تھیں اور بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اور ان آنسوؤں کو وہ بہنے سے روک نہیں پا رہے تھے اور نہ ہی آنکھیں کھول کر شاہ زیب کی طرف دیکھنے کی ہمت ہو رہی تھی۔

"اقبال نے بھی کہا تھا وہ مر گئی ہے۔ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ ان کی آواز پست تھی۔

"لیکن تم...... تم بھلا کیوں جھوٹ بولو گے تم تو...... ہاں تم تو۔" انہوں نے سینے سے لگائے وہ اوراق چارپائی پر رکھے اور اسے اپنے دونوں بازوؤں میں بھینچ لیا۔

"میرے بیٹے، میری زیب کے شہزادے۔"

انہوں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول کر شاہ زیب کو دیکھا اور اپنے جوان بازوؤں کی گرفت ان کے گرد مضبوط کرتے ہوئے گھٹی گھٹی آواز میں بولے۔

''بابا...... بابا میں آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ کا اور زیب النساء کا'' اب وہ رو رہے تھے۔ ان کے گلے لگے کبھی آہستہ اور کبھی بلند آواز میں۔ پتا نہیں کتنی دیر روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی تو شاہ زیب بیگ نے انہیں خود سے الگ کرتے ہوئے ان کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر بغور دیکھا۔

''ہاں تمہاری یہ ناک، یہ ہونٹ اور یہ ناک کے کونے پر تل یہ چھوٹا سا تل...... زیب النساء جیسا ہے۔''

''اماں کہتی تھیں میری آنکھیں بالکل اپنے ابا جیسی ہیں اور میری پیشانی بھی۔''

خوف کی چادر میں لپٹا دل اب معمول کی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔

شاہ زیب بیگ نے ہاتھوں میں لیے ان کے چہرے کو ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ اور اپنے لب ان کی پیشانی پر رکھ دیے شیخو بابا کے اندر سے جیسے سمندر ابل پڑے تھے۔

''بس بیٹا!'' ایک بار پھر انہوں نے اسے گلے سے لگا لیا تھا۔ دونوں کے چہرے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے اور شاہ زیب اپنے ہاتھوں سے آنسو پونچھ رہے تھے تسلی دے رہے تھے۔ بھلے وہ انتیس میں سال کے ایک بھرپور جوان تھے لیکن ان کے تو بیٹے تھے۔ وہ باپ تھے ان کے۔ وہ بکھر رہے تھے تو انہوں نے ہی اسے سنبھالنا تھا۔ خود ان کا دل جیسے کوئی چیر رہا تھا، وہ ان کا بیٹا تھا حویلی کے وارثوں میں سے ایک لیکن غلاموں کی طرح ڈیوڑھی میں پڑا تھا۔

''بس اب نہیں اب نہیں رونا۔ میں نے اقبال کی بات پر یقین کر لیا۔ میں قصوروار ہوں تمہارا بھی تمہاری ماں کا بھی۔'' انہوں نے ہاتھ جوڑ دیے تو شیخو بابا نے تڑپ کر ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔ چوم کر آنکھوں سے لگائے۔

''یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ اماں نے کبھی آپ کو بے وفا نہیں کہا۔ انہیں آپ پر اندھا یقین تھا۔ جب آپ کی بہت یاد آتی تھی تو وہ آپ کو خط لکھا کرتی تھیں۔''

انہوں نے چارپائی پر پڑے اوراق کی طرف دیکھا جو پنکھے کی ہوا سے پھڑپھڑا رہے تھے۔

''اس تھیلے میں وہ سب خطوط ہیں۔ بیس یا پچیس یا شاید زیادہ۔ یہ آپ کی امانت ہیں بابا۔''

انہوں نے چارپائی پر پڑے اوراق اکٹھے کیے اور تھیلا بھی اٹھا کر ان کے حوالے کیا۔ شاہ زیب بیگ نے کسی قیمتی متاع کی طرح انہیں اپنے ہاتھوں میں لیا اور وہاں ہی ڈیوڑھی کے فرش پر بیٹھ گئے۔ اور گود میں تھیلا رکھے ایک ایک ورق اٹھا کر پڑھنے لگے۔

''یہ...... یہ کیا کر رہے ہیں بابا یہاں فرش پر مت بیٹھیں۔'' شیخو بابا بھی ان کے سامنے فرش پر بیٹھ گئے تھے۔

زردی مائل کاغذوں پر پھیکی سیاہی والے لفظوں پر بار بار دھندلاہٹ آ جاتی اور شاہ زیب بیگ پلکیں جھپک کر ہاتھوں کی پشت سے رگڑ کر پھر سے نظریں ان کاغذوں پر جما دیتے۔

''بابا پلیز اس طرح یوں فرش پر نہ بیٹھیں۔ چلیں اپنے کمرے میں وہاں جا کر اطمینان سے سب خط پڑھیے گا۔''

شیخو بابا نے التجا کی تو انہوں نے سوچا اپنے کمرے میں بیٹھ کر ایک ایک لفظ کو پڑھیں گے سکون سے اور زیب النساء کو محسوس کریں گے ان لمحوں میں جب وہ اپنے دل کی باتیں لکھ رہی تھی۔ انہوں نے گود میں رکھے سب اوراق اٹھا کر تھیلے میں ڈالے اور کھڑے ہو کر اس کا ہاتھ پکڑا۔

''چلو میرے ساتھ میں سب سے تمہارا تعارف کرواؤں۔''

''سب مجھے برسوں سے جانتے ہیں شاہ بابا۔''

''لیکن آج تمہارا تعارف شاہ زیب بیگ کے بیٹے کی حیثیت سے ہوگا اور اس حیثیت سے وہ تمہیں نہیں جانتے۔''

وہ مسکرائے اور ان کے ساتھ اندر جاتے ہوئے شیخو بابا کے قدم رک رک جاتے تھے حالانکہ سینکڑوں بار وہ اس حویلی کے اندر گئے تھے لیکن آج شاہ زیب

بیگ کے ساتھ ان کا جانا بہت انوکھا اور مختلف تھا۔ دل کی دھڑکنیں پھر بے ترتیب تھیں اور وہ جھجکتے ہوئے شاہ زیب بیگ کے ساتھ جہاں زیب کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔

☆☆☆

"حد ہو گئی ہے۔ یعنی کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ شخص جو بیس سالوں سے ہمارے گھر ملازموں کی طرح رہ رہا ہے فراڈ کر رہا ہے۔" مرتضیٰ لیونگ روم میں ادھر سے ادھر چکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ سامنے صوفے پر بظاہر بے نیازی سے اخبار دیکھتے ارباب بیگ اس کی ساری باتیں دھیان سے سن رہے تھے۔

"اس نے کہا میں شاہ زیب بیگ کا گم شدہ بیٹا ہوں تو سب نے۔"

"حد ہو گئی ہے یعنی یہ شخص جو بیس سالوں سے ہمارے گھر ملازموں کی طرح رہ رہا ہے اور جسے چچا جان ترس کھا کر گھر لے آئے تھے۔ اسے اتنے سالوں میں تو یہ خیال نہ آیا کبھی کہ اپنے باپ کا نام بتاتا۔ بی بی اماں، دادا جان اور ظفر چچا سب نے ہی پوچھا تھا اور اپنا نام بھی غلط بتایا۔ شہزادہ سلیم ہوں۔"

مرتضیٰ لیونگ روم میں ادھر سے ادھر چکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ چلتے چلتے رک کر اس نے ارباب بیگ کی طرف دیکھا جو سامنے ہی بظاہر بے نیازی سے اخبار دیکھتے ہوئے اس کی ساری باتیں سن رہے تھے۔

"کسی کو سمجھ کیوں نہیں آ رہی کہ وہ فراڈ کر رہا ہے۔ اس نے کہا میں شاہ زیب بیگ کا گم شدہ بیٹا ہوں اور سب نے یقین کر لیا۔ چچا جان کی تو ذہنی حالت خیر ایسی نہیں ہے کہ وہ زیادہ غور کرتے لیکن تایا جان نے، آپ نے کسی نے چچا جان اور دادا جان کو نہیں سمجھایا سب اس پر یوں صدقے واری ہو رہے ہیں جیسے وہ سچ میں ہی چچا جان کا بیٹا ہے۔"

ارباب بیگ کی طرف دیکھتا ہوا وہ دوسرے صوفے پر میمونہ بیگم کے پاس بیٹھ گیا تھا جو دل ہی دل میں اس کی سمجھ داری پر خوش ہو رہی تھیں کہ جس بات کا خیال کسی کو نہیں آیا۔ مرتضیٰ اس کو سمجھ گیا تھا۔

انہوں نے ایک فخریہ سی نظر، اس پر ڈال کر جتاتی نظروں سے سحرش کو دیکھا جو چائے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی تھی اور جسے ہمیشہ ہی مرتضیٰ کی سمجھ داری اور ذہانت پر شک رہا تھا۔

سحرش نے ٹرے ٹیبل پر رکھ کر ارباب بیگ اور میمونہ کو چائے کے کپ پکڑائے اور خود بھی اپنا کپ اٹھا کر صوفہ چیئر پر بیٹھ گئی تھی۔ ارباب بیگ ناشتہ کر کے لیونگ میں آ گئے تھے اور سحرش کو چائے وہاں ہی لانے کا کہہ دیا تھا۔ اورنگ زیب اور شاہ رخ ناشتہ کر کے کارخانے جا چکے تھے لیکن انہیں اندرون شہر جانا تھا کارخانے کے لیے ہی کچھ سامان کا آرڈر دینا تھا۔

"کیا آپ چائے پئیں گے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ بھی ادھر ہیں۔"

سحرش نے پوچھا تو مرتضیٰ نفی میں سر ہلاتے ہوئے ارباب بیگ سے مخاطب ہوا۔

"ابا جان! آپ بات کریں دادا جان سے اس طرح آنکھیں بند کر کے اعتبار کرنا ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا بات کروں۔ شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی سارے ثبوت تو موجود تھے۔"

ارباب بیگ نے اخبار ایک طرف رکھ دیا تھا اور اب چائے پی رہے تھے۔

"آج کل جھوٹے ثبوت حاصل کرنا کون سا مشکل ہے۔ وہ جانتا تھا ایک ایک بات چچا جان کی پہلی شادی۔ بیوی اور بچے کی گمشدگی تو بس اس نے پلان بنا لیا کہ چچا جان کا وارث بن جائے۔ اور یہاں سب بے وقوف بن گئے اس کی باتوں میں آ گئے۔ مرتضیٰ کو یہ حقیقت ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ شیخو یا شاہ زیب کا بیٹا اور اس کا کزن ہے۔"

نکاح نامہ، وہ خطوط اس کا برتھ سرٹیفکیٹ کیا سب جھوٹ ہے۔ عقل کے ناخن لو خوامخواہ اپنا دماغ مت تھکاؤ۔ اختر بانو نے جو کچھ بتایا تھا وہی سب کچھ اس نے بتایا اور اب اختر بانو جو اس کی ماں کی سہیلی کو لے کر آئی ہے۔ اور کیسے رو رو کر دہ عورت اس سے شاہ زیب اور ابا جان سے معافی مانگ رہی تھی۔ کیا اس

عورت کے آنسو بھی جھوٹے تھے۔"

ارباب بیگ کو یقین تھا کہ شیخو بابا شاہ زیب کے ہی بیٹے ہیں اور انہیں مرتضیٰ کی باتوں پر غصہ آ رہا تھا۔

"کون عورت؟" مرتضیٰ زیتون کی آمد سے بے خبر تھا۔

"دو دن پہلے ہی اختر بانو آئی تھیں۔ یہ محض اتفاق تھا کہ زیتون ایک بار پھر منیرہ کے پاس آئی ہوئی تھی کہ منیرہ کی طبیعت خراب تھی اور اس کی ساس چھت سے گر کر بازو کی ہڈی تڑوا بیٹھی تھی۔ اختر بانو نے اسے شہزادے اور شاہ زیب کے متعلق بتایا تو وہ منتیں کرنے لگی کہ اسے بھی ساتھ لے جائیں۔ اختر بانو نے وعدہ کر لیا کہ جس روز وہ جائیں گی تو اسے لے جائیں گی۔

میمونہ مرتضیٰ کو زیتون کے متعلق بتانے لگی تو ساری بات سن کر اس نے پھر اعتراض کیا۔

"بیس سالوں بعد اس نے بھلا کیسے پہچانا شیخو بابا کو کہ یہ وہی ہے جو دس سال کی عمر میں کھو گیا تھا۔ اور میری ماں، یہ کوئی فلمی کہانی نہیں ہے جس میں اچانک بچھڑے مل جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے اور حقیقی زندگی میں اس طرح بچھڑ کے نہیں ملتے۔"

"میرا خیال ہے تم اپنے دماغ پر زیادہ زور نہ ڈالو تو بہتر ہے۔ اپنا دھیان اپنی طرف لگاؤ۔ کارخانے میں کام نہیں کرنا تو کوئی نوکری ڈھونڈو ویلے (فارغ) بندے کو کسی نے رشتہ نہیں دینا۔"

ارباب بیگ نے خالی کپ میز پر رکھا۔

"اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔" میمونہ کو برا لگا تھا۔ "رشتے کرانے والیوں نے مجھے کتنے ہی رشتے بتائے ہیں۔ بہت اچھے گھرانوں کے لیکن یہ مانے بھی تو تب نا۔"

"میری ایک بات دھیان سے سن لو مونا بیگم! جب تک یہ کسی کام سے لگ نہیں جاتا اس کا رشتہ کہیں بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔" ارباب بیگ نے تنبیہ کی۔

"بھائی صاحب اور شاہ رخ دونوں باپ بیٹا کارخانے میں کام کر رہے ہیں جبکہ میں اکیلا جاتا ہوں۔ اور منافع آدھا آدھا جس روز بھی انہیں خیال آ گیا نا تو تیری یہ عیاشیاں ختم کر دوں گا میں۔"

پھر میمونہ کی طرف دیکھا۔

"سمجھا لو اپنے سپوت کو۔ سیدھے سیدھے کل سے میرے ساتھ کارخانے میں چلے۔" مرتضیٰ نے برا سا منہ بنایا۔

"تمہارے ابا صحیح ہی تو کہہ رہے ہیں، بیٹا کہ تم اپنے ابا جان کے ساتھ کارخانے جایا کرو۔ غیروں کی نوکری میں کیا دھرا ہے۔ کام سیکھو تجربہ حاصل کرو تو تمہارے ابا جان تمہیں الگ کاروبار بھی کروا دیں گے۔"

ارباب بیگ نے ایک تیز نظر میمونہ پر ڈالی۔

"انہیں دوسروں کی فکر سے فرصت ملے تو اپنی فکر کریں۔"

"وہ دوسرے نہیں میرے چچا جان ہیں۔" مرتضیٰ کو موقع مل گیا تھا موضوع تبدیل کرنے کا۔ ایک غیر بندہ آ کر ان کی جائیداد کا وارث بن جائے برداشت نہیں ہو رہا مجھ سے۔"

"غیر تو نہیں لگتا۔ میں نے تو اب غور کیا ہے شیخو کی مشابہت ہے شاہ زیب سے۔" میمونہ نے اپنا خیال ظاہر کیا تو مرتضیٰ جیسے بھڑک اٹھا۔

"کسی سے شکل وصورت مل جانا کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ اس دنیا میں سینکڑوں لوگوں کی شکلیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ ابھی کل ہی میں نے ایک خاتون کو دیکھا آپ کی کاپی لگ رہی تھیں۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ نانا نے کوئی خفیہ شادی کر رکھی تھی اور وہ محترمہ آپ کی سوتیلی بہن تھیں۔"

"بکو مت۔"

میمونہ نے اس کے بازو پر مکا مارا۔ "میرے ابا ایسے نہیں تھے جو چوری چھپے کوئی شادی کرتے انہوں نے زندگی بھر جو کام کیا ڈنکے کی چوٹ کیا۔"

سحرش نے سر جھکا کر اپنی مسکراہٹ چھپائی جبکہ

ارباب بیگ کھل کر مسکرائے تھے میمونہ نے تیز نظروں سے انہیں دیکھا۔ اس سے پہلے کہ ان کا موڈ خراب ہوتا سحرش نے مرتضٰی کو مخاطب کیا۔

"آپ کو کیوں ٹینشن ہو رہی ہے بھائی؟ آپ کی وراثت میں تو کوئی حصہ بٹانے نہیں آیا۔ زل کو ہونی چاہیے ٹینشن یا زین کو۔"

"کیوں زل میری کزن نہیں ہے۔ اگر کوئی نقصان ہو رہا ہے اسے تو مجھے فکر نہیں کرنی چاہیے کیا؟"

اس کی سوالیہ نظریں سحرش کی طرف اٹھیں لیکن جواب ارباب بیگ نے دیا۔

"یہ آپ کا سر درد نہیں ہے بیٹا جی! سحرش صحیح کہہ رہی ہے۔ سالوں بعد میرا بھائی خوش ہوا ہے۔ ٹھیک ہو گیا ہے۔ ہم اس کی خوشی میں خوش ہیں اور رہی شیخو کی بات تو ہمیں رتی بھر بھی شک نہیں ہے کہ وہ زیبی کا بیٹا نہیں ہے۔ کاش وہ ہمیں بتا دیتا تو آج کسی اونچے مقام پر ہوتا باپ کی طرح ہی ذہین تھا۔ اس کے میٹرک کے نمبر دیکھے تم نے تو اس سے آدھے نمبر بھی نہیں لیے تھے۔"

"کیسے بتاتا...... ساری کہانی کا تانا بانا تو اب بنا ہے اس نے جب پتا چلا اسے چچا جان کی شادی اور بیٹے کے متعلق۔"

"بس آج کے بعد میں اس موضوع پر تم سے کچھ بھی نہ سنوں۔" انہوں نے کلائی الٹ کر وقت دیکھا اور کھڑے ہو گئے۔

"میں چلتا ہوں اب۔ مونا تم ذرا میرا بریف کیس دے دو مجھے۔" میمونہ بھی ان کے ساتھ ہی باہر نکلیں۔

"میرا ہی تو سر درد ہے یہ۔" ان کے جانے کے بعد وہ بڑبڑایا۔

"آپ کا سر درد کیسے ہوا مرتضٰی بھائی!" سحرش نے ہاتھ میں پکڑا کپ ٹیبل پر رکھا۔ "چچا جان کو ان کا بیٹا نہ ملتا تب بھی ان کی وارث موجود تھی نا۔"

مرتضٰی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا لیکن اس کے لبوں پر ایک پراسراری مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی تھی۔ سحرش جو اسے بغور دیکھ رہی تھی یکدم ایک پرانی سوچ نے اس کے ذہن کے دروازے پر دستک دی جو میرا کے ساتھ اس کے ربط و ضبط کے بعد ذہن سے نکل گئی تھی۔

"ایسے خواب دیکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا جن کی تعبیر ملنے کا کوئی ذرہ بھر بھی امکان نہ ہو۔ پرائی زمینوں پر نظر نہیں رکھتے بھائی۔" اس نے اٹھ کر خالی کپ ٹرے میں رکھے۔

"میں مرتضٰی ارباب ہوں اور جو خواب دیکھتا ہوں ان کی تعبیر حاصل کرنا بھی جانتا ہوں۔"

بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا اور اس نے چونک کر اسے گھورا۔

"اور یہ تمہیں میرے خوابوں کا کیا پتا اور تم یہ اپنی چھٹانک بھر کی زبان بند رکھا کرو۔ ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا ضروری نہیں ہوتا۔"

"اگر ان خوابوں کا تعلق زل سے ہے تو ان گھٹیا خوابوں کو ابھی اسی وقت اپنی آنکھوں سے نوچ کر پھینک دیجیے۔"

وہ سحرش تھی۔ زیادہ دیر تک بات دل میں رکھنے کی قائل نہیں تھی۔ اگر اس کا خیال صحیح تھا تو بہتر تھا کہ اسی وقت مرتضٰی کو روک دیتی۔

"بکومت!" مرتضٰی کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا تھا۔

"الٹے سیدھے اندازے لگا کر شرمت پھیلاؤ۔ اس وقت دل تو یہی چاہ رہا ہے کہ ہمیشہ کے لیے تمہاری بولتی بند کر دوں۔ تمہاری اس ٹرٹر کرتی زبان کو کھینچ ڈالوں۔"

"اپنا اندازہ غلط ہونے پر مجھے بے حد خوشی ہو گی لیکن آپ بھی یہ مت بھولیں کہ زل کا نکاح زین بھائی سے ہو چکا ہے اور ان کے آنے پر رخصتی ہو جائے گی۔"

اس نے جتانا ضروری سمجھا تھا۔

"اب نہیں آنے والا واپس وہ۔"

بے اختیار ہی مرتضٰی کے لبوں سے نکلا تھا اور سحرش کو اپنے اندازے پر جیسے یقین سا ہوا تھا۔

"نہیں۔" اس کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا تھا۔ تو کیا زین کے دل میں کوئی غلط فہمی پیدا کرنے میں مرتضٰی کا ہاتھ ہے۔ "نہیں۔" اس نے پھر زیرِ لب کہا اور جھک کر ٹرے اٹھایا تب ہی مہرین نے اندر قدم رکھا۔

"سحرش میں کے۔ ای جا رہی ہوں میرے ساتھ چلو گی۔ کچھ پیپرز پر سائن کروانے ہیں۔"

مہرین اختر بانو کے ساتھ ہی لاہور آئی تھی۔ ریحان واپس جا چکا تھا اور اختر بانو اس کے جانے کے دو دن بعد ہی مہرین کے ساتھ آ گئی تھیں۔ شاہ زیب کا بیٹا مل گیا تھا وہ بھائی کی خوشی میں شریک ہونے کے لیے بے چین تھیں بس ریحان کے جانے کا انتظار تھا۔

مہرین نے بعد میں جانا تھا۔ گو اس کا میچ ہو گیا تھا اور اسے ایڈمیشن بھی مل گیا تھا لیکن ابھی اس کے کچھ پیپرز نامکمل تھے اور ویزے کے لیے امریکن ایمبیسی سے کوئی کال بھی نہیں آئی تھی۔ اختر بانو نے تو دو چار دن تک واپس چلے جانا تھا لیکن انہوں نے مہرین سے کہا تھا کہ جب تک ویزا نہیں آتا وہ میکے میں رہ لے۔

دل میں آئے خدشے کو پیچھے دھکیلتے ہوئے سحرش نے مڑ کر دیکھا۔

"ہائے مہر واہ یہ تم ہو کتنی خوب صورت لگ رہی ہو۔"

اس کا سراپا آنکھوں میں کھبا جا رہا تھا۔ ہر چند منٹ بعد ناک سے ڈھلک جانے والی عینک کے بجائے آنکھوں میں لینس لگے تھے جو اس کی لائٹ براؤن آنکھوں کے ہم رنگ تھے۔ نفیس میک اپ نفیس سی ہی جیولری یہ ریحان کی محبت کا اعجاز تھا کہ چند دنوں میں ہی وہ نکھر گئی تھی، ہمیشہ سادہ سی رہنے والی مہرین کی چھب ہی نرالی تھی اس وقت مرتضٰی بھی چند لمحوں کے لیے حیران سا اسے دیکھے گیا تھا۔

"اب نظر نہ لگا دینا۔" مہرین نے مرتضٰی کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"میری نظر تمہیں نہیں لگ سکتی ہاں کسی اور کی نظرِ بد سے بچنے کے لیے بی بی اماں سے دم کروا لینا۔ سچی آج تمہاری جونیئرز تمہیں دیکھ کر پہچان ہی نہ پائیں گی۔ ویسے جا کیسے رہی ہو۔ مطلب ٹیکسی منگوا لینا شیخو بابا سے کہہ کر وین پر تو مت ہی جانا۔"

اس نے کن اکھیوں سے مرتضٰی کی طرف دیکھا جس کی نظریں اب بھی مہرین پر تھیں۔

"امان آ رہا ہے لینے۔"

مہرین کی شادی پر جب ثوبان شاہ آئے تو انہوں نے امان کے منع کرنے کے باوجود اسے گاڑی لے دی تھی۔ ڈرائیور بھی وہاں سے بھجوا دیا تھا۔

"تم چلو میں یہ ٹرے رکھ کر آتی ہوں۔"

"جلدی نہیں ہے آرام سے تیار ہو کر آ جاؤ اب اس اول جلول حلیے میں نہ آ جانا۔"

مہرین کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"پھوپھو نے مجھے اسی اول جلول حلیے میں اپنے صاحب زادے کے لیے پسند کیا تھا۔"

مرتضٰی کے خیال سے اس نے امان کے بجائے پھپھو کا نام لیا تھا اور ٹرے اٹھائے لہراتی ہوئی چلی گئی تھی۔ مہرین بھی جانے کے لیے مڑی تو بے اختیار ہی مرتضٰی نے پکارا۔

"رکو مہرین!" مہرین نے مڑ کر دیکھا۔

"خوش ہونا۔ ریحان نے بھی پرانی وابستگی۔"

"بہت خوش ہوں۔" مہرین سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے اس لیے بات کاٹ دی۔

"واقعی!" مرتضٰی نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"اگر آپ کا خیال تھا کہ میں جوگ لے لوں گی تو آپ کی غلط فہمی ہے۔ اللہ نے مجھے بہترین عطا کیا ہے اور میں جتنا بھی اس کا شکر ادا کروں کم ہے۔ اور ریحان کم ظرف نہیں ہے۔"

مہرین تیزی سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی اور مرتضٰی جل بھن کر کباب ہوا۔

"بنتی ہے...... بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی جلدی وہ مجھے بھول جائے۔"

وہ دانت پیستا ہوا باہر نکلا تو سحرش سیڑھیوں کی طرف جاتے جاتے اس کے قریب رکی زبان کو پھر کھجلی ہوئی تھی۔

"اب پچھتائے کیا ہوت؟"

"بکومت۔"

اس نے اسے گھورا اور تیز تیز چلتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سحرش مسکراتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ آخری پوڑے پر کھڑے ہو کر اس نے دیکھا۔ مہرین بی بی اماں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے جہاں زیب بیگ کے کمرے کی طرف جا رہی تھی، ان کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے باتوں کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ یعنی سب دادا جان کے کمرے میں ہیں جب سے اختر بانو آئی تھیں زیادہ تر سب لوگ، دادا جان کے کمرے میں ہی محفل جماتے تھے۔ وہ بھی صحن عبور کر کے مہرین کے پیچھے ہی جہاں زیب بیگ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا اندازہ صحیح تھا۔

"السلام علیکم۔" اس نے سب کو مشترکہ سلام کیا۔

"میری دوسری بہو بھی آ گئی ماشا اللہ۔"

اختر بانو کی آواز میں چہکار تھی۔

"ادھر میرے پاس آ کر بیٹھو۔"

سامنے والے صوفے پر، ان کے ایک طرف مہرین بیٹھی تھی دوسری طرف وہ آ کر بیٹھ گئی۔ رخساروں پر شفق سی بکھری تھی۔

جہاں زیب بیگ کے بیڈ پر شاہ زیب بیگ بیٹھے تھے اور پائنتی کی طرف شیخو بابا بیٹھے ان کے پاؤں دبا رہے تھے۔ شاہ زیب بیگ کی نگاہیں بار بار ان کی طرف اٹھتی تھیں، ان نظروں میں خوشی اور مسرت کے انوکھے رنگ تھے اس نے بھی شاہ زیب بیگ کو اتنا پرسکون اتنا مطمئن نہیں دیکھا تھا۔

"بس کر دو حامد بیٹا!" جہاں زیب بیگ نے اپنے پیر کھینچے۔

"حامد۔" وہ چونکی پھر فوراً ہی اسے یاد آ گیا کہ شیخو بابا کا اصل نام حامد علی ہے۔ اور اب بی بی اماں سمیت سب ہی انہیں شیخو بابا کے بجائے ان کے اصل نام سے بلاتے تھے، جب کہ شاہ زیب بیگ اب بھی انہیں شہزادہ ہی کہتے تھے۔

"پھپھو آپ ابھی رہیں گی نا کچھ دن؟" اس نے ذرا سا موڑ کر اختر بانو کی طرف دیکھا۔

"میرا ارادہ تو دو دن بعد چلے جانے کا تھا لیکن رات ہی ظفر بھائی کا فون آیا ہے کہ وہ آ رہے ہیں اتوار کو تو اب مل کر ہی جاؤں گی۔"

"چچا جان آ رہے ہیں تو کیا زین بھائی بھی آ رہے ہیں۔"

بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا اور نظریں زنل پر پڑی تھیں، جو دائیں طرف والی کرسی پر خاموش بیٹھی تھی۔

"نہیں زین کا تو نہیں بتایا اس نے اکیلا ہی آ رہا ہے۔ جب سے شاہ زیب کا سنا ہے کہ وہ اب ٹھیک ہے تب سے بے چین ہو رہا تھا آنے کو اور حامد کا سن کر تو وہ رہ ہی نہیں سکا۔"

جہاں زیب بیگ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے لیکن ان کی آنکھوں میں اداسی تھی، شاید وہ بھی زین کے متعلق سوچ رہے تھے۔ یہاں سب تھے لیکن زین نہیں تھا اسے بھی یہاں ہونا چاہیے تھا۔

"کتنا اچھا ہو اگر چچا جان زین کو بھی لے آئیں ساتھ۔ بس پھر ہم اپنی زنل کی دھوم دھام سے رخصتی کریں گے۔ مہندی، مایوں سب فنکشن کریں گے۔" اس کے لبوں سے پھر بے اختیار نکلا تھا۔

"ان شاء اللہ زنل کی رخصتی بھی ہوگی جب وقت آئے گا پہلے تو حامد میاں کی باری ہے یہ بڑے ہیں۔"

بی بی اماں زنل کی ساتھ والی کرسی پر بیٹھی تھیں زین کے ذکر پر زنل کی آنکھوں میں یکدم اتر آنے والی اداسی کو انہوں نے محسوس کیا تھا اور سحرش پر غصہ آیا تھا کہ ذرا جو اس لڑکی میں عقل ہو، بلا سوچے سمجھے جو

منہ میں آتا ہے بولے چلی جاتی ہے۔ اب بھلا یہاں زین اور زرل کی شادی کا کیا ذکر تھا۔

"ہاں بی بی اماں، آپ نے دو تین رشتے بتائے تھے حامد کے لیے اب میں یہاں رک گئی ہوں تو دیکھ لیتی ہوں۔" اختر بانو نے بی بی اماں کو مخاطب کیا۔

"ہاں ضرور میں کل ہی اس رشتے کروانے والی کو بلواتی ہوں۔"

بی بی اماں جیسا کہ چاہتی تھیں موضوع بدل گیا تھا۔

"میں تو سوچ رہی ہوں مونا بھابی سے بھی کہتی ہوں کہ اب مرتضیٰ کے لیے کوئی رشتہ دیکھیں۔ یہی تو عمر ہوتی ہے شادی کی۔"

اختر بانو نے خیال ظاہر کیا تو بی بی اماں بولیں۔

"مونا تو کب سے تیار بیٹھی ہے اس کے سر پر سہرا باندھنے کے لیے لیکن وہ مانے بھی تو تب نا۔ منہ سے کچھ پھوٹتا ہی نہیں کہ کہاں اور کس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"ان کا منہ بند ہی رہے تو اچھا ہے کہیں کوئی دھماکا ہی نہ کر دیں۔"

سحرش منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھی۔

☆☆☆

اور صرف چند دن بعد ہی مرتضیٰ نے دھماکہ کر دیا تھا۔ اس روز ظفریاب، شاہ زیب اور شیخو زیب النساء کی قبر پر چک مرادشاہ گئے ہوئے تھے وہ میمونہ کے کمرے میں بیٹھا تھا۔

"بتا دیجیے گا اپنے مجازی خدا کو کہ مجھے ایک اچھی کمپنی میں جاب مل گئی ہے اور مجھے کارخانے میں کام نہیں کرنا۔ بھلے آدھا منافع ملے یا کم۔"

"سچ مرتضیٰ۔" میمونہ نے خوش ہو کر بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز سے ایک تصویر نکال کر اسے دکھائی۔

"کیسی ہے۔ رقیہ آپا کی سسرالی رشتہ داروں کی بچی ہے بہت سلجھی ہوئی اور پیاری ہے۔"

"مجھے نہیں کرنی کسی بھی سلجھی ہوئی پیاری لڑکی سے شادی پلیز اماں، میرے لیے لڑکیاں دیکھنی چھوڑ دیں۔ پسند کر چکا ہوں میں اپنے لیے لڑکی۔" وہ بیزار ہوا تھا۔

"مہرین کتنی اچھی اور گھر کی لڑکی تھی لیکن نہ جانے تم نے کسے پسند کر لیا ہے۔"

میمونہ کا دکھ کم ہی نہیں ہوتا تھا۔ بچپن سے ہی مہرین کو بہو بنانے کا سوچ رکھا تھا۔

"مہرین کے علاوہ بھی گھر کی بچیاں ہیں ان پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔" وہ چڑا تھا۔

"ہیں..... کیا، کون ..... تمہارا مطلب ہے شانزہ۔"

میمونہ کا منہ حیرت سے کھلا اور پھر بند ہوا۔ لمحہ بھر بعد ہی وہ حیرت کے اس جھٹکے سے باہر آئیں۔

"شانزہ کے لیے تو ایک بار پھر رقیہ آپا نے درخواست کی ہے خود اورنگ زیب بھائی سے بات کی ہے کہ جب ارادہ ہو شانے کی شادی کا، تو ان کے عمر کو ضرور ذہن میں رکھیے گا اور بھائی صاحب نے انہیں پورا اطمینان دلایا ہے کہ جب بھی شانزہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہوئی اور ان کا ارادہ بنا اس کی شادی کا تو ان کی پہلی ترجیح عمر ہوگا۔ اور تمہارا کیا خیال ہے کہ تم ان کی ایک بیٹی کو ٹھکراؤ گے تو وہ دوسری......"

"اف او اماں! میں شانے کی نہیں زرل کی بات کر رہا ہوں مجھے زرل سے شادی کرنی ہے۔"

غیر ارادی طور پر دل کی بات زبان پر آ گئی تھی۔

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔"

ارباب بیگ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس کا آخری جملہ سنا تھا وہ جو دروازے کی طرف پشت کیے کھڑا تھا یک دم مڑا۔ اس کا رنگ لمحہ بھر کے لیے فق ہوا تھا۔ کم از کم ابھی وہ ارباب بیگ کے سامنے یہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

"اور یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم۔"

ارباب بیگ اس کے مقابل کھڑے آگ برساتی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"بکواس نہیں ابا جان، میں زنل سے ہی شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اب مکرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"بے غیرت!"

ارباب بیگ کا تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا تھا۔

"زین بھائی ہے تمہارا۔ چچا کا بیٹا اور تم اپنے بھائی کی منکوحہ پر ہی بری نظر رکھتے ہو۔"

"بری نظر نہیں ابا جان! شادی کرنا چاہتا ہوں اس سے، یوں بھی زین بہت جلد اسے طلاق بھجوانے والا ہے۔"

اس نے رخسار کو دائیں ہاتھ سے سہلایا۔

"بس۔"

ارباب بیگ نے ایک بار پھر ہاتھ اوپر اٹھایا لیکن میمونہ بیگم نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"جوان بیٹے پر ہاتھ اٹھائیں گے اب آپ۔"

"جب زین طلاق بھجوا دے تو دادا جان سے بات کر لیجیے گا۔" وہ رخسار پر ہاتھ رکھے جانے کے لیے مڑ گیا۔

"دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔"

وہ ہاتھ چھڑا کر اس کی طرف لپکے لیکن وہ کمرے سے جا چکا تھا۔

"سنو مونا بیگم! سمجھا دو اپنے سپوت کو اچھی طرح، یہ بات کہ دوبارا اس طرح کی بکواس کی تو منہ توڑ دوں گا اس کا۔ اور اس بات کو یہاں ہی اسی کمرے میں دفن کر دو۔ رخسانہ کو بھی اس بات کا علم نہ ہو۔"

"مرتضیٰ کوئی جاہل ان پڑھ اور بیوقوف تو نہیں ہے کہ یوں ہی منہ سے کوئی بات نکال دے۔ ضرور زین نے کوئی ایسی بات کی ہوگی طلاق۔"

"بس۔" ارباب بیگ نے ہاتھ ذرا سا بلند کیا "اس سے آگے ایک لفظ اور نہیں۔ یہ سب اس کے اپنے ذہن کے خرافات ہیں۔ زین کو میں اچھی طرح جانتا ہوں وہ اس طرح کی بات کبھی نہیں کر سکتا۔ وہ اُدھر کیا چلا گیا اس نے کہانی ہی گھڑ لی۔"

ارباب بیگ غصے کے تیز تھے اور اگر کبھی کسی بات پر غصہ آتا تو ہفتوں ان کا موڈ ٹھیک نہیں ہوتا تھا اس لیے میمونہ نے خود کو مزید کچھ کہنے سے روک لیا۔ ورنہ جی تو چاہ رہا تھا کہ مرتضیٰ کی حمایت میں کچھ تو بولیں۔

"اب سمجھ میں آیا کہ اس کے پیٹ میں زنل کی ہمدردی کے مروڑ کیوں اٹھ رہے تھے۔ بدحرام کہیں کا۔ مفت کی روٹیاں توڑنے کا منصوبہ بنا رکھا ہے اس نے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بیٹھ گئے۔

"جاب کر تو لی ہے اس نے اب!" میمونہ منمنائیں۔

"یہ بھی اس کا کوئی ڈرامہ ہی ہے۔ کہہ دینا اس سے کہ میری نظروں کے سامنے نہ آئے کچھ دن۔ اور میں بات کرتا ہوں ابا جان سے کہ زین کو فوراً بلائیں۔ ظفریاب بھی ادھر ہی ہے تو رخصتی کر دیں زنل کی۔ اتنا عرصہ ہو گیا نکاح کو زنل کی تعلیم مکمل ہو چکی۔ زین کی جاب لگ گئی تھی اب وہاں بھی یقیناً کچھ نہ کچھ کر ہی رہا ہوگا۔ اور جاؤ ایک گلاس پانی لے آؤ میرے لیے۔ دماغ کھول کر رہ گیا ہے۔"

انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑا اور ادھر اپنے کمرے میں مرتضیٰ سر پکڑے بیٹھا تھا۔

یہ کیا بے وقوفی ہو گئی تھی اس سے۔ ابھی زین نے طلاق کے پیپر نہیں بھجوائے تھے اور اس نے منہ سے کیا نکال دیا۔ ابا جان نے تو غصہ کرنا ہی تھا۔ ہاں طلاق کے بعد بات کرتا تو کسی کو اعتراض نہیں ہوتا۔ لیکن اب کیا کروں یہ زین کا بچہ تو وہاں جا کر سو گیا ہے گہری نیند۔ لگ تو ایسے رہا تھا کہ جاتے ہی فوراً طلاق بھجوا دے گا۔ زین کو فون کروں لیکن اس وقت تو زین ابھی سو رہا ہوگا۔ صبح کے تین بجے ہوں گے اور پھر فون کر کے کیا کہوں۔ مجھے جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔ بہت سوچ سمجھ کر ایسی چال چلنی ہوگی کہ زین چند لمحے بھی نہ لگائے زنل کو طلاق بھجوانے میں پھر تو ابا جان میرے احسان مند ہی ہوں گے کہ میں نے ان کی طلاق یافتہ بھتیجی کو اپنانے کی بات کی۔

ار ہ کی چاہا خود اپنے رخسار پر تھپڑ مارے اپنی ر رہ پر بھلا کیا ضرورت تھی زنل کا نام لینے کی۔
غیر ارادی طور پر اس نے اپنے رخسار پر ہاتھ رکھ ۔ ابھی بھی ہلکی جلن محسوس ہو رہی تھی۔ یہ ابا جان کا ہاتھ بھی بڑا بھاری ہے۔ بچپن میں تو بس کہیں ایک آدھ بار ہی انہوں نے کسی شرارت پر مارا تھا۔ ہاں ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہتے تھے اکثر، اس نے اٹھ کر ڈریسنگ کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ ہلکا سا سرخ تھا۔

"بہت جلد ابا جان آپ کو اپنے اس تھپڑ پر افسوس ہوگا جب زین زنل کو طلاق بھجوا دے گا۔"
وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے ہٹ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔
"ایسا کیا کہوں زین سے کہ میری بات سنتے ہی وہ فوراً طلاق بھیج دے۔"
لیکن سوچ سوچ کر کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ "مت ماری گئی تھی میری کہ ناشتہ کر کے اماں کے کمرے میں چلا گیا۔" والٹ خالی تھا اور اسے ان سے پیسے لینے تھے جو وہ ارباب بیگ کے سامنے نہیں مانگ سکتا تھا۔
جانتا تھا ارباب بیگ پیسے تو دے دیں گے لیکن دو چار باتیں بھی ضرور سنائیں گے اور اس وقت اس کا موڈ نہیں ہو رہا تھا کچھ بھی سننے کا۔ اس لیے میمونہ کے کمرے میں چلا گیا تھا اور کیسی غلطی ہو گئی تھی اس سے

کلائی موڑ کر اس نے وقت دیکھا ساڑھے نو بج رہے تھے۔ نئی نئی جاب تھی اور وہ لیٹ ہو گیا تھا۔ جاب کا کوئی شوق نہیں تھا اسے۔ دوسروں کی غلامی پسند نہ تھی اسے اپنا بزنس کرنا تھا۔ لیکن ارباب بیگ کی باتوں سے تنگ آ کر عارضی طور پر یہ جاب کی تھی۔ کہ کم از کم دلے کلے کا لیبل اس پر سے ہٹ جائے اور ارباب بیگ کو یقین آ جائے کہ وہ کچھ کر سکتا ہے۔
اس نے بائیک کی چابی اٹھائی اور دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے چونکا۔
"ہمیرا...... ہاں ہمیرا۔ اس کا دماغ بہت چلتا ہے۔ مجھے ہمیرا سے مدد لینی چاہیے۔ آخر میں نے بھی تو اس کی مدد کی تھی۔ وہ ضرور کچھ نہ کچھ ایسا مشورہ دے گی کہ زین فوراً ہی زنل کو طلاق دے دے۔ آخر وہ بھی یہ ہی چاہتی تھی کہ دونوں میں علیحدگی ہو جائے۔"
اور آفس کے بعد ہمیرا کی طرف جانے کا فیصلہ کر کے وہ مطمئن سا...... کی رنگ انگلیوں میں گھماتا ہوا باہر نکلا۔

"بھائی!" سحرش کی آج ایک ہی کلاس تھی اس لیے وہ یونی نہیں گئی تھی اور برآمدے میں تخت پر کتابیں پھیلائے بیٹھی تھی کہ اسے اپنے اسائنمنٹ کے لیے کچھ نوٹس تیار کرنے تھے۔ وہ ناشتہ کرتے ہی کتابیں لے کر باہر آ گئی تھی کیونکہ آج اسے اختر بانو کے ساتھ انارکلی اور اردو بازار جانا تھا۔
رات یوں ہی پرانی باتیں کرتے ہوئے اختر بانو نے کہا تھا کہ شادی سے پہلے وہ دس پندرہ دن بعد اپنی سہیلیوں کے ساتھ اردو بازار جاتیں تو بانو بازار کی فروٹ چاٹ ضرور کھاتی تھیں۔ خوب ساری کھٹائی ڈلوا کر اب بھی پتا نہیں وہاں فروٹ چاٹ ہوتی ہے یا نہیں...... اور انارکلی میں ٹھڑوں پر پرانی کتابیں اور رسالے بیچنے والے ہوتے ہیں یا نہیں۔ دراصل ہم ان سے پرانے میگزین خریدتے تھے۔ فنون۔ نقوش۔ سیپ وغیرہ۔
"سب کچھ ویسا ہی ہے پھپھو۔ وہی انارکلی ہے۔ وہی اردو بازار اور وہی بانو بازار کی فروٹ چاٹ کچھ بھی تو نہیں بدلا بھلے دنیا میں کتنی بھی تبدیلیاں آ گئی ہوں تو بس ہم کل انارکلی چلیں گے اور مزے کریں گے۔"
"کیا ہے؟" مرتضیٰ ریلنگ پر ہاتھ رکھے کھڑا مڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔
"وہ ابا اتنے غصے میں کیوں تھے کیا آپ کو ڈانٹ رہے تھے۔"
"اپنے کام سے کام رکھا کرو۔"
تو ٹارگٹ مرتضیٰ ہی تھا۔ اس نے مسکرا کر کتاب اٹھالی۔

وہ کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھتا ہوا تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا اس یقین کے ساتھ کہ میمونہ کو ارباب بیگ نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ بات کمرے سے باہر نہ نکلے تو اماں سحرش کو کچھ نہیں بتانے والی تھیں بھلے وہ ان سے کتنا ہی اصرار کرتی لیکن نہیں جانتا تھا کہ میمونہ کو کسی کو تو یہ دھماکہ خیز خبر بتانی تھی تو وہ سحرش کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ اور یہ مرتضٰی کے حق میں اچھا نہیں ہونے والا تھا۔

لیکن مرتضٰی مطمئن سا ہلکے سروں میں سیٹی بجاتا ہوا سیڑھیاں اتر کر صحن میں آیا۔ چند لمحوں کے لیے رک کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی ...... صحن اور برآمدہ خالی تھا۔ ناشتے کے بعد شاید سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔

جیب سے اپنا سیل فون نکالتے ہوئے ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا۔ شیخو بابا کی خالی چارپائی پر ایک خشمگیں نظر ڈالی اور نمبر ملانے لگا۔ اسے اپنے انچارج کو فون کر کے آج دفتر نہ آنے کے متعلق بتانا تھا۔ اسے آج ہر صورت سمیرا سے ملنا تھا۔ گو ارباب بیگ کہہ چکے تھے کہ اس بات کو یہاں ہی اسی کمرے میں دفن کر دو لیکن ان سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ دادا جان سے کہہ کر زین پر دباؤ ڈال کر بلوائیں۔

"السلام علیکم سر!" دوسری طرف سے فون اٹھا لیا گیا تھا۔

"سر مجھے فوڈ پوائیزن ہو گیا ہے تو میں آج نہیں آ سکوں گا۔" آواز میں نقاہت پیدا کر لی گئی۔

"ٹھیک ہے لیکن آپ کا پروبیشن ... ہے تو تنخواہ کٹے گی ... دن کی۔"

"جی سر!" فون بند کر کے اس نے چارپائی کے پائے پر ٹھوکر ماری اور بڑبڑایا۔

"بھلے دو دن کی کاٹ لو...... یہاں پروا کسے ہے۔"

اب وہ سمیرا کا نمبر ملا رہا تھا۔ سمیرا سوئی ہوئی تھی۔ کافی دیر بعد اس نے فون اٹھایا تھا۔

"خیریت اتنے سویرے سویرے کیوں فون کیا۔"

"دس بجنے والے ہیں سویرے کہاں ہے۔ اور خیریت ہے بھی اور نہیں بھی۔ مجھے تم سے بہت ضروری کام ہے۔ ملنا چاہتا ہوں۔"

"کیا کام ہے مرتضٰی، کیا فون پر نہیں بتا سکتے۔"

سمیرا رات دیر سے سوئی تھی یوں بھی وہ جلدی اٹھنے کی عادی نہ تھی۔

"نہیں کہو تو تمہارے گھر آ جاؤں۔"

"نہیں گھر نہیں۔ میں گھنٹے تک آتی ہوں۔ وہاں ہمارے اخبار کے دفتر کے نزدیک والے کیفے میں۔"

دادا جان گھر پر تھے اور وجدان والے واقعے کے بعد وہ بے حد ناراض ہوئے تھے کہ شتر بے مہار کی طرح جدھر جی چاہتا ہے منہ اٹھا کر چل دیتی ہو بس بہت ہو گئی صحافت اور شوق پورا ہو گیا ہے تمہارا تو اب گھر بیٹھو۔ اب ہمارے گھروں کی بچیاں بھی پولیس اور تھانے میں بیان دیتی پھریں گی۔ اور وہ دادا جان کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ڈیڈی کی دوسری شادی کے بعد دادا جان نے اس کا بہت خیال رکھا تھا۔ بہت وقت دیتے تھے اسے۔ گو اس نے ڈیڈی کو وجدان کے متعلق بتا دیا تھا لیکن اسے دادا کی سپورٹ کی بھی ضرورت تھی۔ سو وہ فوراً ہی اٹھی اور جلدی جلدی تیار ہو کر مما کو ثوبیہ کی طرف جانے کا بتا کر گھر سے نکل آئی۔ اور کچھ ہی دیر بعد وہ کیفے میں موجود تھی۔ مرتضٰی پہلے سے ہی وہاں موجود تھا۔

"ہاں بولو!" وہ بیزار سی تھی۔

"ناشتہ منگواؤں؟" اس کیفے میں چائے کے ساتھ ناشتہ بھی مل جاتا تھا۔

"نہیں یہ بتاؤ کیا بات ہے۔"

مرتضٰی نے چائے سرو کرنے والے لڑکے کی طرف دیکھا جسے دو کپ چائے کا وہ پہلے ہی کہہ چکا تھا لڑکے نے چند منٹوں بعد ہی چائے کے دو کپ اور فروٹ کیک لا کر ٹیبل پر رکھا۔

"ہاں بولو بھی اب!" وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

مرتضیٰ نے بہت سوچ سوچ کر لفظوں کا انتخاب کیا۔

"سمیرا! ہم نے جو کچھ بھی کیا تھا۔ اس کا ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا زین نے زل کو طلاق نہیں دی ابھی تک۔ بس بزدل ہو کر ملک چھوڑ گیا۔"

"تو نہ دے۔" سمیرا نے لاپروائی سے کہتے ہوئے چائے کا کپ اٹھایا۔

"تمہارا پرابلم کیا ہے تم بتاؤ؟"

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے سمیرا۔ ہم ایسا کریں کہ زین فوراً طلاق بھیج دے زل کو۔ بلکہ تم کچھ کرو ایسا مجھے تو سمجھ ہی نہیں آ رہا کہ کیسے قائل کروں زین کو تمہارا دماغ تو بہت چلتا ہے نا اس طرح کے معاملوں میں۔"

اس نے بھی چائے کا کپ اٹھایا۔

"تم ایسا کیوں چاہتے ہو۔" اس نے ایک گھونٹ بھرا۔

"تم بھی تو چاہتی تھیں نا ایسا ہی۔" مرتضیٰ کی نظریں اس پر تھیں۔

"ہاں لیکن اب نہیں چاہتی سو زین اسے طلاق دے یا نہ دے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"لیکن مجھے فرق پڑتا ہے۔" بے اختیار ہی مرتضیٰ کے لبوں سے نکلا تھا۔

"کیا فرق پڑتا ہے تمہیں۔"

سمیرا بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی لمحہ بھر کے لیے مرتضیٰ نے سوچا کہ وہ سمیرا کو کچھ نہ بتائے لیکن پھر اس نے اصل بات بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

"میں زل سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"زل سے شادی کرنا چاہتے ہو اپنے ہی چچا زاد بھائی کی بیوی سے.......چچ......چچ۔"

سمیرا کو اندازہ تھا کہ مرتضیٰ نے جو اس کا ساتھ دیا ہے تو یقیناً اس میں اس کا اپنا بھی کوئی مفاد پوشیدہ تھا۔

"صرف نکاح ہوا ہے ان کا۔" وہ جزبز ہوا تھا۔ "اور میں اس کا انتظار کر سکتا تھا چاہے جتنے سالوں بعد بھی زین اسے طلاق دیتا لیکن مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔"

اس نے صبح ہونے والی اپنی حماقت بتائی۔

"تو؟"

اس نے بھنویں اچکائیں۔

"تو میری مدد کرو، کچھ ایسا کرو کہ زین فوراً اسے طلاق بھجوا دے۔"

"زین یہاں سے جا چکا ہے مرتضیٰ اور میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہے تو سوری میں کچھ نہیں کر سکتی۔"

"اگر زل اور زین میں علیحدگی ہو بھی جاتی ہے تو میں وجدان کو بتاؤں گی کہ اس کی وجہ وہ نہیں ہے بلکہ مرتضیٰ ہے۔ تو شاید وہ مجھ سے اپنی ناراضی ختم کر دے مجھے وجدان کو مرتضیٰ سے آج کی ملاقات کے متعلق ضروری باتیں بتانا ہوں گی۔" اس کے ذہن میں خیال آیا۔

"میں زل سے محبت کرتا ہوں سمیرا!"

اسے خاموش دیکھ کر مرتضیٰ نے کہا تو اس نے چونک کر ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ جس میں سے اس نے صرف چند گھونٹ ہی لیے تھے ٹیبل پر رکھ دیا۔

"کیا وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے۔"

"شاید۔" کچھ توقف کے بعد مرتضیٰ نے جواب دیا۔

"وہ تم سے محبت نہیں کرتی مرتضیٰ!" غیر ارادی طور پر اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ "وہ زین سے محبت کرتی ہے۔ اور اگر زین نے اسے چھوڑ بھی دیا تو وہ تم سے شادی نہیں کرے گی۔ تمہیں ابھی اس کی اس محبت کی تھاہ کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ جو وہ زین سے کرتی ہے۔ اس لیے اب تم اسے اور زین کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔"

"طلاق کے بعد اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوگا۔" ایک مبہم سی مسکراہٹ مرتضیٰ کے لبوں پر

دی۔" تم اگر یہ جانتی ہو کہ وہ زین سے محبت کرتی ہے تو یہ بھی جانتی ہوگی کہ وہ دادا جان اور چچا جان سے بھی بہت محبت کرتی ہے۔ تو وہ مجھے رد کر کے انہیں تکلیف نہیں پہنچا سکتی۔ وہ مجھ سے شادی کے لیے مجبور ہو جائے گی اور رہی محبت تو وہ شادی کے بعد خود بخود ہو جائے گی۔ نہ صرف محبت بلکہ وہ ساری زندگی میری احسان مند رہے گی کہ میں نے اس سے ایک طلاق یافتہ لڑکی سے شادی کی۔ تم اسی معاشرے میں رہتی ہو۔ بے شک تمہارا طبقہ اونچا ہے لیکن جانتی تو ہوگی نا صحافی ہو کہ کوئی اس طرح نکاح کے اتنے سالوں بعد طلاق دے دے تو لوگ کیا کہیں گے کہ کچھ تو ہوگا جو زین نے طلاق دے دی۔"

"ہوں!" سمیرا کو افسوس ہوا اس پر جو کر چکی تھی اسے زل سے کوئی دشمنی نہیں تھی، بلکہ وہ زل کو اس کی نرم مزاجی اور اس کی ہمدردانہ فطرت کی وجہ سے کسی حد تک پسند کرتی تھی۔ بدلہ تو اسے صبوحی سے لینا تھا اور زین اس کا بیٹا تھا۔

ذاتی طور پر اسے زین سے بھی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اپنے بھائی سے اسے پتا چلا تھا کہ ابرار شاہ آج کل امریکہ میں اس کے پاس کسی کام سے آئے ہوئے ہیں اور ان کی بیگم اپنے بیٹے زین کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ میں رہ رہی ہیں۔ جو ان کے گھر کے قریب ہی ہے۔ بھائی کا خیال تھا کہ ڈیڈی شاید جان بوجھ کر انہیں وہاں چھوڑ آئے ہیں کہ برسوں بعد وہ اپنے بیٹے سے ملی ہیں تو کچھ وقت ساتھ گزار لیں ورنہ جس کام کے لیے وہ آئے ہیں، اس کے لیے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ فون پر گائیڈ کر دیتے وہ کر لیتا۔

اور وہ بھائی کی بات سن کر خوش ہو گئی تھی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اب صبوحی اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے بیٹے کی اذیت اور تڑپ دیکھے گی۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے۔ نا کہ دوسروں کے لیے گڑھا کھودتے ہوئے آدمی خود اسے گڑھے میں گر جاتا ہے اور وہ خود اس گڑھے میں گر چکی تھی اور ابھی اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ کبھی وہ اس گڑھے سے نکل بھی سکے گی یا نہیں دل میں درد سا اٹھا تھا۔

"اوکے۔ میں چلتی ہوں مرتضیٰ!"

"تو تم میری مدد نہیں کرو گی۔ میں نے بھی تو تمہاری مدد کی تھی۔"

"تمہارا اپنا مفاد تھا۔ تم نے میرے لیے نہیں اپنے لیے میری مدد کی تھی۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"اور اگر میں زل کو اور زین کو بتا دوں سب کہ یہ تم تھیں جو ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر رہی تھیں؟" وہی اس کی جلد بازی کی عادت۔

"تو؟" اس نے عادتاً کندھے اچکائے۔

"مجھے اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن تمہیں فرق پڑے گا کہ تمہارا ان سے خونی رشتہ ہے اور تم میرے جرم میں برابر کے شریک تھے۔ تمہاری مدد کے بغیر تو میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ سب کی نظروں سے گر کر سب کے درمیان کیسے رہو گے۔ مرتضیٰ!" ایک طنزیہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی اور مرتضیٰ کا جی چاہا کہ وہ اپنے بال نوچ ڈالے اب اگر اس کے دل میں ایسا خیال آیا بھی تھا تو زبان پر لانے کی کیا ضرورت تھی، زین کے دل میں بدگمانی پیدا کرنے اور سمیرا کا دیا ہوا خط زل کے کمرے میں رکھنے والا تو وہ ہی تھا۔ برابر کا شریک۔" سمیرا نے ٹیبل پر پڑی گاڑی کی چابی اٹھائی اور بغیر اسے خدا حافظ کہے دروازے کی طرف بڑھی۔

"سمیرا...... رکو پلیز میری بات سنو۔"

ٹیبل پر چائے اور فروٹ کیک کے پیسے رکھتا ہوا وہ اس کے پیچھے لپکا تھا۔

"سوری سمیرا......" لیکن سمیرا نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

"یہ کیا کہہ دیا تھا اس نے...... وہ سمیرا کو ناراض نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کوئی عام سی لڑکی تو نہیں تھی۔ اس کے کام آ سکتی تھی بھی نہ کبھی یہ جاب بھی تو اس کی ہی وجہ سے ملی تھی۔ ورنہ ارباب بیگ کے طعنوں سے تنگ آ کر نہ جانے کتنے دفتروں کی خاک چھان چکا

تھا۔

''میں جذباتی ہو گیا تھا سمیرا!'' وہ تقریباً بھاگتا ہوا پارکنگ تک آیا تھا۔ ''سوری...... پتا نہیں جذبات میں منہ سے کیا کیا فضول باتیں نکل جاتی ہیں۔''

''منہ سے بھی وہی نکلتا ہے مرتضیٰ جو دل میں ہوتا ہے۔'' گاڑی کے دروازے پر ہاتھ رکھے رکھے سمیرا نے اس کی طرف دیکھا۔

''میں زل سے بہت محبت کرتا ہوں۔ تب سے جب اس کا نکاح بھی نہیں ہوا تھا لیکن دادا جان نے اس کا نکاح زین سے کر دیا۔''

اس نے جھوٹ بولا کہ زل کو حاصل کرنے کا کیڑا تو کچھ عرصہ پہلے ہی اس کے دماغ میں پیدا ہوا تھا۔

''مہرین بھی بری نہیں تھی مرتضیٰ!''

لڑکیوں کو بلاوجہ رد کر دینے والے فرد سمیرا کو بہت برے لگتے تھے۔

''ہم اچھے دوست ہیں سمیرا۔ میں نے جو کچھ کہا اس کے لیے معاف کر دو پلیز۔'' وہ جیسے گڑگڑایا تھا۔

''یہ محبت انسان کو بہت خوار کرتی ہے سمیرا۔ میں تمہارے جیسی دوست کو کھونا نہیں چاہتا سمیرا......!''

''اٹس اوکے مرتضیٰ۔'' سمیرا نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گئی۔

''ڈراپ کر دوں؟'' نارمل سے انداز۔ مرتضیٰ نے اطمینان بھرا سانس لیا۔

''نہیں میرے پاس بائیک ہے۔''

اس نے کچھ فاصلے پر موجود بائیک کی طرف اشارہ کیا۔ اب جو کچھ کرنا تھا اسے خود ہی کرنا تھا اور وہ بھی بہت جلد۔

سمیرا نے شیشہ نیچے کیا اور گاڑی پارکنگ سے نکالی اب اس کا رخ وجدان احمد کے گھر کی طرف تھا۔ وجدان کے گھر شفٹ ہونے کے بعد وہ ایک بار گئی تھی لیکن اس کی بہن نے بتایا تھا کہ وہ سو رہا ہے۔ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر اور کیک اسے دے کر وہ واپس آ گئی تھی حالانکہ دل اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے مچل رہا تھا لیکن وہ اس کی بہن سے کیا کہتی کہ بس ایک نظر...... ایک نظر اسے دیکھ کر آ جاؤں گی۔

بجھے دل کے ساتھ وہ واپس آ گئی تھی۔ وہ اس سے خفا تھا۔ بہت زیادہ ناراض تھا۔ اسے اپنی غلطی تسلیم کر کے اسے منانا تھا ہر صورت۔ آج وہ اس سے ملے بغیر گھر نہیں آئے گی۔ اگر وہ سو بھی رہا ہوا تو انتظار کر لے گی۔ لیکن آج قسمت مہربان تھی کہ وجدان کے چاچو اسے لان میں مل گئے تھے۔

''وجدان کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' سلام کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔

''بیٹھو سمیرا بیٹے!'' سلام کا جواب دے کر انہوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ ان کے سامنے والی لان چیئر پر بیٹھ گئی۔

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ بے حد افسردہ سے تھے۔

''ڈاکٹروں کی کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہے بظاہر تو گولیاں جسم سے نکال لی گئی تھیں۔ اور رپورٹ میں یہ ہی آیا تھا کہ کسی آرگن کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ البتہ صحت یاب ہونے میں وقت لگے گا لیکن دو دن سے یورین میں بلڈ آ رہا تھا۔ گردے میں درد بھی بہت تھا۔ کل پھر دوبارہ سے سارے ٹیسٹ ہوئے ہیں۔ اب جس کڈنی اسپیشلسٹ کو دکھایا ہے اس کا خیال ہے کہ ایک گردے کو کچھ نقصان پہنچا ہے لیکن کتنا اس کے لیے پھر دوبارہ سے الٹرا ساؤنڈ، ایم آر آئی...... اور کئی دوسرے ٹیسٹ ڈاکٹر نے بتائے ہیں۔ خیر ٹیسٹ تو ہم آج کروا لیں گے لیکن میں وجدان کو باہر لے جا رہا ہوں۔ ویزا اپلائی کر دیا ہے۔ اس کی رپورٹس بھی اپنے ایک دوست کو بھیج دی ہیں۔ امریکہ کی ایک ریاست میں ہے۔ اسی شعبے میں اس نے اسپیشلائزیشن کی ہے۔ بہت ہی ماہر اور تجربہ کار ڈاکٹر ہے۔ آج کل تو گردوں کی پیوند کاری بھی کر رہا ہے۔ کئی کامیاب آپریشن کیے ہیں اس نے۔''

آنسو روکنے کی کوشش کے باوجود اس کے

رخساروں پر پھسل آئے تھے۔

"کیا وہ جاگ رہا ہے انکل! کیا میں اس سے مل سکتی ہوں۔"

"ہاں میں لے چلتا ہوں۔ بھابی اور بھائی جان اس کے روم میں ہی ہیں۔"

وہ گود میں رکھا اخبار ٹیبل پر رکھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"کیا تم دونوں کے درمیان کوئی ناراضی چل رہی ہے۔"

"ہاں نہیں تو۔" وہ سٹپٹائی تھی۔

"ناراضی کو طول نہیں دینا چاہیے ورنہ بعد میں صرف پچھتاوے رہ جاتے ہیں۔"

وہ درد آشنا تھے۔

"اللہ نہ کرے انکل!" اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"تو پھر اسے منالو۔" اس کے ساتھ ساتھ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انہوں نے مشورہ دیا۔

"کیسے مناؤں انکل، وہ بہت خفا ہے مجھ سے۔"

"کیوں؟" انہوں نے ابرو اٹھائے۔ "کیوں خفا ہو گیا ہے، وہ ایسا تو نہیں ہے کہ بلاوجہ کسی سے ناراض ہو جائے۔"

"غلطی میری تھی۔ میری ایک حرکت اسے بری لگی تھی۔ حالانکہ اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ صرف میرا ذاتی مسئلہ تھا۔"

اس نے اپنے آنسو اندر اتارے۔

"وہ صرف تمہارا ذاتی مسئلہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

وجدان ان کے سامنے سمیرا کے ساتھ محبت کا اقرار کر چکا تھا۔

"محبت اور محبوب کے درمیان دوئی کہاں ہوتی ہے۔ تمہاری غلطی اسے اپنی ہی غلطی لگتی ہو گی۔ اور وہ اس کے نزدیک یقیناً کوئی بڑی بات ہو گی۔ تمہارے نزدیک شاید نہ ہو۔ وہ بہت اصول پسند ہے۔ بہت اعلا سوچ رکھتا ہے۔ زندگی برتنے کا اس کا اپنا ایک معیار ہے۔"

"میں نے اس سے سوری کیا ہے انکل۔ لیکن اس نے مجھے معاف نہیں کیا۔"

وہ اب ٹی۔ وی لاؤنج میں تھے جو خالی تھا۔

"آپ...... آپ بات کریں نا اس سے مجھے معاف کر دے۔ مجھ سے خفا مت ہو۔" دو آنسو لڑھک کر اس کے رخساروں پر آ گئے جنہیں اس نے ہاتھ کی پشت سے صاف کیا۔

"اوکے ریلیکس...... میں بات کروں گا اس سے۔" انہیں اس کی پریشانی اور دکھ کا اندازہ تھا۔

"کم آن!"

وجدان کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا اور اندر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ سر جھکائے ان کے پیچھے اندر داخل ہوئی تھی۔ وجدان لیٹا ہوا تھا۔ اس کی بہن اس کے بیڈ پر ہی بیٹھی اس کا بازو دبا رہی تھی۔ امی بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھی کچھ پڑھ کر دم کر رہی تھیں۔ ابو دائیں طرف والی کرسی پر بیٹھے فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔

"السلام علیکم!"

اس نے مشترکہ سلام کیا تھا۔ وجدان نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ دل میں درد سا اٹھا تھا۔

وجدان کی بہن بیڈ سے اتر کر اس کے قریب آئی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جیسے روتی رہی ہو۔

"آپ چائے لیں گی یا۔"

"نہیں کچھ نہیں۔ میں ناشتہ کر کے آئی ہوں۔"

اس کی امی نے بھی کھڑے ہو کر اسے گلے لگایا تھا۔ اور اپنی خالی کی گئی کرسی پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اس نے چچا جان کی طرف دیکھا اور انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وجدان کے ابو نے فون بند کر کے اس کی طرف دیکھا۔

"کیسی ہو بیٹی؟"

"جی ٹھیک ہوں۔"

یہاں سب ہی اس سے محبت کرتے تھے۔ وجدان کی نسبت سے وہ سب کو عزیز تھی۔

"بچے سب چلے گئے؟" اس کے ابو اب اس کے چچا سے مخاطب تھے۔

"جی اتنے دنوں سے اسکول، کالج نہیں جا رہے تھے تو پڑھائی کا حرج ہو رہا تھا۔ بڑے تو ڈرائیور کے ساتھ چلے گئے تھے۔ چھوٹوں کو میں خود چھوڑ آیا ہوں۔"

چار کنال کے اس گھر میں وجدان کے تایا اور دونوں چچا بھی اپنی اپنی فیملی کے ساتھ اپنے اپنے پورشنز میں رہتے تھے۔

"ابھی میری ڈاکٹر قریشی سے بات ہوئی ہے۔ تم پچھلی رپورٹس لے کر ان کے پاس چلے جانا۔ بارہ بجے کا ٹائم دیا ہے انہوں نے۔ میں ذرا ایک چکر آفس کا لگا آؤں۔ سیلز منیجر کا فون آیا تھا کچھ ضروری فائلوں پر دستخط کرنے ہیں۔"

وہ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے باہر چلے گئے تو وجدان کی امی نے اس کی طرف دیکھا۔

"میں ابھی آتی ہوں۔ تم وجدان سے باتیں کرو۔" پتا نہیں چچا جان نے اشارا کیا تھا یا وہ خود ہی باہر چلی گئی تھیں اس کی بہن پہلے ہی چلی گئی تھی۔ چچا بھی اس کی امی کے پیچھے ہی چلے گئے تھے۔ اب وہ کمرے میں وجدان کے ساتھ اکیلی تھی۔

"وجدان پلیز، آنکھیں کھولو میری طرف دیکھو۔"

وجدان نے آنکھیں کھولیں لیکن وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ اس کی نظریں چھت پر تھیں۔

"پلیز وجدان ایسا مت کرو۔ میں نے اپنی غلطی مان لی ہے ہاں میں نے بہت غلط کیا۔ بہت برا کیا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں معافی مانگ لوں گی زلل سے، زین سے۔ تم ٹھیک ہو جاؤ تو میں خود تمہارے ساتھ جا کر سب بتا دوں گی۔ اعتراف کر لوں گی۔ جو تم کہو گے ویسا ہی کروں گی بس مجھ سے اس طرح خفا مت ہو میری آنکھوں میں دیکھو جہاں صرف تمہارا ہی عکس ہے۔ تمہاری محبت کی روشنی ہے۔ تم نے منہ موڑ لیا تو یہ روشنی بجھ جائے گی۔ میں مر جاؤں گی۔" وہ رو رہی تھی۔

"میں نے تم سے کہا تھا میرا! تمہارے آنسو اس آگ کو بھڑکا دیتے ہیں جو تم نے لگائی ہے۔ تمہارے آنسو بھی تمہاری طرح سازشی اور جھوٹے ہیں۔ مجھے ان پر اعتبار نہیں ہے۔" وہ اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

"میں اپنی غلطی تسلیم کر رہی ہوں وجدان!"

"غلطی..... تم اسے غلطی کہتی ہو..... یہ غلطی نہیں جرم ہے۔ تم نے جرم کیا ہے۔ گناہ کیا ہے۔" اس کی آواز قدرے بلند ہوئی تھی۔

"ہاں میں نے گناہ کیا....." اس نے پھر اعتراف کیا تو وجدان نے کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ روئی روئی آنکھوں میں اس کی ناراضی کی اذیت تو تھی لیکن ندامت یا شرمندگی نہیں تھی۔ اسے دکھ ہوا۔

"کسی کو تکلیف دینا یا کسی کا نقصان کرنا کسی کی مالی تباہی یا موت کا سامان کرنا کسی میں رنجش پیدا کرنا میں اس کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم ایسا کیسے کر سکتی ہو مجھے ابھی تک یقین نہیں ہے۔ اور تم اپنے کیے پر نادم بھی نہیں ہو۔"

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں شرمندہ ہوں، نادم ہوں۔" اس نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹا دیا۔

"تم نے جو کانٹے ان کے راستوں میں بکھیرے ہیں جب تک میں ان کو چن نہ لوں، تم پلیز میرے سامنے مت آنا۔" اب وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں پہلے ہی بہت تکلیف میں ہوں میری تکلیف میں مزید اضافہ مت کرو۔ سوچا تھا۔ کچھ دنوں

ہی لندن جا کر ساری صورت حال زین کو بتاؤں گا
کوشش کروں گا کہ وہ میرا اعتبار کرلے۔ لیکن پتا نہیں
ب جا پاؤں گا۔ جا بھی پاؤں گا یا نہیں لیکن اگر نہ رہا
تو مرنے کے بعد بھی تمہیں معاف نہیں کروں گا۔"

"ایسا تو نہ کہو وجدان!" وہ تڑپی تھی۔

"تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

وجدان نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں ایسی پتھریلی اجنبیت تھی کہ سمیرا کو اپنا دل پھٹتا ہوا سا محسوس ہوا۔ لیکن اس نے فوراً ہی خود کو کمپوز کر لیا۔ اسے یاد آیا کہ اسے وجدان سے اس شخص کے متعلق بھی پوچھنا تھا جس سے ملنے کے لیے وہ پریس گیا تھا اسے یقین تھا کہ اس پر گولیاں چلانے والے یقیناً اس کے ہی بندے ہوں گے اور اسے انہیں معاف نہیں کرنا تھا۔ وہ ایسی ہی تو تھی۔

"تم کس سے ملنے گئے تھے؟"

"اب تم اس کا کھوج لگانے مت لگ جانا۔"

وجدان اس کی طرف دیکھے بغیر بھی اس کا ذہن پڑھ سکتا تھا۔

"مجھ پر کوئی احسان کرنے کی ضرورت نہیں ہے سمیرا بیگم، میں اپنے معاملات اللہ پر چھوڑ دیا کرتا ہوں۔ اور میرا رب ظالموں کا خوب ہی حساب لیتا ہے۔ جلد یا بدیر۔" اس نے دیوار کی طرف کروٹ لے لی۔

سمیرا کے ہونٹ کچھ کہنے کی کوشش میں کانپ کر رہ گئے وہ آنسو پیتی ہوئی باہر نکلی۔ اور ٹھٹک کر رک گئی۔ لاؤنج خالی نہیں تھا۔ سامنے ہی صوفے پر وجدان کی امی بیٹھی رو رہی تھیں، اس کی بہن ان کے گلے میں بانہیں ڈالے انہیں خاموش کراتے ہوئے خود بھی روئے جا رہی تھی۔ سامنے ہی اس کے چچا سر جھکائے کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں سے چھلکتے کرب نے ان کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔

"پلیز بھابی! حوصلہ کریں اس طرح تو ہمت نہ ہاریں۔ ڈاکٹر ہادی نے ایک خیال ظاہر کیا ہے کوئی کا بات نہیں کی ہے۔"

ابھی کچھ دیر پہلے امریکہ ڈاکٹر ہادی سے فون پر بات ہوئی تھی تو انہوں نے خیال ظاہر کیا تھا کہ ہو سکتا ہے ایک گردہ ڈیج ہو گیا ہو اور دوسرے کو بھی کچھ نقصان پہنچا ہو اگر یورین پاس نہیں ہو رہا تو کیا وہاں کے ڈاکٹر نے ڈائلیسز تجویز کیا ہے۔

چونکہ وہاں آدھی رات تھی اس لیے انہوں نے پھر تفصیل سے بات کرنے کو کہا تھا۔

"اور فرحی، تم بجائے بھابی کو تسلی دینے کے خود رونے لگی ہو۔"

"کیا اب بھائی کے ڈائلیسز (dialysis) ہوں گے بہت تکلیف ہوتی ہے نا۔" وہ ماں کے آنسو پونچھ رہی تھی۔

"شاید۔" چچا جان نے مڑ کر اسے دیکھا جو بھی ہوئی سی کھڑی تھی۔

"وجو کے ڈاکٹر ابھی اس کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ شاید آج فیصلہ کریں۔"

"میرا...... میرا گردہ دے دیں بھائی کو چاچو پلیز۔ بھائی کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔"

فرحی تیزی سے اٹھی تھی اور چچا کا بازو جھنجوڑ رہی تھی۔

"میں مر گیا ہوں کیا؟" انہوں نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

"اور ہم...... کیا ہم کوئی نہیں ہیں وجدان کے

یکدم لاؤنج کا دروازہ کھلا تھا اور ایک ساتھ کئی لوگ اندر آئے تھے۔ یہ اس کے چچا اور تایا کی فیملی تھی شاید۔

"ابھی رانی ادھر سے ہو کر گئی ہے تو اس نے بتایا۔"

وہ ادھیڑ عمر کی خاتون وجدان کی امی کے پاس بیٹھ گئی تھیں۔ شاید وجدان کی تائی جان تھیں۔

"آپ پریشان نہ ہوں وجدان کو کچھ نہیں ہو گا بھابی ہم ہیں نا۔ اپنی عمر گزار چکے۔ بھلے ہمارے دونوں گردے لے لیں۔"

"چاچو، پلیز ابھی چلیں میرے ساتھ ہاسپٹل۔

مجھے یقین ہے میرا بلڈ گروپ، ٹشوز وغیرہ سب میچ ہو جائیں گے۔"

وہ سولہ سترہ سالہ لڑکا وجدان کے چچا کا بازو ہلا رہا تھا۔ وہ بھی کہنا چاہتی تھی کہ میرا دل جگر گردے سب لے لو۔ لیکن اس کی آواز حلق سے نہیں نکلی تھی۔

یہ کون سی دنیا تھی کیسے لوگ تھے یہ۔ یہاں محبتوں کا دریا بہتا تھا۔ محبتیں بٹتی تھیں۔ وہ دوسروں کے خلاف سازشیں کرنے والی وہ اس ماحول میں مس فٹ تھی۔ اگر وہ اس پر اعتبار نہیں کر رہا تھا تو صحیح کر رہا تھا۔ کیا خبر وہ محبتوں کی اس جنت کو اپنی کسی سازش سے اجاڑ دیتی۔

"پیچھے ہٹو تم چھوٹے ہو۔ میں بڑی ہوں اور تم سے زیادہ صحت مند بھی ہوں۔ اگر گردہ دینا ہوا تو میں دوں گی۔"

یہ کسی لڑکی کی آواز تھی۔ وہ ایک دم پیچھے ہوئی تھی۔

"ایسا کرو تم سب اپنا اپنا ایک گردہ دے دینا۔ وجو کے جسم میں جہاں جہاں فٹ ہوئے ایڈجسٹ کروالیں گے۔ جب پھر بھی کوئی شوشہ آئی تو مستقبل میں کام آئیں گے۔"

آنسو بھری آواز میں چچا نے ماحول میں پھیلی افسردگی کو دور کرنا چاہا۔

"آپ بھی چاچو...... ہم سیریس ہیں۔"

ایک ساتھ کئی آوازیں آئی تھیں۔ وہ غیر محسوس انداز میں لاؤنج سے باہر نکل گئی۔ اور تقریباً دوڑتی ہوئی گیٹ تک آئی تھی اور جب وہ گاڑی کا دروازہ کھول رہی تھی تو آنسو تیزی سے اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

یہ محبتیں انمول تھیں بے مثل تھیں۔

کیسے لوگ تھے یہ محبتوں سے گندھے زنجیر کی طرح ایک دوسرے سے جڑے۔ اور ایک اس کے خاندان کے لوگ تھے چچا، تایا ماموں سب ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ اسمبلی کی سیٹوں کے لیے اندر ہی اندر سازشیں کرتے

......اور اسے اس خاندان کا حصہ بننا تھا لیکن اس نے کیا کیا تھا۔ زین اور صبوحی کے ساتھ نہیں۔ اپنے ساتھ۔

اس نے زور سے سیٹ پر مکہ مارا اور اسٹیئرنگ پر سر رکھ کر رونے لگی۔

☆☆☆

اس کی آنکھ پراٹھوں اور آملیٹ کی خوشبو سے کھلی تھی۔

"لگتا ہے بی بی اماں آج صبح صبح ہی ناشتہ بنانے لگی ہیں۔" اس نے کسل مندی سے کروٹ بدلی اور پھر یک دم چونک کر اٹھ بیٹھا۔

یہ موروں والی حویلی نہیں تھی اور وہ لندن میں اپنے اپارٹمنٹ میں تھا۔ یہ اپارٹمنٹ ابرار شاہ کی ہی ملکیت تھا اور ان کے گھر کے نزدیک ہی تھا چونکہ وہ الگ رہنا چاہتا تھا۔ تاکہ ان کی لائف ڈسٹرب نہ ہو، اس لیے ابرار شاہ نے اس کی رہائش کا بندوبست اس اپارٹمنٹ میں کر دیا تھا گو ظفر یاب چاہتے تھے کہ وہ ان کے ساتھ ان کے گھر میں رہے۔

یہاں آنے کے بعد ظفر یاب سے اس کی دوبار ملاقات ہوئی تھی۔ ایک بار وہ خود اس سے ملنے آئے تھے اور دوسری بار وہ ان کے پاس دو دن رہنے کے لیے گیا تھا۔ لیکن فی الحال اس کا ارادہ ان کے ساتھ مستقل رہنے کا نہیں تھا۔ ابھی اسے یہاں ہی رہنا تھا صبوحی کے نزدیک جن سے دن میں دو تین بار ملاقات ہو جاتی تھی۔ اور آج کل تو وہ اس کے اپارٹمنٹ میں ہی رہ رہی تھیں کیونکہ ابرار شاہ اپنے کسی کام کے سلسلے میں امریکہ گئے ہوئے تھے اور ان کی واپسی تقریباً چار ہفتے بعد تھی۔

☆☆

(آخری قسط ان شاء اللہ آئندہ)

ہاتھ خالی ہیں ترے شہر سے جلتے ہوتے
جان ہوتی تو مری جان لٹاتے جلتے

اب تو ہر ہاتھ کا پتھر ہمیں پہچانتا ہے
عمر گزری ہے ترے شہر میں آتے جلتے

اب کے مایوس ہوا یاروں کو رخصت کر کے
جا رہے تھے تو کوئی زخم لگاتے جلتے

رینگنے کی بھی اجازت نہیں ہم کو ورنہ
ہم جدھر جلتے نئے پھول کھلاتے جلتے

میں تو جلتے ہوئے صحراؤں کا اک پتھر تھا
تم تو دریا تھے مری پیاس بجھاتے رہے

مجھ کو رونے کا سلیقہ بھی نہیں ہے شاید
لوگ ہنستے ہیں مجھے دیکھ کے آتے جلتے

ہم سے پہلے بھی مسافر کئی گزرے ہوں گے
کم سے کم راہ کے پتھر تو ہٹاتے جاتے

راحت اندوری

کیا تیرا میرا جوڑ سجن

میں دھرتی میلی میلی سی
تُو اُجلا اُجلا پریم گگن
تُو چنچل شور ہواؤں کا
میں کنکر کوتی پاؤں کا
تُو سات سُروں کا روپ کوئی
میں تپتی جلتی دُھوپ کوئی
تُو خوشبو نرمل کلیوں کی
میں دُھول اُداس گلیوں کی
تُو صبح کا پیغام کوئی
میں بوجھل ڈھلتی شام کوئی
تُو چاند نگر کی حور کوئی
میں آس میں بیٹھا دور کوئی
میں دھرتی میلی میلی سی
تُو اُجلا اُجلا پریم گگن
کیا تیرا میرا جوڑ سجن

فاکر شجاع آبادی

شگفتہ جاہ

حسنِ تحریر یادگار تحریر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جس رات مجھے معراج ہوئی (اس سفر کے دوران میں) میرا گزر ایسے افراد کے پاس سے ہوا جن کے پیٹ مکانوں کی طرح (بڑے بڑے) تھے، ان (پیٹوں) میں سانپ بھرے ہوئے تھے جو ان کے پیٹوں کے باہر سے نظر آ رہے تھے۔ میں نے کہا: "جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟" جبریل علیہ السلام نے فرمایا: یہ سود کھانے والے ہیں۔"

(سنن ابن ماجہ)

رشتوں کو جوڑنے والے کا اجر

سعید ابن مسیب رحمتہ اللہ سے کہا گیا کہ ابراہیم بن محمد بن طلحہ فوت ہو گئے ہیں۔
انہوں نے پوچھا "کیسے فوت ہوئے؟"
ان سے کہا گیا: "کہ ان کا محل ان پر گر گیا اور وہ اس کے اندر تھے۔"
انہوں نے کہا "ممکن نہیں۔"
تو جب لوگوں نے محل کو ان پر سے ہٹایا اور ان چیزوں کو ہٹایا جو ان پر گری تھیں تو انہوں نے ابراہیم کو نکالا اور انہوں نے انہیں زندہ پایا ان کی نہ ہی کوئی ہڈی ٹوٹی تھی اور نہ ہی ان کے جسم پر کسی قسم کی خراش آئی تھی۔
سعید سے جب پوچھا گیا: "آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہ دب کر نہیں مر سکتے؟" انہوں نے کہا: "کیونکہ وہ رشتوں کو ملانے والے ہیں اور جو رشتوں کو ملانے والا ہوتا ہے اسے بری موت سے بچا لیا جاتا ہے۔"
اپنے رشتوں کو جوڑیے اگرچہ وہ آپ سے نہ جڑیں۔

حنین بن اسحاق

حنین بن اسحٰق خلیفہ مامون الرشید کے زمانے میں بڑے مترجمین میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کے یونانی سے عربی زبان ترجمے کا واقعہ دلچسپ ہے۔
مامون الرشید نے ان کو اپنے دربار میں بلایا اور کہا۔
"ہم تمہیں ہر کے بدلے میں وزن کے برابر سونا دیں گے۔"
حنین نے یہ شرط مان لی۔ اس نے ترجمے پر بہت توجہ دی اور تحقیق اور وضاحت سالوں لگا کر اپنا کام انجام دیا۔
جب پہلی کتاب کا ترجمہ مکمل ہوا تو خلیفہ نے اس کا وزن کرایا اور کتاب جتنے وزن کا سونا دینے کا حکم دیا۔
مامون الرشید کے درباریوں نے اعتراض کیا کہ حنین نے وقت ضائع کیا اور اس کام میں سالوں لگا دیے۔
اس پر خلیفہ نے کہا۔
"ایسا ترجمہ جو آنے والی نسلوں کو علم دے وہ وقت اور سونے سے کہیں قیمتی ہے۔"
اور حنین کو پورا سونا دیا گیا۔
حنین نے جالینوس اور بقراط کی کتابوں کا ترجمہ کیا تھا اس کے علاوہ طب، منطق اور فلسفہ میں بھی کئی کتابیں لکھیں۔
خلیفہ وقت نے ایک بار اس کی آزمائش کے لیے اس سے کہا۔
"کوئی ایسا قاتل زہر بتاؤ جو کھاتے ہی کام تمام کر دے۔"
حنین نے جواب میں عرض کی۔

"خلافت پناہ! میں تو صرف وہ دوائیں جانتا ہوں جو صحت کی محافظ ہیں۔"

خلیفہ اس جواب سے بہت خوش ہوا اور حنین کو اپنا طبیب خاص بنالیا اور انعام و اکرام سے نوازا۔

سنہری باتیں

☆غیرت ایک اچھی بات ہو سکتی ہے جب یہ مستقل اصول اور اخلاقیات کے ساتھ جڑی ہو۔

☆طنز وہ آئینہ ہے جس میں دیکھنے والا اپنے سوا ہر کسی کے چہرے کو دیکھتا ہے۔

☆احسان کی خوبی یہ ہے کہ اسے جتایا نہ جائے۔

☆علم کے ساتھ عمل اور دولت کے ساتھ شرافت نہ ہو تو دونوں بے کار ہیں۔

☆پرہیز علاج سے بہتر ہے۔

☆محنت اتنی خاموشی سے کرو کہ تمہاری کامیابی شور مچادے۔

☆غرور تباہیوں کا پیش خیمہ ہے۔

☆ہمت ہارنا ناکامی کا پہلا قدم ہے۔

☆زیادہ مال و دولت اکثر فتنوں اور کلفتوں کا سبب بنتا ہے۔

مولانا رومی کی حکایت

کسی شہر میں دو قومیں رہا کرتی تھیں جو اپنے اپنے ہنر میں ماہر تھیں۔ رومی (فن کار لوگ) اور چینی (کاریگر لوگ) میں جھگڑا ہو گیا کہ "کون زیادہ ہنر مند ہے؟"

بادشاہ نے کہا۔

"تم دونوں کو موقع دیا جائے گا۔ سامنے والے کمروں کی دیواریں سجاؤ پھر فیصلہ ہوگا۔"

چینیوں نے اپنا کمرہ خوب صورت رنگوں اور نقش و نگار سے بھر دیا۔

رومیوں نے صرف دیوار صاف کی، اسے رگڑا اور چمکا دیا، کچھ بھی نہیں بنایا۔

جب دونوں کا مقررہ وقت پورا ہو گیا تو بادشاہ پہلے چینیوں کے کمرے میں گیا۔ وہ خوب صورتی سے بھرپور تھا۔

پھر رومیوں کے کمرے میں آیا۔ وہاں بس ایک چمک دار دیوار تھی۔

مگر جیسے ہی دروازہ کھلا چینیوں کے کمرے کی خوب صورتی، روشنی میں منعکس ہو کر رومیوں کے کمرے میں جگمگا اٹھی۔

رومیوں نے کہا۔

"ہم نے کچھ نہیں بنایا صرف دیوار کو صاف کیا۔" دل بھی ایسا ہو تو وہ اللہ کی صفات کا عکس بن جاتا ہے۔

علم سیکھنا کافی نہیں دل کو صاف بھی رکھو کیونکہ گرد آلود دل حق کو نہیں پہچانتا جیسے دھندلے آئینے میں چہرہ نظر نہیں آتا۔

اچھے موسموں کا دوست

صرف اچھے موسموں کا دوست، اس بینکار جیسا ہوتا ہے جو دھوپ کے وقت چھتری دے دیتا ہے لیکن بارش کے وقت واپس لے لیتا ہے۔

دو آدمی جنگل میں سفر کر رہے تھے۔ اچانک ایک ریچھ ان کے سامنے آ گیا۔ ایک آدمی تیزی سے درخت پر چڑھ گیا۔ دوسرا آدمی درخت پر چڑھنا نہیں جانتا تھا۔ وہ زمین پر اس طرح لیٹ گیا، جیسے مردہ ہو۔ ریچھ نے قریب آ کر اسے سونگھا اور اس کے گرد گھومنا شروع کر دیا۔ وہ آدمی بہت ڈرا لیکن دم سادھے پڑا رہا۔ آخر ریچھ نے اس کے کان میں سرگوشی کی اور چلا گیا۔

درخت پر چڑھنے والے آدمی نے نیچے اتر کر اس سے پوچھا۔ "ریچھ نے تم سے کیا کہا تھا؟"

اس آدمی نے کہا: "ریچھ نے کہا تھا کہ ایسے دوست پر بھروسا مت کرو جو تمہیں خطرے میں چھوڑ دے۔"

اس کہانی کا سبق سورج کی روشنی کی طرح واضح ہے۔ دو طرفہ اعتبار اور بھروسا دوستی کی بنیاد ہے۔

☆☆



ویلے

لڑکا۔ ”کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟“

لڑکی۔ ”پہلے یہ بتاؤ کہ کیا تم مجھے میری مرضی کے مطابق ہر کام کرنے دو گے؟“

لڑکا۔ ”ہاں ہاں کیوں نہیں؟“

لڑکی۔ ”کبھی میری کسی بات پر اعتراض تو نہیں کرو گے؟“

لڑکا۔ ”ہرگز نہیں۔“

لڑکی۔ ”میری امی کو اپنے گھر میں رہنے دو گے؟“

لڑکا۔ ”یقیناً۔“

لڑکی۔ ”جتنی رقم مانگا کروں گی، بلا چوں چرا اں مجھے دے دیا کرو گے؟“

لڑکا۔ ”بسر و چشم!“

لڑکی۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں تم جیسے جھوٹے انسان سے شادی نہیں کر سکتی۔“

ہرجانہ

ایک خاتون ریل میں سفر کے دوران کھڑکی بند کرتے ہوئے اپنی انگلی کٹوا بیٹھیں۔ انہوں نے ریلوے کے محکمے پر پچاس لاکھ ہرجانے کا دعویٰ کر دیا۔

مقدمے کی سماعت کے دوران جج نے خاتون سے سوال کیا کہ ”محترمہ! ایک انگلی کے پچاس لاکھ روپے آپ کی انگلی کچھ زیادہ قیمتی نہیں تھی؟“

خاتون نے فوراً جواب! ”یہ تو میں نے بہت کم کا دعویٰ کیا ہے میری وہ انگلی تو اس سے بھی زیادہ قیمتی تھی کیوں کہ اس انگلی پر اپنے کروڑ پتی شوہر کو نچایا کرتی تھی۔“

وجہ

”آپ کے شوہر کی موت کیسے ہوئی؟“

بیوی: ”زہر کھانے سے۔“

وکیل۔ ”لیکن جسم پر نشان کیسے ہیں؟“

بیوی۔ ”کھا نہیں رہا تھا تو......“

افسوس

ایک چائنیز انجینئر کو اس کے پاکستان دوست نے جلیبی کھانے کے لیے دی چائنیز جلیبی دیکھ کر رونے لگا پاکستانی پریشان ہو گیا اور اس نے پوچھا۔

”کیا ہوا کیوں رو رہے ہو؟“

اس پر چائنیز نے جلیبی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”یہ تو لکھا ہے کہ آپ کی ماں کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔“

گھبراہٹ

بیوی اچانک میکے سے گھر پہنچی اور پہنچتے ہی چھری تیز کرنے لگی۔ شوہر نے گھبرا کر پوچھا۔

”یہ کیا کر رہی ہو؟“

بیوی نے اطمینان سے جواب دیا ”تمہارے پلنگ کے نیچے جو سینڈل دکھائی دے رہی ہیں اگر ان میں جیتے جاگتے پاؤں نہیں ہیں تو میں ناشتے کے لیے ڈبل روٹی کاٹوں گی۔“

تعداد

سروے کرنے والے ایک صاحب نے سرکاری دفتر کے انچارج سے پوچھا۔

”آپ کے ہاں کتنے آدمی کام کرتے ہیں؟“

انہوں نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر جواب دیا۔

”سو میں سے دو تین۔“

☆☆

واصفہ سہیل



ریحانہ وقاص.......................ہری پور

غیر کو برا کہہ دوں، غیر تو نہیں ایسا
آپ ہی سے شکوہ ہے، آپ ہی کے بارے میں
بے وفا کہا مجھ کو آپ نے بجا لیکن
اس طرح نہیں کہتے ہر کسی کے بارے میں

فاکہہ سہیل.......................کراچی

یہ بارش، یہ ہوا، یہ دھنک، یہ موسم
ترس کس سے محبت تھی تری ذات سے پہلے

روبینہ بٹ.......................پنڈی

عشق پر چھائیں جس پہ آجائے
دو جہان چھوڑ چھاڑ دیتا ہے
صرف اک دل کا رونا روتے ہو
غم تو بستی اجاڑ دیتا ہے

شہلا اختر.......................لانڈھی

یادوں کے یہ جگنو، میری آنکھوں میں نظر بند
دیکھو میرے آنسو، میری آنکھوں میں نظر بند
چہرے کا وہ اک پھول ہے اب تک تر و تازہ
اب تک ہے وہ خوشبو، میری آنکھوں میں نظر بند

سلیمہ بانو.......................سکھر

فراق سے بھی گئے ہم وصال سے بھی گئے
سبک ہوئے ہیں تو عیش ملال سے بھی گئے
اسی نگاہ کی نرمی سے ڈگمگائے قدم
اسی نگاہ کے تیور سنبھال سے بھی گئے

صدف عمر.......................کراچی

کیا عجب ہے کہ ایک عمر جہاں گزار آئے
آج اس گلی سے کترا کے گزر گئے ہیں
ہم پہ نجانے تجھ سے مل کے کیا گزرے
ہم تیری غزل لکھ کے ہی بکھر گئے ہیں

رافعہ.......................اسلام آباد

تو کیا یہ دل سے محبت کا اعتراف نہیں
کسی بھی بات پہ اب تجھ سے اختلاف نہیں
ہمیں خبر تھی، بچھڑنا ہے ایک دن آخر
سو تیرا چھوڑنا ایسا بھی انکشاف نہیں

صائمہ.......................کراچی

زخم دنیا بھی ہے ہرے رکھتی
تم پہ دارومدار تھوڑی ہے
میں بلاؤں وہ لوٹ آئے گا
خود پہ یہ اعتبار تھوڑی ہے

سبینہ اشرف.......................فیصل آباد

خفا نہ ہو تو دکھادیں ہم آئینہ تم کو
ہمیں قبول کہ ساری خطا ہماری ہے

میمونہ علی.......................پنڈی

کسی قدر بے ساختہ پن چاہتی ہے زندگی
شاخ سے اڑتا پرندہ دیکھنا تو سوچنا

صبا اکبر.......................شہداد پور

ملن کی ساعت کو اس طرح سے امر کیا ہے
تمہاری یادوں کے ساتھ تنہا سفر کیا ہے
گھٹن بڑھی تو پھر اسی کو صدائیں دی ہیں
کہ جس ہوا نے ہر اک شجر کو بے ثمر کیا ہے

نورا اکبر.......................پنڈی

میں اپنی زندگی کی آخری سیڑھی پہ بیٹھا ہوں
مجھے مہلت ذرا سی ہے کبھی ملنے چلے آؤ

شائستہ نسرین.......................کراچی

کب نکلتا ہے کوئی دل میں اتر جانے کے بعد
اس گلی کے دوسری جانب کوئی رستہ نہیں

فریحہ.......................میرپور

غم آرزو میری جستجو میں سمٹ کے آگیا روبرو
یہ سکوت مرگ ہے کس لیے، میں جواب دوں تو سوال کر
میرے درد کا، میرے ضبط کا، میری بے بسی میرے صبر کا
جو یقین نہ آئے تو دیکھ لے تو ہوا میں پھول اچھال کر

سحر مراد.......................کراچی

ہم پھر سے آگئے ہیں خزاں کی پناہ میں
گل پاش ٹہنیوں کو ثمر بار دیکھ کر

☆☆

بقیہ خط آپ کے

پوچھنا اچھا نہیں لگتا۔ بتا دیں پلیز "ماہ الملوک" پڑھا۔ تیمو بابا تو اپنے باپ کے گھر میں ہی ہے۔ لیکن ان کے ساتھ مندر نے اچھا نہیں کیا۔ "اور کوئی حل نہیں" ماں کا پڑھا دل اداس ہو گیا۔ ماں کو بھی اولاد کا احساس کرنا چاہیے۔ یہی بات بیٹی نے بولی تو ماں ناراض نہیں ہوئی بہو بولتی تو ناراض ہو جاتی۔ "معیار" عروج اور کاشان کا شادی سے پہلے ہر بات ایک دوسرے کو بتانا نہیں اچھا لگا۔ شادی کے بعد جب کاشان نے بھابھی کو بہنوں کی تربیت کا بولا تو اسے اپنی امی کی باتیں صحیح لگیں۔ مجھے بھی پہلے اپنی امی کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ ماں جو بھی بولتی ہے میری بھلائی کے لیے بولتی ہے۔ "زہر قاتل" بچیوں نے صحیح سبق سکھایا ثانیہ کو (ہاہاہا) "سارے موسم بدل گئے" یہ ہمارے اپنے سگے رشتے کیوں اتنے خود غرض ہو گئے ہیں۔ "دل سات سمندر" پڑھا صفیہ اور عثمان دونوں کا کردار اچھا لگا۔ عثمان نے بہت اچھا کیا علیزہ کو طلاق دے دی۔ ایسی لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ صفیہ نے اچھی بات کی میں نے آپ دونوں سے زیادہ بدصورت چہرے نہیں دیکھے ویلڈن صفیہ۔ "عید کے بعد" فرحان صاحب گھر بھی اپنا تھا پیٹ بھی اپنا تھا ذرا ہولا ہاتھ رکھنا تھا :(ہاہاہا) اگست میں میرے شوہر کی سالگرہ ہے مبارک ہو اور امی ابو کی اینورسری آپ کو بھی بہت بہت مبارک ہو، ہمیشہ خوش و خرم زندگی گزاریں۔ آمین

ج: پیاری رضوانہ! آپ ہماری بات سمجھ نہیں سکیں۔ ہم آپ کی بیماری کی وجہ سے آپ کا خط نہیں لگاتے اس لیے لگاتے ہیں کہ آپ کے خط بہت اچھے ہوتے ہیں اور آپ ساری کہانیاں پڑھ کر تفصیلی تبصرہ کرتی ہیں۔ آپ کی لکھائی بھی بہت اچھی ہے۔ البتہ نمبر ہم کسی کا نہیں دیتے ہم صرف آپ کا دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سی بہنیں ہمیں خط لکھ کر آپ کی بیماری کے لیے دعائیں اور دوائیں بتاتی تھیں کہ پرچے میں شائع کر دیں۔ ہم نے آپ کا نمبر اس لیے شائع کیا کہ ہم وہ دوائیں پرچے میں نہیں لکھ سکتے تھے۔ بہت سی بہنیں ڈاکٹر یا حکیم کے بارے میں بتاتی تھیں ہمارے لیے ان کا نام پتا دینا ممکن نہیں تھا۔ ہم نے آپ کو صرف نصیحت کی تھی کہ محتاط رہیں۔

انمول دعا عقیل نے کوٹ ادو سے لکھا ہے

احد رضا میر سے ملاقات خوب صورت رہی۔ لیکن تھوڑی سی شکایت بھی ہے۔ نہ ان کی شادی شدہ زندگی کے بارے میں کوئی بات ہی نہ کی۔ نہ ان کی کجل علی سے طلاق کے بارے میں پوچھا؟ آخر کیوں۔

سروے پڑھا سب کے جوابات مزا دے گئے۔ "چاند کی عید" ناول پڑھا بہت خوب صورت ناول تھا دو خاندانوں کی محبت و چاہت سے بھرپور۔ فائزہ، رمنا، انیلا اور مرینہ چاروں بہنیں پسند آئیں لیکن یہاں پر افشاں آفریدی سے تھوڑی بات پوچھنی تھی۔ مرینہ کو دس سال کا تو بنا دیا لیکن اس کی حرکات اور باتیں جو پتا نہیں کہاں سے اس کے ذہن میں آ جاتی تھیں۔ اس حساب سے تو اس کی عمر پندرہ سے سترہ سال کے درمیان ہونی چاہیے تھی خیر اچھا لگا۔

"چاندی کے گھر" آخری قسط پڑھ کر رونے لگی۔ اتنی دکھی کہانی۔ ایمن علی ویل ڈن۔ "ماہ الملوک" نگہت باجی خدا کا واسطہ اب تو ختم کر دیں اسے پلیز! افسانوں میں فاتحہ رابعہ کا افسانہ "کہکشاں جگمگ" سبق آموز تھا۔ حمیرا شفیع کا "گل بہار کی عید" اچھا لگا۔ "کیا بنے گا تیرا شیا" نازنین فردوس کا افسانہ پڑھ کر ہنسی آنے لگی۔ کاش ہر رسالے میں ایک ایسا افسانہ لازمی ہو۔ "یہ رسمیں" یہ بھی کوئی افسانہ ہوا۔ یہ تو کسی ڈرامے کا ہی سین لگتا ہے۔ مجھے "بس وفا کے لیے" ناولٹ کی کیا تعریف کروں۔ دانیہ سمیع کی ہر تحریر ہی اچھی لگتی ہے۔ "خط آپ کے" میں فاطمہ بنت ابراہیم کا خط مزے دار لگا۔ شفقت فردوس نے کمال سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ایس ایچ ایس پلیز آپ کوئی خوب صورت سا نام رکھ لیں یہ تو کوئی نام نہ ہوا۔ رضوانہ وقاص کا خط پڑھا، اتنی خوب صورتی سے کیسے لکھ لیتی ہیں۔ رضوانہ آپ ہمارے میسج کا جواب کیوں نہیں دیتیں۔ پلیز ناراض نہ ہوں اور ہم سے رابطہ کریں۔ زرینہ خانم نے اچھا سوال کیا تھا میں کب سے پوچھنا چاہ رہی تھی کرلاں کا مطلب اچھا ہوا آپ نے خود ہی بتا دیا۔ "یار دل دار" والا سلسلہ شروع کروا دیں۔ انس حیدر، عادل اور محب اللہ بہت یاد کرتے ہیں۔ فرح بخاری سے بھی کوئی ناول لکھوائیں۔ ان کا "بن پا کھی" ابھی تک یاد

ہے۔ کیا خوب صورت تحریر تھی۔ کاش اسی طرح کوئی اور کہانی آئے۔ ''تاریخ کے جھروکے'' میں بادشاہوں کو چھوڑ کر کسی اور کی تاریخ دیا کریں۔ کیا آپ مجھے فرح بخاری، منعم ملک اور شاہین رشید کے نمبر دے سکتی ہیں۔

ج: پیاری انمول! مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں بڑی تعداد میں افسانے اور خط موصول ہوتے ہیں کوشش تو ہماری بھی ہوتی ہے کہ سب شامل کر لیے جائیں لیکن صفحات کی مجبوری آڑے آجاتی ہے۔ آپ کے افسانے لگ جائیں گے لیکن کب لگیں گے۔ یہ نہیں بتا سکتے۔

انشیں نعیم تک آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں رضوانہ وقاص کا نمبر ہم شائع کر چکے ہیں آپ ان کے لیے لکھے اشعار انہیں میسج کر دیں۔

مصباح منور گاؤں دھرا سے شریک محفل ہیں

شعاع پڑھتے ایک عمر بیت گئی لیکن اس کا ساتھ آج بھی ویسی ہی خوشی کا باعث ہے، شعاع مجھے لڑکپن سے بہت پسند ہے تب میں ساتویں جماعت میں تھی جب شعاع سے وابستگی ہوئی اور آج میری بیٹی ماشاء اللہ سے میٹرک میں ہے۔

بہت سی مخالفت کے باوجود شعاع کو نہیں چھوڑا کیونکہ یہ صرف تفریح کا باعث ہی نہیں بلکہ زندگی کے بہت سے اہم سبق سیکھے ہیں اس سے، بہت یادگار وقت تھا سوچنے بیٹھوں تو بہت سی رنگین یادیں جڑی ہیں شعاع سے۔ میں نے اسے دوست ایک رہنما کی طرح پایا، بہت سی لازوال تحاریر اس کے توسط سے پڑھنے کو ملیں، بہت سی اعلیٰ پائے کی مصنفین سے تعارف ہوا، ادب کی اصل روح کو اسی کی نسبت سے پہچان پائی۔ اللہ اس پرچے کو اور اس کی ساری ٹیم کو بے شمار کامیابیوں سے نوازے۔

ج: پیاری مصباح! اتنے طویل ساتھ کے بعد آپ نے خط لکھنے کی ہمت کی۔ بہت خوشی ہوئی اور افسوس بھی اتنا عرصہ ہم اپنی اتنی اچھی اور پیار کرنے والی قاری کی آرا سے محروم رہے۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

انیقہ مرید نے شہر کالا ضلع ڈیرہ غازی خان سے لکھا ہے

یسریٰ ملک اور ماہ رخ بلند نے مجھے یاد رکھا بہت اچھا لگا۔ مئی کے شمارے کا ٹائٹل بس ایویں لگا کیوں کہ وہاں آنٹی براجمان تھیں۔ حمد و نعت اور احادیث کے بعد تجھ سے ناتا جوڑا پڑھا۔ بہن رخسانہ نے بالکل صحیح فیصلہ کیا۔ یہاں اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑتا ہے خونی رشتے بھی آخر میں تھک جاتے ہیں۔ ''ماہ الملوک'' ختم ہو رہا ہے بورنگ ہونے کے باوجود میں نے پوری توجہ سے پڑھا ابھی تک زل کی ذات سوالیہ نشان ہے۔ بہرحال اس کی جگہ کوئی اچھی اسٹوری لگائیں۔ رائٹر میں فرزانہ کھرل یا حسنہ حسین ہوں تو کیا ہی بات ہوگی۔ فرزانہ کھرل کا وہ مکمل ناول لگا دیتیں مجھے تو فرزانہ کے ہاتھ کی لکھی پشتو بھی سمجھ میں آجائے گی۔ پلیز وہ مکمل ناول لگائیں مجھے انتظار ہے۔ دھوپ دریچہ اس بار کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ زیمل والا حصہ زیادہ دیا کریں۔ ''تھوڑی سی بے وفائی'' امیزنگ ناول تھا۔

ج: پیاری انیقہ! مصروفیت کے باوجود آپ نے ہماری محفل کو رونق بخشی۔ تہہ دل سے شکریہ۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو دھوپ دریچہ اور ماہ الملوک پسند نہیں آیا جبکہ ہماری دیگر قارئین اسے بے حد پسند کر رہی ہیں۔ بہترین رزلٹ دینے پر مبارک باد۔

بریرہ حسن [illegible] سے شریک محفل ہیں

شعاع کو ہوش سنبھالتے ہی اپنے اردگرد پڑھتا ہوا پایا۔ سب سے پہلے تو شازیہ جمال طارق اور سائرہ رضا اللہ تعالیٰ دونوں کی مغفرت فرمائے۔ آمین

ٹائٹل گرل کتنی خوب صورت ہے میں تو دیکھتی رہ گئی۔ حمد و نعت سے فیض یاب ہوئے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتوں سے روح کو منور کیا جب تجھ سے ناتا جوڑا میں شاہینہ خان نظر آئیں۔ یہ سلسلہ بھی اچھا ہے غنی بخاری سے ملاقات سو سو رہی، زمانے نے بہت یاد کیا اب تو ان کی یادیں ہی رہ گئی تھیں میری آپی حمیرا رضا نے لکھا۔ مکمل ناول میں سارے موسم بدل گئے اچھا لگا۔ عیشہ حسن کا ناول دل سات سمندر صحیح رہا۔ میں قسط وار ناول نہیں پڑھتی اگر میں پہلی قسط سے پڑھنا شروع کروں تو ہی پڑھتی ہوں۔ مریم عزیز اور نگہت سیما کا شمار میری پسندیدہ رائٹرز میں ہوتا ہے۔

افسانوں میں ٹاپ آف دی لسٹ اور کوئی حل نہیں اور عید کے بعد رہا، آپی حمیرا جب بھی میں آپ کے افسانے یا

ناول، ناولٹ پڑھتی ہوں تو بہت ہنستی ہوں خط آپ کے یہ سلسلہ سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ پہلا خط عینا عمر خان زبردست ایسے ہی لکھتی رہیں۔ کراچی سے اسما بنت فیاض نے۔ زبردست آپ کے بابا کی طرح میرے بابا بھی میرا خط پوسٹ کرواتے ہیں۔ اللہ ہمارے والدین کا سایہ ہمارے سروں پہ قائم رکھے۔ سلمیٰ مسرت صاحبہ آپ کے بھانجے کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ باتوں سے خوشبو آئے زبردست سلسلہ ہے۔ کتنی ہی باتیں ہوتی ہیں جو ہمیں سیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس ماہ کی مسکراہٹوں نے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ موسم کے پکوان دودھ والے گلاب جامن ٹرائی کرنے کا ارادہ تو ہے۔ خوب صورت بنئے ہم بھی یہی چیزیں لگائے خوب صورت بنتے چلے جاتے ہیں۔ (آہم) دیسی ٹوٹکے تو بہت مفید ہوتے ہیں۔ غرض یہ کے پورا رسالہ اپنی مثال آپ تھا۔ محنت کرنے والوں کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھینکس ادارہ۔ رسالے کی قیمت چاہے جتنی مرضی بڑھی ہے لیکن رسالے سے ہماری محبت میں ذرا سی کمی بھی واقع نہیں ہوئی رسالہ جیسے ہی آتا ہے پہلے آپی بڑی بہن پڑھتی ہے پھر ہم مابدولت عائشہ اور بھابھی پڑھتی ہیں پہلے دن تو رسالہ ہاتھوں ہاتھ دوسرے تیسرے دن کچھ سانس آتا ہے بے چارے رسالے کو۔

ج: بریرہ، عائشہ اور شمائلہ! آپ نے ہماری محفل میں شرکت کی۔ بہت شکریہ۔ بہت دلچسپ خط ہے آپ لوگوں کا لیکن کہانیوں پر تبصرہ کی کمی محسوس ہوئی۔ اب خط لکھیں تو کہانیوں پر تبصرہ ضرور کریں۔

ردا مرتضیٰ نے بورے والا سے لکھا ہے

میرا شعاع سے تعلق زیادہ پرانا نہیں ہے۔ میں نے مارچ 2023 سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ ہر ماہ جب شعاع ہاتھ میں آتا ہے تو مجھے بہت خوشی ملتی ہے۔ لیکن اس ماہ جب شعاع ملا اور اسے کھولا تو دل دکھ سے بھر گیا۔ پیاری مصنفہ سائرہ رضا اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ سب سے پہلے میں نے "میری آپی" حمیرا رضا نے جو اپنی بہن کے بارے میں لکھا ہے اسے پڑھا تو میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ حمیرا شفیع کا افسانہ "عید کے بعد" پڑھا جب شوہر صاحب چائے پتی سے نہائے تو میری ہنسی نکل گئی۔ حنا جاوید کا افسانہ "معیار" بہت خوب صورت پیغام دے گیا۔ آشین نعیم کا افسانہ "زہر قاتل" میرے لیے ٹاپ آف دا لسٹ تھا۔ ناولٹ "رویا گر" میں صائمہ نور نے جو انجیہ کا کردار تخلیق کیا ہے اس میں مجھے اپنے کردار کی ہلکی سی جھلک نظر آئی۔ مکمل ناول میں صدف عمر کی تحریر "سارے موسم بدل گئے" مجھے بہت پسند آئی۔ اس میں خالو جو باتیں عالی شان کو سمجھاتے تھے وہ میرے لیے بہت اچھی موٹیویشن تھیں اور عیشہ حسین کی تحریر "دل سات سمندر" بہت منفرد سی اور اچھی لگی۔ سلسلہ وار ناول ماہ الملوک بہت اچھا جا رہا ہے۔

ج: پیاری ردا! آپ نے بہت اچھا تبصرہ کیا ہے۔ بہت شکریہ۔ شعاع آپ کو پسند ہے یہ جان کر خوشی ہوئی۔ آپ کی پسندیدگی ہماری محنتوں کا حاصل ہے۔

مہروش کائنات نے گاؤں تلے والا فیصل آباد سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

میں اور میری سویٹ مما آپ کی کافی عرصہ سے خاموش قارئین ہیں۔

میری سویٹ مما جن کا نام فرح ناز ہے۔ پہلے ان کے بارے میں بتانا چاہوں گی کہ مما جی جب 1994 میں جب 6th کلاس میں تھیں تو انہوں نے پہلی بار شعاع اپنی کزن سے لے کر پڑھا تھا۔ وہ بتاتی ہیں وہ ڈائجسٹ شاید 1990 کا تھا۔ ناہید اختر گلوکارہ کی تصویر ٹائٹل پر آویزاں تھی۔ تب سے پھر ریگولر پڑھنا شروع کیا تھا۔

تو وہ دن اور آج کا دن ہر ماہ ریگولر ہمارے گھر آتا ہے۔ مما جی نے بتایا، میں نے اور تمہارے بابا نے ہم دو تین بار کہ جب آپ لوگ چھوٹی تھیں (ہم ماشاءاللہ چھ بہنیں ہیں) خط لکھا لیکن کبھی نہیں شائع ہوا۔ دوبارہ پھر کبھی نہیں لکھا۔

بس پھر میں 24 مارچ 2000ء میں اس پر تشریف لائی۔ تو میں بھی چھٹی میں تھی مما جی کو پڑھتے دیکھتی تو مجھ میں بھی تجسس پیدا ہوا کہ کیا ہوتا ہے یہ۔ میں پھر چھوٹی چھوٹی اسٹوریز چھپ چھپ کر پڑھ لیتی۔

سلسلہ وار مکمل ناول میں نے "یارم" پڑھا تھا۔ جو ابھی تک فیورٹ لسٹ میں ہے۔ بس پھر "یارم" کے بعد "عمر یسرا" تھا جو دل کو کلک کیا شعاع کا۔ ویسے تو اور بھی بہت سے ناول پڑھے۔

تو اب آتی ہوں اس ماہ کے شمارے کی طرف۔ حمد و

نعت ہر بار کی طرح پیاری۔ اس کے بعد پیارے نبیﷺ کی پیاری باتیں" ہر بار کی طرح ماشاء اللہ بہت علم ذخیرہ کیا۔

مریم عزیز کا دھوپ دریچہ، بہت اچھا جا رہا ہے۔ اس بار زیمل کے متعلق کمی ذرا محسوس ہوئی۔ اب ہیرو کون ہوتا ہے ضامن یا حارث۔ دوسرا مکمل ناول نگہت سیماجی کا ماہ الملوک میں زل کے ساتھ آزین کا رویہ خاصا دھی کر رہا ہے۔ شیخو بابا جی زیبو کے شہزادے لگ رہے۔

میں نے ابھی فاتنہ رابعہ کا "لازوال" پڑھا۔ اف اللہ کیا افسانہ لکھا ہے۔ آنسو ہی تھم نہیں رہے۔

صبر واستقامت، برداشت، بہادری، ہمت، حوصلہ، دنیا فانی ہے کی اعلا مثال، فلسطینیوں کے حالات زندگی، غزہ کا کھنڈر میں بدل جانا، سب کچھ چار صفحات کی کہانی پورے ڈائجسٹ پر حاوی ہوگئی۔

اور پھر نجیہ اور چچی رمیزہ کا صبر، حوصلہ، ہمت، الفاظ ہی نہیں مل رہے کیسے بیان کروں اپنی فیلنگ سمجھ نہیں آ رہا۔

اپنے غم بہت کم لگ رہے ہیں، ان سب کے آگے ہیڈز آف فاتنہ رابعہ جی بہت خوب صورتی سے لکھا۔ اللہ تعالیٰ ادارے کو ڈھیروں کامیابیاں اور کامرانی عطا کرے۔

جو اتنی محنت کرتے ہیں۔ گھر بیٹھے ہی انسان کتنا کچھ سیکھ لیتا ہے۔

ج: پیاری مہروش! اپنی امی فرح ناز کو ہمارا سلام پہنچا دیں۔ اتنے طویل عرصہ سے شعاع کی قاری ہیں۔ ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے پاپا جانی اور انہوں نے مل کر جو خط لکھے وہ شائع نہ ہو سکے۔ آپ نے بہت اچھا خط لکھا، پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ہمیں حیرانی ہے کہ آپ کے خط ہمیں کیوں نہیں ملے۔ گاؤں سے ملنے والے خطوط کو تو ہم خصوصی اہمیت دیتے ہیں کیونکہ ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں خط پوسٹ کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ آپ کے خط ملتے تو ہم ضرور شائع کرتے۔

عدن قمر ستی ہاؤسنگ گوجرانوالہ

زندگی بہت بے اعتبار ہے۔ ابھی کل ہی کی بات لگتی ہے جب سائرہ رضا کی والدہ کا پڑھا تھا۔ میں بہت روئی بھی تھی۔ سائرہ رضا کی خبر پڑھی۔ دل دکھ سے بھر گیا۔

تہجد میں ان کی مغفرت کی دعا کی اب وہ ہمیشہ میری دعاؤں میں شامل رہیں گی ان شاء اللہ۔

سب کی رائٹرز فیورٹ ہوتی ہیں لیکن میری فیورٹ ایک قاری بھی ہے۔ ان کے خط موڈ فریش کر دیتے ہیں۔ ان کا عید کا جو سلسلہ تھا، وہ پڑھ کر بھی بڑا مزا آیا (بے اختیار ہنسی بھی آئی) ان کا نام ہے فرخندہ سلیم (بی بی) پیاری فرخندہ اللہ آپ کو خوش رکھے اور آپ مزے کے خط لکھتی رہیں۔ کہ آپ یونی گرل ہیں میری طرح......

رضوانہ وقاص کا نمبر جب دیکھا تو بہن سے کہا ہم بھی ان سے بات کریں گے۔ خطوط کی محفل اتنی اچھی لگتی ہے دل کرتا ہے میں بھی ہر ماہ خط لکھوں اور سب سے دوستیاں کروں۔ جولائی کے شمارے کی لڑکی پیاری لگی۔ "دھوپ دریچہ" اتنا چھوٹا ہوتا ہے شروع ہوتے ہی ختم۔ صدف عمر کی ہلکی پھلکی تحریر نے خوب ہنسایا۔ آمنہ کے جناتی پیروں سے مجھے اپنی چچی کی یاد آ گئیں۔ "دل سات سمندر" بھی خوب رہا۔ آذر کو ہدایت آ گئی۔ "رویا گر" بھی خوب رہی۔ ویسے جیا ہسپتال والوں سے پیسے لے کر واپس کر سکتی تھی۔ اس کے بابا کا کون سا آپریشن ہوا تھا۔

ج: پیاری عدن! خوش آمدید شعاع کی محفل میں آپ نے خط لکھا، بے حد خوشی ہوئی آپ ہر ماہ باقاعدگی سے شرکت کریں۔ سب سے خود بخود دوستی ہو جائے گی۔ رضوانہ وقاص کو فون کر سکتی ہیں۔

نمرہ اقراء ...... کوٹ ادو

میں تقریباً دس سال سے شعاع پڑھ رہی ہوں۔ میرے گھر والے میری مما، میری بہن (نمرہ، علیشہ) اور میری کزن (اقصیٰ حازم، مونا اور مصباح) آپ کا شعاع شوق سے پڑھتی ہیں۔ اس مہینے کا شمارہ زبردست تھا۔ اور ٹائٹل گرل بھی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ آپی میری کزن کی فرمائش ہے کہ اس بار دانش تیمور اور حبا بخاری کا انٹرویو ضرور لیں۔

ج: پیاری نمرہ! آپ کی بہنیں نمرہ اور علیشہ اور کزن اقصیٰ مونا اور مصباح ان سب پیاری بہنوں کو شعاع کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ آپ کی شرکت سے ہمیں بہت خوشی ہوئی ہے۔

علیشہ سعید...... کوٹ ادو

شعاع پڑھتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا اب تو یہ بھی یاد نہیں

۔بس اتنا یاد ہے کہ ہوش سنبھالتے ہی شعاع کو اپنے آس پاس دیکھا۔ ہم شعاع کی خاموش قاری ہیں۔ ہم میں بدولت میری ماما اور میری بہن (نمرہ،اقراء) شامل ہیں۔

سرورق ہمیشہ کی طرح منفرد لگا۔ حمد اور نعت سے دل کو منور کیا۔ سب سے پہلے نگہت سیما کا ناول ''ماہ الملوک'' پڑھا۔ بہت ہی زبردست ناول جا رہا ہے۔ صائمہ نور کا ''رویا گر'' بھی بہت اچھا تھا۔ صدف عمر کا ''سارے موسم بدل گئے'' بہت اچھی اسٹوری تھی مجھے صفی کی باتوں پر خوب ہنسی آئی اور ان کے ساتھ جیا پر افسوس بھی ہوا۔ اور باقی افسانے بھی بہت اچھے تھے۔

ج: پیاری علیشہ !شعاع کی محفل میں خوش آمدید شعاع آپ کو پسند آیا یہ جان کر خوشی ہوئی۔

عدینہ لغاری نے جتموے سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

میں نے سوچا تھا خط میں بہت ساری باتیں لکھوں گی مگر مجھ سے کچھ لکھا نہیں جا رہا ہاتھ کانپ رہے ہیں دل رو رہا ہے سائرہ رضا کے آگے انتقال لکھنا مشکل لگ رہا ہے رسالہ ملا تو پہلی نظر اس خبر پر گئی منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ ابھی تو شازیہ جی کے صدمے سے نکل نہیں پائی تھی اوپر سے یہ صدمہ دل یقین نہیں کر رہا۔ سائرہ جی ہمارے درمیان نہیں رہیں ابھی تو مجھے ان کی بہت ساری تعریف کرنی تھی ان کو بتانا تھا ماں کے بارے میں جو انہوں نے لکھا تھا کتنا اچھا لکھا تھا ابھی تو مجھے ان سے ایک ناول کی فرمائش بھی کرنی تھی خبر نہ تھی وہ اتنی جلدی چلی جائیں گی ''میری آپی'' کو پڑھتے ہوئے بار بار آنکھیں چھلک رہی تھیں ان کی بیٹی نے ان کو کسی تعارف کی ضرورت نہیں بالکل ٹھیک کہا سائرہ جی ایک ہیں اور ایک ہی رہیں گی۔

ج: پیاری عدینہ !سائرہ رضا کی اچانک وفات دکھ اتنا بڑا ہے کہ الفاظ اس کے سامنے چھوٹے پڑ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ وہ جتنی اچھی مصنفہ تھیں اس سے بڑی انسان تھیں۔

صائمہ گل نے مردان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

عید الضحیٰ کی تیاریوں اور بے بے کی آنکھ کی سرجری کی وجہ سے مئی جون کافی گرم اور مصروف رہا۔

سائرہ رضا کے بارے میں خبر پڑھی۔ مجھے یقین نہیں آیا ارے ابھی دو دن پہلے تو میں نے ان کا ''خالی آسمان'' دوبارہ پڑھا، تارے کی حرکتوں نے ہنسایا بھی اور بے جی کے دکھ نے رلایا بھی، میرا ارادہ تھا اس دفعہ شعاع میں خط لکھوں گی تو سائرہ سے فرمائش کروں گی کہ اس کا دوسرا حصہ لکھ دیں۔ جس میں بے جی کو اس کا تارے مل جائے۔ چند ماہ پہلے ہی سائرہ نے اپنی والدہ کے بارے میں لکھا تھا۔ کیا پتا تھا کہ چند ماہ بعد ان کے بارے میں ایسے تعزیتی جملے پڑھنے کو ملیں گے ایک روشن ستارہ ڈوب گیا۔ ایک جلتی شمع بجھ گئی مگر ان کے لکھے لفظوں کی روشنی ،چاشنی تاحیات ہمارے دلوں میں زندہ رہے گی۔

پیارے نبی کی باتوں میں صدقہ اور وراثت کے بارے میں پڑھ کر علم میں اضافہ ہوا۔

بہنوں کی محفل میں جھانکا ناہید اسماعیل،فرخندہ سلیم غیر حاضر تھی۔ ویسے فرخندہ سلیم کا رمضان کا سروے کافی مزیدار تھا۔ فرخندہ جی آپ ہماری محفل کا اک ہنستا مسکراتا خوش گوار اضافہ ہیں۔ فرحانہ مہناز کیوں خاموش ہیں۔

دھوپ دریچہ سے مانوس ہونے میں ابھی وقت لگے گا ام ہانی کے افسانے میں ساس امی پر بے ساختہ پیار ہی آیا۔ ''ہاہاہا''

''معیار'' آج کل کی بچیوں کے لیے اچھا سبق۔ ابھی بات طے ہوئی ہے اور موبائل پر رابطے شروع۔ کئی رشتے تو پایہ تکمیل تک پہنچنے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔

''رویا گر'' ہلکی پھلکی ہیپی اینڈنگ والی دلچسپ کہانی تھی۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ ''عید کے بعد'' پڑھ کر دم تک ہنستے رہے۔ خوب درگت بنی حضرت کی۔ 'زہر قاتل'' مصنفہ نے بہترین موضوع چنا ہلکے پھلکے انداز میں اچھا پیغام دیا۔

''سارے موسم بدل گئے۔'' ویسے یہ ناول دو اقساط کا ہونا چاہیے تھا۔ ایک قسط جناتی پاؤں والی منو کے ماضی پر اور دوسرا البتہ دوشیزہ آمنہ پر شجاع امجد اور رفعت خالہ جیسے نایاب لوگوں کے دم سے ہی دنیا آباد ہے۔ ویسے یہ ناول اپنی صدف ناصر کا تھا؟ پلیز وضاحت کر دیں۔

''دل سات سمندر'' پاک مردوں کے لیے پاک عورتیں۔ برے مردوں کے لیے بری عورتیں حفصہ نے غلط فیصلہ کیا۔ ویسے جس پوسٹ پر حفصہ تھی اور جس نتیجہ کی وہ تھی اسے آذر سے بہتر جوڑ مل سکتا تھا۔

اچھی نعیمہ پیاری نعیمہ کافی ریسٹ کر لیا۔ اب

ٹانٹ مکمل ناول کے ساتھ انٹری دیں۔ آسیہ رزاقی، شازیہ جمال اور سائرہ رضا کا کوئی افسانہ ناول اگلے شماروں میں شامل کردیں۔

پیاری صائمہ: آپ کی پیاری بھتیجی منائل ثریا کو ہماری جانب سے، بہت سارا پیار اور دعائیں۔ اللہ تعالیٰ اسے زندگی میں خوشیوں اور کامیابیوں سے نوازے۔ آمین

آپ کی فرمائش پر سائرہ رضا کا افسانہ شامل اشاعت ہے۔ سارے موسم بدل گئے صدف عمر کا ناول تھا۔

میٹھے علی خان خانیوال سے شریک محفل ہیں

وہ ستارہ جیسے یہ پڑھ کر ہی بس ہو گئی۔ بہت سی رائٹرز بہت اچھا لکھتی ہیں۔ لیکن یہ وہ رائٹر ہیں۔ (ابھی "تھی" لکھنے کو دل اور قلم نہیں مان رہا) جن کے ہاتھ چومنے کو دل کرتا ہے۔

میں ان کی کہانیوں اور کرداروں کے نام لے کر بات نہیں کر پاؤں گی کہ ابھی تو دل ذہن بہت خالی ہے۔ سائرہ کی بیٹیوں کے اچھے نصیب کے لیے دعا گو ہوں۔

ابھی تو باجی منور مجھے کہہ رہی تھیں کہ میری طرف سے خط لکھ کر پوچھو راحت جبیں کے شوہر کو کیا ہوا تھا۔

سب سے پہلے اپنا موسٹ فیورٹ ناول ماہ الملوک پڑھا۔ ہمیشہ کی طرح بہترین۔ تکمیل کی خوشی اپنی جگہ اور ایک اچھی باتی دونوں مکمل ناول بھی بہترین رہے۔ سارے موسم بدل گئے دیل ڈن۔ صدف عمر دل سات سمندر عیشہ حسین بہت خوب صورت بلاشبہ عورت کو ہمیشہ مرد کے سہارے کی ضرورت رہتی ہے۔ ناولٹ رویا گر پسند آیا پر روحان کا ایک دم سے اتنا امیر ہو کر سامنے آنا کچھ عجیب لگا۔ افسانوں میں "معیار" اور "اور کوئی حل نہیں" بازی لے گئے۔ معنوی پھول عقیلہ ہاشمی سے معذرت کے ساتھ پسند نہیں آیا کہ منافقت تو دونوں بنیادی کرداروں میں ہی تھی۔ ویسے "ملنی" کی رسم تو ہم لوگوں میں بھی ہوتی ہے اور یہ رسم ہمارے ہاں مرد کرتے ہیں اور لڑکی اور لڑکے والوں کی طرف سے ایک ہی رشتہ پہ رسم نبھاتا ہے مطلب اگر لڑکے والوں کی طرف سے چچا، تایا، یا ماموں ملنی کرے تو ایسا ہی رشتہ لڑکی والوں کی طرف سے بھی ہوتا ہے اور ملنی کا نیگ (سوٹ وغیرہ) صرف لڑکی والوں کی طرف سے ہوتا ہے لڑکے والے ایسا تکلف نہیں کرتے۔

عید کے بعد حمیرا شفیع نے اچھا لکھا۔ زہر قاتل اصلاح کی تحریک دیتی ہوئی بہترین کاوش۔

باتوں میں خوشبو اس دفعہ دوسری دفعہ حکیم اجمل خان کے بارے میں جاننے کا موقع ملا براہ مہربانی ان کے بارے میں تاریخ کے جھروکوں میں لکھیے۔ انہی سطروں کے ذریعے میں اپنی چھوٹی بہن ایان قیصر کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ جو ہر ماہ باقاعدگی سے دونوں شماروں کے پیسے ادارے کو بھیج دیتی ہے اور مجھ سے لیتی بھی نہیں بہت شکریہ! میری بہن شایان نے ایگزامز دیے ہیں اس کی کامیابی، حجاب کی دعا کیجیے گا۔

پیاری میٹھے !! اتنا اچھا تبصرہ کیا ہے آپ نے پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ شایان کے لیے، بہت ساری دعائیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہر امتحان میں کامیابیوں سے نوازے۔ آمین

کراچی سے تسنیم

ماشاء اللہ اس ماہ تمام سلسلے ہی بہترین رہے جیتے رہو شعاع! مریم عزیز کا دھوپ دریچہ یقیناً شان دار ثابت ہو گا، لیکن افسوس ابھی تک تو ہم کرداروں اور اسٹوری کو سمجھنے کی بھول بھلیوں میں ہی جتلا ہیں۔ زیمل کی حارث سے شادی کے بعد کہانی دلچسپ اور شان دار ہو جائے گی۔

نگہت سیما کے ماہ الملوک کی کیا بات ہے لاجواب اسٹوری۔

اور عیشہ حسین [illegible] ناول کا نام ان کی کہانی سے تو میچ نہیں کرتا۔ کہانی دیکھیں تو [illegible] اس میں رشتوں کا تقدس نہیں تھا۔

صدف اصغر کا ناول سارے موسم بدل گئے بے [illegible]ا اچھا لگا۔ بھئی سچی میں خالہ نے کونپلہ کو ہیرا بنا دیا۔ پیارے پیارے افسانوں میں ام ہانی کا اور کوئی حل نہیں عمدہ لگا تو حنا جاوید کا معیار بھی کم نہیں تھا۔ اس کے علاوہ حمیرا شفیع کے عید کے بعد نے لطف دوبالا کر دیا۔ حقیقت [illegible]ہرا کا نام ہی کافی ہے۔

افشین نعیم بھی بہترین لکھاری ہیں ان کی تحریریں ہمیں پسند آئی ہیں زہر قاتل بھی بہت اچھا لگا۔ اسی طرح عقیلہ ہاشمی کے معنوی پھول بھی خوشبودار لگے۔

[illegible] پیاری تسنیم محفل میں شرکت کرنے کے لیے شکریہ۔

☆☆

موسم کے پکوان

واصقہ سہیل

پسندوں کی بریانی

ضروری اشیاء:

پسندے	ایک کلو
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ	دو چائے کے چمچے
ہلدی	ایک چائے کا چمچہ
دھنیا	دو کھانے کے چمچے
پیاز	ایک پاؤ
دہی	ایک پاؤ
آلو بخارے	حسب پسند
چاول	تین پاؤ
ادرک لہسن	چار کھانے کے چمچے
لیموں	دو عدد
ٹماٹر	چار عدد
ہری مرچ	چھ عدد
ہرا دھنیا، پودینہ	آدھا کپ
زردے کا رنگ	ایک چٹکی
تیل	ایک کپ
ثابت گرم مسالہ	تھوڑا سا

ترکیب:

تیل گرم کریں اور تیل میں پیاز فرائی کر کے براؤن کرلیں۔ براؤن ہو جانے پر چورا کر لیں۔ پسندوں میں نمک، تھوڑی سی ہلدی اور ایک کھانے کا چمچہ ادرک لہسن ڈال کر گلا لیں زیادہ گلانا نہیں ہے۔ ایک الگ پین میں تیل گرم کریں اور تیل میں ہری مرچ ڈال کر فرائی کریں چھلکا پھٹنے لگے تو اس میں ٹماٹر ڈال دیں۔ ٹماٹر نرم پڑ جائیں تو اس میں دہی، آلو بخارے، نمک، مرچ، دھنیا، ہلدی، پیاز، ادرک لہسن اور پسندے ڈال کر بھونیں حتیٰ کہ مسالہ تیل چھوڑ دے۔ لیموں کا رس ملا کر اتار لیں، چاول میں نمک، ثابت گرم مسالہ ملا کر ابال لیں۔ چاول ایک کنی ابل جائیں تو چھان لیں برتن میں ایک تہہ چاول پھر پسندے پھر چاول ڈال کر زردے کا رنگ اور بقیہ ہرا مسالہ ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ بہت مزیدار پسندوں کی بریانی تیار ہے اور دہی کے رائتے کے ساتھ سرو کریں۔

بالوشاہی

اجزاء:

میدہ	دو کپ
بیکنگ پاؤڈر	ایک چمچہ
گھی یا مکھن	آدھا کپ
دہی	آدھا کپ
پانی	حسب ضرورت
گھی	تلنے کے لیے
چینی	ایک کپ
پانی	آدھا کپ
الائچی	دو عدد
لیموں کا رس	چند قطرے

ترکیب:۔

ایک برتن میں میدہ، بیکنگ پاؤڈر اور گھی ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ پھر دہی ڈال کر نرم سا گوندھ لیں ضرورت پڑے تو ذرا سا پانی شامل کرلیں۔

میدہ کو پندرہ سے بیس منٹ ڈھک کر رکھ دیں۔

پھر اس کے پیڑے بنا کر اس میں ہلکا سے گڑھا کر دیں۔ کڑاہی میں گھی گرم کریں اور درمیانی آنچ پر ان پیڑوں کو آہستہ آہستہ تلیں سنہری رنگ آنے پر اسے گرم شیرے میں شامل کر دیں۔

شیرہ بنانے کے لیے:۔

چینی، پانی اور الائچی کو ہلکی آنچ پر پکائیں جب ہلکا گاڑھا ہونے لگے تو لیموں کا رس دو سے تین قطرے ڈال کر چولہا بند کر دیں اور گرم شیرے میں تلی ہوئی بالو شاہی پانچ سے سات منٹ کے لیے ڈال دیں نکال کر پلیٹ میں رکھ دیں، چاہیں تو پستے اور چاندی کا ورق لگا دیں۔ مزے دار بالوشاہی تیار ہے۔

☆☆

امۃ الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

علقمہ اور عامر بن کا واقعہ

قدیم عربوں کی عادت تھی کہ جب لڑائی جھگڑے اور قتل وغارت ہو جاتا تو اپنے فخر کے اظہار اور شرافت کو بیان کرنے کے لیے محفلیں منعقد کیا کرتے تھے۔

بنی عامر میں دو شاعر حضرات علقمہ اور عامر بن الطفیل کے درمیان اسی طرح کا ایک واقعہ ہوا تھا۔ دونوں بہادر، جنگجو اور بلند پایہ شاعر تھے۔ (عامر بن الطفیل دور جاہلیت سے لے کر دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تک زندہ رہا اس نے اسلام قبول نہیں کیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازشیں کرتا صرف یہ ہی نہیں بلکہ بعض غزوات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قبائل کو بھڑکاتا بھی تھا)

ان میں تنازع ہوا تو ایک شخص جو ان کے قبیلے کا نہ تھا اس کو حکم مقرر کیا گیا۔ اس نے اپنی رائے قائم کرنے اور حکم سنانے کے واسطے ایک سال کی مدت چاہی۔ جس میں ان دونوں کو اجازت دی گئی کہ اپنی اپنی شجاعت وخصائل کا اظہار کریں۔

جب مدت پوری ہوئی تو دستور کے موافق ایک بڑی محفل میں کثرت سے لوگ اکٹھے ہوئے اور اس حکم نے اپنا حکم سنایا کہ میرے نزدیک دونوں شخص ریاست کے مستحق ہیں۔ اس لیے دونوں اپنے قبیلے کی حکومت میں شریک کیے گئے اور ان میں کلی اتحاد ہو گیا اسی طرح کا تفاخر بنی طے کے دو اشخاص حاتم اور زید الخیل میں ہوا تھا جن کی سخاوت کی جزیرہ عرب میں ساتویں صدی عیسوی کی ابتدا میں مثال دی جاتی تھی۔ (زید الخیل نے بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا)

(تاریخ عرب)

ڈاکٹر سمیرا موسیٰ

مصر کے شمالی علاقے غربیا کا ایک گاؤں زفتا جب وہاں 1917 میں ایک بڑی روشن آنکھوں والی بچی پیدا ہوئی۔ اس بچی کے والد شیخ موسیٰ عبدالرحمن ایک معروف سیاسی وسماجی کارکن تھے۔ سمیرا ایک ذہین بچی تھی جب اس کی عمر کی بچیاں گڑیاں کھیلتیں اس وقت سمیرا، الجبرا اور حساب کی گتھیوں میں الجھی ہوتی۔ اسکول میں ان کی پہلی پوزیشن رہتی۔

ابھی سمیرا کم عمر ہی تھیں، جب ان کی والدہ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا چل بسیں۔ چھوٹی سی سمیرا نے ماں کے مرنے کا بہت اثر لیا اس وقت کینسر کے مرض کی دریافت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ شاید یہ ماں کے مرنے کا ہی غم تھا جس نے سمیرا کو سائنس کی جانب مائل کیا۔ باپ نے اپنی بیٹی کے عملی رجحان کو دیکھتے ہوئے قاہرہ جانے کا فیصلہ کیا اور وہاں اپنا ایک ہوٹل کھولا درحقیقت وہ چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی قاہرہ ہی میں اپنی عملی قابلیت میں اضافہ کر سکے۔

ابھی سمیرا کی عمر تیرہ چودہ سال ہی تھی جب انہوں نے اپنے اسکول کے نصاب میں شامل الجبرے کی کتاب میں ایک منطقی اور عددی غلطی کو پہچانا، انہوں نے فوراً اس غلطی کی نشان دہی اپنی استاد سے کی اور وہ حیران رہ گئیں کیونکہ سمیرا نے بالکل

صحیح نشان دہی کی تھی صرف یہ ہی نہیں بلکہ اس کا حل بھی سمیرا نے ہی نکالا تھا۔

یہ واقعہ ایک باپ کے لیے قابل فخر تھا انہوں نے اپنی بیٹی کی درست شدہ کتاب کو اپنے خرچ پر چھپوانے کا فیصلہ کیا، ان کی یہ کتاب نا صرف ان کے اسکول میں بلکہ دوسرے تعلیمی اداروں میں بھی استعمال ہوئی۔

اسکول کے بعد سمیرا نے قاہرہ یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ جو اس وقت بہت مشہور تھی۔ یہ وہ دور تھا جب لڑکیاں سائنس کے شعبے کی جانب نہیں آتی تھیں سمیرا نے سائنس فیکلٹی میں داخلہ لیا اور قدیم معاشرتی روایات کو توڑا۔

وہ اپنی کلاس میں نمایاں تھیں اور اول پوزیشن پر رہتی تھیں، انہوں نے ریڈیولوجی میں مہارت حاصل کی، تابکاری کو طبی لحاظ سے استعمال کرنا ان کا خواب تھا۔ 1939 میں انہوں نے اپنی گریجویشن مکمل کی وہ پہلی مصری خاتون تھیں۔ جنہوں نے ایٹمی تابکاری کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی۔ ان کی ریسرچ میں انسانی جسم پر ایکس ریز کی تابکاری کے اثرات کا مطالعہ کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر مصطفیٰ مشرفہ جو اس وقت مشہور مصری ماہر طبیعیات اور آئن اسٹائن کے ہم خیال تھے۔ ڈاکٹر سمیرا کے استاد اور عالم اسلام کے آئن اسٹائن کہلاتے تھے۔ سمیرا موسیٰ کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ ڈاکٹر سمیرا موسیٰ کی زندگی کا مقصد اپنی زندگی کی خوشیاں حاصل کرنا نہ تھا بلکہ وہ عام عوام کے لیے کینسر جیسے موذی مرض کے لیے ٹیکنالوجی کے ذریعے علاج چاہتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ میری زندگی کا مقصد علم ہے اور جب تک میں اپنے مقصد کو پورا نہ کرلوں، میں کسی اور شے کی طرف نہیں دیکھ سکتی۔

سمیرا موسیٰ کا ایک قول اس وقت بڑا مقبول تھا۔

”کینسر نیوکلیر علاج ہر انسان کے لیے اتنا سستا ہوگا جتنا کہ ایک اسپرین کی گولی۔“

انہیں امریکا میں فل برائٹ اسکالرشپ بھی ملا تھا۔ وہ پہلی عرب دنیا کی خاتون سائنس دان تھیں جو ایٹمز فار پیس (جوہری توانائی برائے امن) کی علم بردار تھیں۔ ان کی علمی قابلیت سے متاثر ہو کر انہیں امریکہ کی خفیہ نیوکلیئر سہولیات تک رسائی دی گئی۔ یہ غالباً کسی غیر امریکی کا پہلا دورہ تھا۔ جس پر امریکہ کے سیاسی اور سائنسی حلقوں میں بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ انہوں نے یونی ورسٹی آف برکلے، کیلی فورنیا اور مختلف انسٹی ٹیوٹ میں کام کیا۔

انہیں تحقیقی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ دراصل ان کی کینسر کے علاج کے سلسلے میں تحقیق اور جوہری توانائی کی خدمات ہی اتنی متاثر کن تھیں۔ انہیں کئی بار امریکہ میں شہریت کی پیشکش کی گئی لیکن سمیرا نے اپنے ملک کی محبت میں ان کی پیشکش مسترد کر دی۔ ان کا کہنا تھا کہ

”مصر میرا آبائی ملک انتظار کر رہا ہے۔“

پندرہ اگست 1952 امریکہ، کیلی فورنیا میں انہیں ایک خفیہ امریکی نیوکلیئر ریسرچ سینٹر کا دورہ کرنے کی دعوت دی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ دعوت دینے والی امریکی خاتون سائنس دان نے ان سے کہا کہ

”میں بعد میں پہنچوں گی آپ پہلے چلی جائیں۔“ سمیرا ایک کار میں سوار تھیں کہ راستے میں وہ کار ایک پہاڑ سے نیچے گر گئی اور وہ موقع پر ہی اس دنیا سے گزر گئیں۔ اس کار کا ڈرائیور فرار ہو گیا تھا جو کبھی پکڑا ہی نہ گیا۔ گمان غالب ہے کہ انہیں قتل کیا گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر مصطفیٰ مشرفہ کی موت بھی مشکوک انداز میں ہوئی تھی ان کے قاتل کا بھی کبھی سراغ نہ ملا۔



ادارہ

خوبصورت بنیے

گرمیوں میں میک اپ

بارش اور گرمی کا موسم اور تقریبات میں شرکت، لیکن جانا بھی ضروری ہے تو ایسے میں کس قسم کا میک اپ کیا جائے، خواتین کے لیے یہ مسئلہ بہت اہم ہے کہ پسینے کی زیادتی، حبس اور چپ چپاہٹ میں اپنے میک اپ کو کس طرح تروتازہ اور نکھرا ہوا رکھیں۔

عام طور پر پسینے کی زیادتی سے فاؤنڈیشن بہنے لگتا ہے اور چہرے پر مختلف قسم کی رنگت نظر آنے لگتی ہے۔ اس صورت حال سے بچنے اور میک اپ کو فریش رکھنے کے لیے اگر کچھ باتوں پر دھیان دیا جائے تو مثبت نتائج برآمد ہوں گے۔

شاور لینے کے بعد فوری طور پر فاؤنڈیشن نہ لگائیں بلکہ کچھ وقت لیں شاور یا چہرہ دھونے کے بعد ٹونر لگائیں۔ تاکہ آئل کنٹرول ہو۔

اس کے بعد آئل فری موئسچرائزر لگائیں جو جیل بیس ہو۔

جلد کو نرم اور میٹ لک دینے کے لیے پرائمر لگائیں۔ پرائمر ہر موسم کے لیے بہترین ہے۔ اگر چہرہ چکناہٹ کا شکار ہے اور ہر وقت چمکتا رہتا ہے۔ یا بہت پسینہ آنے کی صورت میں پرائمر بہترین حل ہے۔

گرمیوں میں فاؤنڈیشن کا انتخاب سمجھ داری سے کریں، بھاری فاؤنڈیشن زیادہ پگھلتا ہے اور جلد سے پھسلتا چلا جاتا ہے۔ لہٰذا فل کوریج فاؤنڈیشن کی بجائے بی بی کریم یا ٹنٹڈ موئسچرائزر استعمال کریں۔

واٹر پروف فاؤنڈیشن بھی گرمی اور بارش میں موثر رہتا ہے۔

کامپیکٹ پاؤڈر یا لوز پاؤڈر ٹی زون یعنی ناک، ماتھا اور ٹھوڑی پر لگائیں تاکہ چکناہٹ کنٹرول ہو۔

واٹر پروف مسکارا، آئی لائنر استعمال کریں۔

پپوٹے آئلی محسوس ہوں تو واٹر پروف کنسیلر بھی استعمال کریں۔ کنسیلر فاؤنڈیشن سے پہلے لگاتے ہیں۔

مائع صورت میں آئی شیڈز بہتر رہتے ہیں برش سے اسے آنکھوں پر لگا کر انگلی سے بلینڈ کریں برش پر آئی شیڈ لگانے سے پہلے اسے نم کرنے سے بہترین دیرپا لگ رہتا ہے۔

پاؤڈر بلش استعمال کریں یا اسٹین بلش استعمال کریں۔

میٹ لپ اسٹک گرمیوں میں بہترین ہے۔

میک اپ کے آخر میں میٹنگ اسپرے کریں تاکہ میک اپ سیٹ ہو جائے اور گرمی یا بارش سے خراب نہ ہو۔ آج کل گرمیوں میں ہلکے سکون بخش رنگ فیشن میں شامل ہیں لہٰذا شوخ وشنگ رنگوں کے بجائے ہلکے رنگوں کا انتخاب مناسب رہے گا۔

☆☆

سانحہ ارتحال

ہماری ہر دل عزیز مصنفہ نعیمہ ناز کے سسر محمد اقبال اس دارفانی کو الوداع کہہ گئے۔

مرحوم بہت بااخلاق اور شفیق انسان تھے۔ ہم دعا گو ہیں رب العزت انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور تمام لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین